ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
August
2014
ایوارڈ نمبر
WWW.PAKSOCIETY.COM
عید مبارک
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

چیف ایگزیکٹو ــــــــ رخسانہ سہام مرزا
مدیر اعلیٰ ــــــــ منزہ سہام
مدیر ــــــــ کاشی چوہان
نائب مدیر ــــــــ دانیال شمسی/ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی
منیجر مارکیٹنگ ــــــــ زین العابدین
قانونی مشیر ــــــــ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ــــــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اگست 2014
جلد:42 ☆ شمارہ:08
قیمت:60 روپے

خط وکتابت کا پتا
110 آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ
بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
فون: 34930470-34939823 -021
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ کمپوزنگ/گرافکس: محمد کاشف ☆ عکاس: موسیٰ رضا/مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

تقریبِ ایوارڈ...

ناول

ناولٹ

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......720 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-34939823-34930470

Email : pearlpublications@hotmail.com

دیر نہیں ہوئی

عید...... نام ہے شکرانے کا۔ سب کہتے ہیں مگر ا

ساتھیو! ذرا یہ تو بتایئے کہ ہم اپنے قول و فعل میں کس قدر سچے اور کھرے ہیں۔ ملک میں دہشت گردوں کے خلاف جنگ لڑی جارہی ہے، ہمارے ملک کے محافظ دہشت گردی کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور ہم ...... ہم خوشی منارہے ہیں۔ اپنے سپاہیوں کے گرنے پر...... گرانی کے ہوش رُبا بڑھتے گراف پر...... گھٹ گھٹ کر سانس لیتی زندگی پر، یا اپنے ضمیر کو بے حسی کے تابوت میں بند کرکے تھپک تھپک کر سلاتے، اوپر سے خوشی کا پیراہن اوڑھے اپنے کامیاب اداکار انسان ہونے پر۔

میڈیا، مفت میں جس طرح انسانیت کی تذلیل کرتے انسان سے حیوان بناتے، چیزیں بانٹ رہا ہے...... موٹر سائیکل آپ کی۔ مگر پہلے آپ کتا یا بلی کی آواز نکالیں۔ LED آپ کا مگر پہلے آپ جانوروں کی طرح آنکھیں بند کرکے کھا کر بتایئے......

اوہ...... کیا ہم واقعی حضرتِ انسان ہیں؟

اس عید کے موقع پر، کیا ہم نے اپنے فوجی بھائیوں کی امداد کی۔ کیا ہم نے شمالی وزیرستان کے بے گھر اور بے در لوگوں کی امداد کے لیے کچھ کیا۔ سو پچاس روپے دے کر ہم نے کون سا فرض نبھایا۔ کیا وہ لوگ 'پاکستانی' نہیں۔ کیا وہاں کا پاکستانی روپیا ڈالر کے برابر ہو گیا ہے؟

شکر کریں...... ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ ابھی تو صرف ایک تفریحی چینل بند ہوا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل میں ایسے غم ٹھہر جائیں جیسے جنگل میں شام کے سائے گم ہو جاتے ہیں۔ ہم سہم سہم کر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو بجھتے اُجالوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے، کچھ بھی نہیں۔

ابھی بھی وقت ہے۔

کاشی چوہان

زادِ راہ

آج ذرا ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں جینے کا مقصد صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ کسی طرح عالیشان مکان، کوٹھی یا بنگلہ بنالیں اور جنہیں اللہ نے عالیشان مکان دیے ہوئے ہیں وہ اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ میں اس مکان......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ایک نومسلم اعرابی آیا اور اس نے نظر بھر کر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا اور کہا "کاش میں ان کا مالک ہوتا۔" اسے خبر نہ تھی کہ وہ شہنشاہ دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں کھڑا ہے۔ رسول ﷺ نے وہ ریوڑ اس کے حوالے کردیا۔ وہ اعرابی ہکا بکا کبھی اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھتا اور کبھی اپنی تنگ دامانی کو دیکھتا۔ آخر جب اسے یقین آگیا کہ یک جنبشِ لب پر وہ اتنے بڑے ریوڑ کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف بیان کرتے ہوئے خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہوا۔ یہ غزوہ حنین کا موقع تھا۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی اتنی کثرت سے نہیں نوازا تھا۔ مالِ غنیمت کے ڈھیر جتنے بلند تھے ہادی برحق ﷺ کا دست مبارک اتنی سرعت سے انہیں تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔ اس دوران انصارِ مدینہ کے بعض نوجوانوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ نبی کریم ﷺ مال کی تقسیم میں انہیں نظر انداز فرما رہے ہیں۔ انہیں خیال گزرا کہ چند دن قبل فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے ان کی اسلام کے لیے اتنی قربانیاں نہیں ہیں لیکن انہی نومسلموں کو مالِ غنیمت میں سے زیادہ حصہ دیا جارہا ہے جب کہ اسلام کے لیے ہم نے تن من دھن سب کچھ قربان کردیا لیکن ہمیں ان کے مقابلے میں بہت کم دیا گیا ہے۔ انہیں مال کے کم ملنے سے زیادہ اس بات کا احساس ہوا کہ رسول ﷺ کی نظرِ اقدس میں ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ انصار مدینہ کو اداسی اور یاسیت نے گھیر لیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی یہ کبیدہ خاطری کہاں چھپی رہ سکتی تھی چنانچہ آپؐ نے انصار کو بلوایا۔ جب انصار ایک جگہ جمع ہوگئے تو اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ ان کے درمیان جلوہ افروز ہوئے۔ انصار کے چہروں پر اداسی نمایاں تھی۔ آپ ﷺ نے انصار کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھا اور فرمایا "اے گروہ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ تو مال و دولت کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر واپس جاؤ؟"

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ انصار کی چیخیں نکل گئیں۔ شمع رسالت کے پروانوں میں نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور وہ زوردار ہچکیوں

سے رو پڑے یہاں تک کہ ان کے داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ سب نے بے اختیار ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم راضی ہیں۔ (زاد المعاد جلد 3)

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اپنے آقا و مولا ﷺ سے بے پناہ محبت کی ادنیٰ مثال ہے۔ ان کی نگاہ میں سیم و زر کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو محبت رسول ﷺ کی لازوال دولت سے مالا مال تھے اور ایک آج ہم ہیں کہ تہی دامانی پر اتراتے پھرتے ہیں۔ حضور کی محبت کے لیبل چسپاں کیے ہوئے ہیں مگر ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھیے اور سچ بتائیے کہ ایسا ہے کیا؟ یقین جانیں کہ حضور سراپا نور ﷺ کی محبت کے ماسوا مومن کے لیے کوئی دولت نہیں ہے۔ یہ حضور ﷺ سے صحابہ کرام کی محبت ہی تھی جو ان کی زندگیوں میں عظیم انقلاب لے آئی۔ ہماری زندگیاں اونچے اونچے محلات کی تعمیر میں صرف ہوئی جاتی ہیں مگر ذرا نگاہ ناز نبوت ﷺ کی ناراضی کا واقعہ بھی پڑھیے کہ کسی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خفا ہو گئے تو سمجھ لو کہ اس کی دنیا و آخرت ویران ہو گئی۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے ہمراہ مدینۃ المبارک کی ایک گلی سے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک اونچا اور پختہ مکان نظر آیا اس پر قبہ (گنبد دار حجرہ) بنا ہوا تھا۔ آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضور یہ فلاں انصاری صحابہ نے مکان بنایا ہے۔ یہ سن کر حضور خاموش ہو گئے اس کے بعد جن صحابہ کا مکان تھا وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ حضور ان صحابہ سے ایسے ہو گئے جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ یہ حضور کا اپنے پروانوں سے ناراضی کا ایک انداز تھا۔ وہ صحابی سمجھے شاید حضور مصروفیت کی وجہ سے میری طرف متوجہ نہیں ہو پا رہے ہیں مگر جب کئی مواقع پر ایسا ہوا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے آقا ﷺ ناراض ہیں۔ اس بات کا ادراک ہونا تھا کہ ان صحابی کی تو دنیا ہی ویران ہو گئی۔ بے قرار اور دیوانے ہو کر ہر ایک سے پوچھنے لگے کہ شاید کسی سے حضور کی ناراضگی کا سبب پتا چل سکے۔ آخر تحقیق کرنے پر پتا چل ہی گیا کہ حضور کو ان کا گنبد دار پختہ مکان ناپسند ہوا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔ حضور کے پاس جا کر کوئی عذر پیش نہیں کیا فوراً گئے اس مکان کا سرے سے وجود ہی مٹا دیا۔ اسے توڑ کر زمین کے برابر کر دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "ہر تعمیر آدمی کے لیے وبال ہے سوائے اس تعمیر کے جو بخت ضرورت اور مجبوری کے ہو۔" (ابوداؤد)

آج ذرا ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں جینے کا مقصد صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ کسی طرح عالیشان مکان، کوٹھی یا بنگلہ بنالیں اور جنہیں اللہ نے عالیشان مکان دیے ہوئے ہیں وہ اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ میں اس مکان کو مزید عالیشان کیسے بناؤں۔ اسراف کے دریا ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی میں ہم نے بہا رکھے ہیں۔ نافرمانی کے ماہر تیراک بنے بیٹھے ہیں۔ سوچتے سمجھتے ہیں کہ کبھی نہیں ڈوبیں گے۔ شریعت ہمیں پختہ مکان بنانے کی اجازت ضرور دیتی ہے مگر ضرورت کی حد تک مکان اور اس کی سہولیات اتنی کافی ہیں جن کے سہارے زندگی کے سرد و گرم عزت و آبرو سے کٹ سکیں بے جا آسائش و آرام اسراف کے زمرے میں آتا ہے اور اسراف سراسر ہلاکت ہے۔ اسراف پورے معاشرتی نظام کو بھی درہم برہم کرتا ہے۔ دولت کی تقسیم عدم توازن کا شکار ہوتی ہے۔ جس نمود و نمائش پر آپ خوش ہو کر اپنی شان بڑھا رہے ہوتے ہیں اس نمائشی شان و شوکت کو دیکھ کر بہت سے محروم لوگ حسد و رقابت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب وہ جائز طریقوں سے ان آسائشات کو حاصل نہیں کر سکتے تو ناجائز راستے اپناتے ہیں۔ رشوت خوری ہونے

لگتی ہے' چوری' ڈاکہ زنی' لوٹ مار عام ہو جاتی ہے۔ ہمارے آج کے معاشرے میں جو لوٹ کھسوٹ کا عمل عام ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ امراء اپنے مکانات اور اپنے رکھ رکھاؤ کے ذریعے مال و دولت کی بے پناہ نمائش کرتے ہیں جس سے محروم اور غریب لوگوں میں بھی ان چیزوں کو حاصل کرنے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے لیے جائز و ناجائز کو پس پشت ڈال کر ہر وہ طریقہ اپناتے ہیں کہ بس جس سے دولت کا حصول ہو جائے۔

ہم میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو یہ سطریں پڑھتا ہوگا اور اسے اچھائی اور برائی کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ اسراف اور میانہ روی کے بارے میں معلوم نہ ہو مگر اس کے باوجود ہماری عملی زندگیاں اسلام کے ان عظیم اسباق سے خالی نظر آتی ہیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ ' اللہ کے رسول ﷺ بس ذرا سے خفا ہی ہو جاتے تھے تو انہیں اپنی زندگی بے کار لگنے لگتی تھی اور وہ اس بات کی جستجو کرتے تھے جس کی بنا پر حضور ﷺ خفا ہیں اور اگر حضورؐ کسی بات کے بارے میں منع فرما دیں تو وہ تو صحابہ کرام کے لیے پتھر پر لکیر ہو جاتی تھی۔ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر صحابہ حضورؐ کے فرمان سے بال برابر نہیں ہٹتے تھے۔ ان میں یہ حوصلہ' یہ ہمت صرف اور صرف سچی اور پاک محبت رسول ﷺ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے دل عشق رسول ﷺ کے جذبے سے معمور تھے۔ وہ تو حضور کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کے کان ہر وقت سرگوشی رسول ﷺ سننے کے لیے بھی ہمہ وقت چوکس و تیار رہتے تھے۔ یک جنبش ابرو وہ اپنی جانیں حضور ﷺ پر نچھاور کر دیا کرتے تھے۔

ایک صحابہ حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ کو غزوۂ احد کے کچھ عرصے بعد کفار مکہ نے دھوکے دہی سے قید کر لیا۔ انہیں صفوان بن امیہ نے پچاس اونٹوں کے بدلے خرید لیا تا کہ وہ اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں انہیں قتل کر سکے۔ جب انہیں شہید کیا جانے لگا تو ابوسفیان نے کہا۔ ''اے زید خدا کی قسم سچ کہنا' کیا تم یہ بات منظور کرتے ہو کہ تمہاری جگہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا جائے اور تم اپنی جان بچا کر واپس چلے جاؤ اور اپنی بیوی بچوں کے درمیان عیش و عشرت سے رہو۔'' (نعوذ باللہ)

حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان افروز جواب سنیے۔ جنہیں تاریخ نے سنہرے الفاظ سے اپنے سینے پر رقم کیا ہے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا۔ ''تم میرے قتل کی بات کرتے ہو۔ خدا کی قسم مجھے یہ بات بھی گوارہ نہیں کہ محمد ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے رہوں۔'' ابو سفیان یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ قریش کہنے لگے کہ محمد ﷺ کے ساتھی جتنی ان سے محبت کرتے ہیں اس کی نظیر ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ سبحان اللہ لیکن ان ظالموں نے حضرت زیدؓ کو تلواروں اور نیزوں سے چھلنی چھلنی کر کے شہید کر دیا۔ (ابوداؤد)

غزوہ احد میں مسلمان شہداء کی خبریں مدینہ کی گلیوں میں پہنچ رہی ہیں ایسے میں ایک صحابیہ خاتون دیوانہ وار دوڑی دوڑی میدانِ جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ راستے میں کوئی ملا تو اس سے پوچھتی ہیں کہ بھائی مجھے یہ تو بتاؤ ''حضور کیسے ہیں؟'' وہ جواب دیتے ہیں تمہارے والد کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ صبر سے تسبیح پڑھتی ہیں اور بے قراری سے دوبارہ حضور کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اتنے میں کوئی انہیں بتاتا ہے کہ بی بی تمہارے شوہر بھی شہید ہو گئے ہیں۔ حضور کی یہ غلام بے قرار ہو کر پوچھتی ہے۔ میرے آقا کے بارے میں بتاؤ وہ کیسے ہیں؟ مگر ابھی تو عشق و محبت کے امتحان اور باقی ہیں کوئی بتاتا ہے کہ بی بی تمہارا بھائی اور تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں مجھے میرے حضور کا بتاؤ' وہ کیسے ہیں۔ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو دوڑی دوڑی احد کے میدان میں جا پہنچتی ہیں۔ سامنے ہی حضور ﷺ کے رُخِ روشن کی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس

میدان میں ان کے باپ، ان کے شوہر، بیٹے اور بھائی راہِ خدا میں سر کٹائے پڑے ہیں یہ ان کی طرف نہیں جاتیں سیدھا دامنِ مصطفیٰ کی طرف جاتی ہیں۔ حضورؐ کا دامن تھام کر عرض کرتی ہیں "یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان جب آپ زندہ وسلامت ہیں تو مجھ پر کوئی تکلیف اور ہلاکت بھاری نہیں ہے۔"

(سبل الھدیٰ، تاریخ خمیس)

صحابہ کرام کی زندگیاں حضور ﷺ کی محبت سے عبارت تھیں۔ حضور جیسا جیسا فرماتے جاتے تھے ان کی زندگیاں اسی قالب میں ڈھلتی جاتی تھیں۔ آج بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے اور اپنی زبان کا محاسبہ کیجیے جو بار بار حضور کو برملا رسول ﷺ سے محبت کرنے والا بتاتی ہے۔ اس سے پوچھیے کہ اے میری زبان کیا تو نے میرے اندر ایسا عمل بھی دیکھا ہے جو محبت رسول کا مظہر ہو۔

یہ شکایت عام سننے کو ملتی ہے کہ ہمیں اسلامی احکامات کے بارے میں علم تو ہے مگر نہیں ہو پاتا، سستی رہتی ہے۔ اسلام کے سچے اور ہدایت یافتہ احکامات پر عمل کرنے کا آسان سانسخہ ہے اور وہ ہے کہ رسول ﷺ کی سچی محبت کو اپنے دلوں میں بسایئے۔ اس کے بعد ایسا ہوگا کہ ہر عمل کے بعد آپ کو خیال گزرے گا کہ کہیں یہ عمل میرے حضور ﷺ کو ناپسند نہ ہو، کہیں میرا یہ کام سنت کے خلاف نہ ہو جائے۔ حضور ﷺ سے محبت ہی ہماری تمام دنیاوی اور اخروی پریشانیوں سے نجات کا حل ہے۔ حضور ﷺ سے قلبی محبت کا طریقہ اہلِ طریقت کے ہاں کثرت سے درود شریف کا پڑھنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جنت میں میرے سب سے قریب وہ شخص ہوگا جو کثرت سے مجھ پر درود پڑھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے اور آپ کے دل کو عشق رسول ﷺ سے روشن فرمائے، آمین بجاہ النبی الکریم۔

☆☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 110' آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ ا بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

عزیز ساتھیو! دوستو! سلامت تا قیامت رہیے۔

احوال کے بعد محفل میں آپ لوگوں کے ساتھ روبرو بات کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے، مت پوچھیے، ہاں بس ہم محفل میں ہی غائب تھے مگر تھے تو آس پاس بلکہ بہت ہی پاس پاس۔ دردانہ نوشین خان نے تقریب کے تاثرات میں لکھا، دوستی شہد جیسی ہوتی ہے، جتنی گاڑھی ہو، تو بھی مفید اور اگر محلل ہو تو بھی مفید۔ مگر ساتھیو!

اس میں کچھ تلخیاں بھی شامل ہیں
دوستی شہد کا گلاس نہیں

مگر محبت!!

محبت امرت ہوتی ہے، آبِ حیات ہوتی ہے۔ جاوداں ہوتی ہے۔
محبت کا رنگ ایک، محبت کا ذائقہ ایک، محبت کا حاصل ایک مگر انداز جدا جدا......!

تقریب ایوارڈ میں جس طرح آپ سب نے میری محبت کی لاج رکھی، با خدا زندگی بھر کا مقروض کرلیا۔ کیا میں اِن محبتوں کا قرض اُتار پاؤں گا؟ خدا میرے پیاروں کو سلامت رکھے۔ محفل کے آغاز سے پہلے آپ سب کو ''عید مبارک۔'' آیئے ذرا دیکھیں ہمارے دوستوں کی اِس ماہ کیا خبریں ہیں۔

☆ ہر دلعزیز اور خواتین کی محبوب لکھاری رفعت سراج گلشن حدید سے گلستان جوہر نئے گھر میں شفٹ ہوگئیں۔

☆ سیما غزل کو پروین شاکر، عکس خوشبو ایوارڈ 2013ء سے نوازا گیا۔

☆ ناہید فاطمہ حسنین نے لاہور میں اپنی شاعری پر نظامی ایوارڈ بشریٰ رحمٰن کے ہاتھوں وصول کیا۔

☆ سویرا فلک کے شوہر کے پتے کا کامیاب آپریشن ہوا۔

☆ نوشین اقبال نوشی کے کزن معروف شاعر کرامت علی پچھلے ماہ انتقال کر گئے۔

☆ بھائی محسن سلیم کے بیٹے، مومن سلیم ایکسیڈنٹ میں پنڈلی کی ہڈی تڑوا بیٹھے۔ صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

☆ بہن عقیلہ حق کا دوشیزہ ایوارڈ یافتہ ناول 'محبت رائیگاں میری' اور افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'عام عورت' رواں ماہ میں شائع ہوگیا ہے۔

☆ دوشیزہ ایوارڈ یافتہ ایڈیسن ادریس مسیح 'جنم جلی' کی کامیابی کے بعد دوسرے سیریل میں مصروف۔

☆ بہن صائمہ حیدر کرائے کے گھر سے اپنے ذاتی فلیٹ میں منتقل ہو گئیں۔
☆ بہن عالیہ حرا جو کسی طرح موصول نہیں ہو رہی تھیں بالآخر ’ایوارڈ‘ نا ملنے پر منظر عام پر آ گئیں۔ گلے شکوے دور ہو گئے۔ اب وہ جلد اپنی تحریروں سے آپ کے دل میں ہوں گی۔
☆ فریدہ جاوید فری کی شاعری کا دوسرا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔
☆ ہمارے ادارے کے ساتھی محمد طاہر کی پھوپو اور قمر تابندہ کے نانا جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مغفرت کے لیے دعا کیجیے۔
ساتھیو! جنہیں خوشخبریاں ملیں اُن کے لیے مبارکباد اور جو ساتھی دُکھ سے دوچار ہوئے اُن کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ آیئے اب محفل کا آغاز کرتے ہیں۔
✉: کراچی سے ہماری بہت عزیز بہن روبینہ شاہین شاملِ محفل ہیں لکھتی ہیں، بہت ساری دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں جولائی کا دوشیزہ پڑھا اچھا نہیں بلکہ بہت زیادہ اچھا لگا۔ سرورق پر ماڈل خاتون کی آنکھوں میں بہت ہی زیادہ مصنوعی پن ہے۔ یہ تو خیر ہماری پیار بھری تنقید ہے جس کا آپ اہلِ دوشیزہ کبھی بُرا نہیں مناتے۔ شمارے میں ’’ہم سلام کرتے ہیں‘‘ میں کاشی آپ کے قلم کی سحر انگیزی بڑے عروج پر ہے۔ ’’میں ہاری‘‘ مصنفہ کی عمدہ تخلیق ہے، صدف آصف کا افسانہ اچھا تھا۔ یہ رشتوں کی گتھی ہے۔ ہر ایک کے لیے اپنے حصے کا پیار اور اپنے حصے کی نفرت اور بے گانگی بھی۔ ’’نئی قمیص‘‘ مصنفہ کی بدصورت حقیقتوں کو بے نقاب کرتی تخلیق ہے۔ مرد خود کسی سے بھی بے وفائی کرے لیکن بیوی سے وفا کا طالب رہتا ہے لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ آپ زمانے کو دیتے ہو وہ واپس پلٹ کر آپ تک ضرور پہنچتا ہے۔ ’’روگ‘‘ میں مدیحہ جی نے ایک بڑے ہی پُرانے لیکن حقیقی مسئلے کو پیش کیا ہے۔ سچ ہے غیروں کی بیٹیاں بہو بنا کر گھروں میں آباد کر سکتے ہیں لیکن اگر اپنی ایک بیٹی بھی آباد نہ ہو سکے تو ماں باپ کے گھر کی زمین بھی تنگ لگنے لگتی ہے۔ ’’پرسنل سیکریٹری‘‘ جیجل میتلو کی بڑی ہی جیجل پیاری تحریر ہے جس میں ایک عورت کی انا، وقار اور عظمت کو بڑی خوب صورتی سے مضبوط انداز سے پیش کیا ہے۔ ’’بن باس کے بعد‘‘ ایک پیار کہانی ہے جو کہ دلچسپی رکھتی ہے اور یہی اس کہانی کی خوب صورتی ہے کہ یہ پیار کہانی ہے۔ لولی وڈ بولی وڈ نکھرتا جا رہا ہے، عینی جعفری کی باتیں دلچسپ رہیں، اس ماہ کا شمارہ بھی نگاہوں سے ہوتا ہوا سوچ اور پھر دل کی وادی تک پہنچا جس کے لیے آپ سب کو، مبارکباد اور آپ سب کو تمام قارئین کو عید کی مبارکباد۔
ﻫ: اچھی روبینہ! آپ کا تبصرہ کافی غیر حاضری کے بعد ملا ہے، کیوں؟ یہ تو لڑائی ہوئی، مگر اس بار آپ کو معاف کیا اگلے ماہ سے غیر حاضری نہیں چلے گی۔
✉: بڑے دنوں بعد میری بہن فرح اسلم قریشی نے کراچی سے رمضان میں یہ نامہ ارسال کیا۔ جو مجھے ملا وہ نذرِ قارئین۔ انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے، وہ ستاروں پر کمندیں ڈال سکتا ہے، پہاڑوں کے سینے چیر سکتا ہے، آسمان و زمین کی ہر قوت کو مسخر کر سکتا ہے لیکن محبت وہ جذبہ ہے جو کسی طاقت

نہیں بلکہ کردار و اخلاق سے ہی پھیل سکتا ہے۔ کاشی چوہان کی اس بات پر صد فیصد یقین رکھتے ہوئے محفل میں تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں، جون کے شمارے میں عقیلہ حق کا ناول ''محبت رائیگاں میری'' اپنے سیاق وسباق اور طرزِ ادائیگی کے باعث رسالے کی جان رہا۔ اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر عقیلہ حق کو مبارکباد، مینا تاج کا ناولٹ بھی بہت اچھا لگا، نسیم آمنہ کی تحریر کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے تاہم ان کے ناولٹ پر تبصرہ آخری حصہ پڑھنے کے بعد کروں گی۔ افسانوں میں حسب معمول دلشاد نسیم آئیں اور چھا گئیں، ٹھیک اُسی طرح جیسے وہ اپنی حسین لانبی، گھنیری زلفوں کے بادل لیے ایوارڈ کی تقریب میں آئیں اور چھا گئی تھیں۔ عرضی میں دلشاد نسیم نے محبت اور عقیدت کو یکجا کر کے ثابت کر دیا کہ انسان جذبۂ آفرینش کی زد کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا۔ ''ایک کہانی'' اچھے پیرائے میں لکھی گئی کہانی تھی۔ فاروق انصاری کا نام دوشیزہ کے لیے جانا مانا ہے لہٰذا اُن کا افسانہ بھی پہلے پڑھ کر جانا اور پھر مان بھی لیا بہت خوب۔ اے زندگی! میں صفیہ سجل شاہ نے اختتام میں زندگی کو زندہ کر دیا، خوشگوار انجام نے دل کو تقویت پہنچائی۔ بہت اچھا لگا یہ افسانہ بھی ''عثانی کا لڑکا'' ناعمہ فاطمہ کی اچھی کوشش تھی۔ ''اک دو جے کے واسطے'' حافظہ مون شاہ کی ناقابلِ قبول تحریر تھی پتا نہیں کیوں..... مگر پڑھ کر اچھا محسوس نہیں ہوا، شدت اور تصاویر مشتمل اس تحریر کا اندازِ بیاں دلکش مگر پلاٹ خاصا ناقص رہا، امید ہے مون شاہ برا مانے بغیر مزید اچھا لکھنے کی کوشش کریں گی، گونگی چیخیں میں سائرہ لنگڑیال نے دوشیزاؤں کو مثبت پیغام دیا۔ آخر میں ایوارڈ کی زبردست تقریب پر آپ سب کو مبارکباد عید کے لیے افسانہ خط کے ساتھ بھیجا ہے امید ہے جلد شائع ہوگا اجازت......

ﮪ: فرح جی! امید ہے جولائی، اگست کا تبصرہ جلد ارسال کریں گی، فی الحال ہم اس پر خوش ہو لیتے ہیں۔

✉: حنا رضوان کراچی سے محفل میں شریک ہیں لکھتی ہیں، سب سے پہلے آپ سب کو رمضان بہت بہت مبارک اللہ! ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) سرمئی آنکھوں والی سوچ میں ڈوبی ہوئی حسینہ اور اعلیٰ اور خوب صورت تحریروں سے سجا دوشیزہ جب ہمارے ہاتھ میں آیا تو یقین جانیں ہمیشہ کی طرح وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک کے بعد ایک زبردست تحریر۔ عقیلہ حق آپ کو ''محبت رائیگاں میری'' کی بھرپور پذیرائی پر دل سے مبارکباد...... اب تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ ایک ''شخص'' کتنا ''لکی'' ہے آپ کے لیے۔ اس ماہ کا بہترین ناول فوزیہ احسان کا ''جلد باز'' رہا۔ واقعی! لڑکا ہو یا لڑکی اگر ان کی تربیت میں جھول ہو تو ان کی زندگی ہمیشہ مسائل کا شکار ہی رہتی ہے۔ ''بن باس'' اور ''میں ہاری'' خوب صورت افسانے تھے۔ پڑھ کر یہی دعا دل سے نکلی کہ اللہ کبھی کسی پر آزمائش نہ ڈالے۔ ''نئی قمیض'' اور ''روگ'' مناسب لگے۔ البتہ ''پرسنل سیکریٹری، میں کہاں ہوں، بیتے لمحے، سزا'' سب ہی زبردست رہے۔ عینی جعفری سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ بیوٹی گائیڈ سے خاص باتیں ہم نے فوراً نوٹ کر لیں اور کچن کارنر کی ایک Recipe ٹرائی بھی کر لی اور داد بھی وصول کر لی۔ زین کے مزے مزے کے جواب کم سے کم دو، تین بار ضرور پڑھتی ہوں۔ تمام سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں اور ہاں! کاشی صاحب آپ کی بہت بہت تعریفیں سنی ہیں میں نے! اب تو آپ سے ملنے کا شوق سا ہو گیا ہے، زندگی رہی تو ضرور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گی۔ انشاء اللہ۔
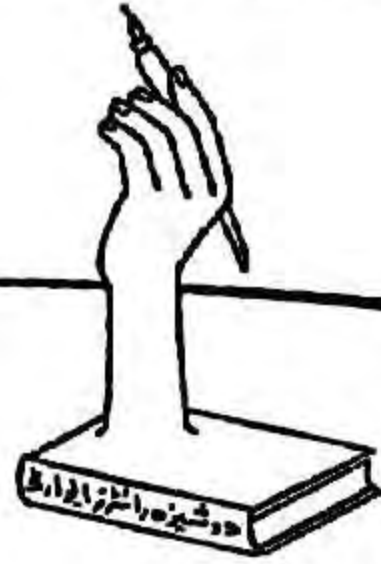
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

جولائی 2014 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

میں ہاری — شائستہ عزیز

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — اگست 2014

عنوان: ________

قلم کار: ________

نام: ________

پتا: ________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

ھ: اچھی حنا! ہمیں تو آپ نے ویلکم ہی نہیں کیا۔ کیجیے ملاقات ہوگئی، کیسی لگی۔ امید ہے یہ قلمی تعاون ہر ماہ حاصل رہے گا اور ہمارا مان بڑھائے گا۔

✉: گلشن اقبال، کراچی سے عابدہ کمال صاحبہ رقم طراز ہیں، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم میرا خط شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، کاشی صاحب کی محنت نے رسالے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سب تحریریں زبردست ہوتی ہیں۔ مجھ کو سارے سلسلے بہت پسند ہیں۔ نسیم آمنہ اور ام مریم بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کاشی صاحب کی تحریر کہاں ہے جب سے وہ ایڈیٹر بنے ہیں انہوں نے لکھنا کم کر دیا ہے۔ کاشی صاحب ہم آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ عقیلہ حق میری پسندیدہ ترین رائٹر ہیں اُن کی ہر تحریر چاہے کسی بھی رسالے میں ہو میں بہت دِل سے پڑھتی ہوں لیکن ان کا پہلا ناول جس کو لکھوانے کا سہرا دوشیزہ ڈائجسٹ کو جاتا ہے بہت زبردست ہے۔ مجھے زرقون سے بہت ہمدردی ہے۔ پلیز عقیلہ زرقون کے ساتھ بُرا مت کریے گا لیکن ثمینہ کو ضرور ضرور سبق سکھایئے گا۔ اللہ کتنی بُری لڑکی ہے، ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا لیکن میں سمجھتی ہوں ایسی عورتیں ہوتی ہیں۔ خدا ان کے شر سے سب کو بچائے۔ عقیلہ حق کو ایک بار پھر مبارکباد سب کو سلام۔

ھ: عابدہ صاحبہ پھر سے خوش آمدید مگر ہمیں آپ کا تبصرہ بہت مختصر لگا۔ سارے پرچے پر تبصرہ کریں تو بات بنے۔ امید ہے ہمیں آپ کا اگلے ماہ بھرپور تبصرہ ملے گا۔

✉: مسز نوید ہاشمی نارتھ ناظم آباد کراچی سے رقم طراز ہیں۔ پیارے دوستو اور ساتھیو! السلام علیکم رمضان اور عید کی ایڈوانس مبارکباد قبول ہو۔ رمضان میں خدا سب کو روزہ اور عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ عبادت کے بعد عید کی خوشی تو دوبالا ہو ہی جاتی ہے۔ کاشی چوہان بھائی نے سہام مرزا کے لیے عقیدت کے پھول جس طرح پیش کیے تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے جو لوگ اپنے بانی کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں انہیں کامیابی سے کوئی روک نہیں سکتا۔ پھر طلعت اخلاق اور دلشاد نسیم نے سہام مرزا صاحب کے لیے عقیدت کے پھول پیش کیے تو وہ پھول اتنا مہکے کہ دل و دماغ منور ہو گیا۔ 29 جولائی کو وہ ہم سب کی نظروں سے دور ضرور ہو گئے مگر ہمارے ذہن میں دل میں ہماری دوشیزہ اور سچی کہانیوں کے ڈائجسٹ میں، پڑھنے والوں میں، لکھنے والوں میں، سب میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ سہام مرزا کے پیار کے جب اتنے روپ ہیں، تو وہ ہم سے کیسے جدا ہو سکتے ہیں۔ سہام مرزا کی عقیدت میں علامہ اقبال کا یہ شعر حاضر خدمت ہے۔

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں
اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے

تیرے عشق نچایا بینا عالیہ کے سلسلے وار ناول نے میرے دل کو چھو لیا ہے۔ مجھے بے حد پسند آ رہا ہے۔ ماہین کی آزاد خیالی، اُمّ فروا کے لیے میری بھی دل سے دعا ہے کہ بُرے لوگوں سے بچائے فیری کے دل میں رحم آ جائے۔ ہم تو صرف دعا کر سکتے ہیں، بینا عالیہ ہی بتائیں گی کہ ہماری دعا قبول ہوئی یا نہیں۔ آئینہ عکس اور سمندر جو عقیلہ حق نے تحریر کر رہی ہیں عقیلہ آپ رخسانہ آنٹی اور منزہ سہام کے ساتھ میری بھی لاڈلی بنتی جا رہی ہو، زرقون کے لیے دعا گو ہوں کہ اس کو اُس کی محبت مل جائے فہمیدہ بیگم کے انتقال پر واقعی دل

پاکستان کی شان، قومی پہچان

سمیع اللہ خان

فتوحات کے قصے، سنہری یادوں کے چمکتے حروف اور آج کی کارگزاریاں۔

وہ محبوب کھلاڑی، جنہیں بین الاقوامی طور پر ''فلائنگ ہارس'' اور ''ڈینجر مین'' کے خطابات سے نوازا گیا۔

بہت جلد

دوشیزہ کے صفحات پر ایک یادگار ملاقات کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔

اُداس ہوگیا۔ کہانی کی گرفت میں کیسے جکڑا جاتا ہے، میری لاڈلی عقیلہ ہی جانتی ہے، دوشیزہ 12 جولائی کو ملا ہے۔ دونوں کہانیاں پڑھ کر تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ کیوں کہ ہمیں الٹی میٹم مل چکا ہے کہ تبصرہ اگر دیر سے ملا تو دوشیزہ میں شامل نہیں کیا جائے گا، منزہ سہام آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ پیار جب اپنوں سے کہا جاتا ہے حکم بھی اپنوں کو دیا جاتا ہے اپنوں سے یاد آیا کہ اب دوشیزہ کے تبصروں کا جواب میرا چھوٹا بھائی کاشی چوہان دے گا، اس لیے اور جلدی تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ بھائی کو تو کوئی ناراض نہیں کرتا نا۔ کوئی بات بری لگی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔ رمضان میں توبہ در گزر، حوصلہ افزائی، معافی بھی اہمیت رکھتی ہے۔ معافی چاہتی ہوں، رمضان کی وجہ سے دوشیزہ اتنی جلدی نہیں پڑھ پاؤں گی انشاء اللہ اگست میں عید کے ساتھ تبصرہ میں حاضر ہوں گی۔

ک: بہت پیاری بہن! سلامت رہیے جو لوگ دوسروں کو خوشیاں دینے کا باعث ہوں خدا بھی ان سے راضی ہوتا ہے۔

✉: رحیم یار خان سے ہمیں یاد کیا ہے ہماری لکھاری دوست سُباس گل نے، لکھتی ہیں پیاری اور شفیق رخسانہ آنٹی اور محترم کاشی بھائی! السلام علیکم! دعا ہے کہ آپ، آپ کے اہل خانہ ''دوشیزہ'' کے تمام اسٹاف اراکین، رائٹرز، ایڈیٹرز، اور ریڈرز خیر و عافیت سے ہوں۔ آمین! بہت دن ہوئے ''دوشیزہ کی محفل'' میں ہماری حاضری نہیں لگی تو...... تو ہمیں کسی نے یاد بھی نہیں کیا۔ خیر کوئی بات نہیں ہم خود ہی اپنی یاد دلانے چلے آئے ہیں مگر کاشی بھائی سے کچھ گلے شکوے کے ساتھ۔ جی جی کاشی بھائی آپ نے ہمیں تو خوب تاکید کی تھی کہ ہم ہر ماہ دوشیزہ پر تبصرہ لکھ کر بھیجیں اور آپ ہر ماہ دوشیزہ ہمیں ارسال کریں گے۔ مگر غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا۔ پرچہ ایک ماہ ملتا ہے تو دو ماہ غائب۔ پھر بار بار یاد دہانی کرانے پر موصول ہوتا ہے۔ سُنا تھا فروری میں ہمارے ''میاں جی'' بھی دوشیزہ کی زینت بنے تھے مگر صاحب ہمیں آج تک فروری، مارچ کے شمارے بھی باوجود یاد دہانی کے نہیں موصول ہوئے، خیر مرضی آپ کی۔ جون کا شمارہ تین دن پہلے موصول ہوا تو کچھ سرسری سا مطالعہ بھی ہوگیا اُسی پہ چند حرف لکھ دیے ہیں۔ مسکراتا ہوا سرورق دلکشی لیے ہوئے پسند آیا۔ اشتہارات اور فہرست پہ نگاہ ڈالتے ہوئے کاشی چوہان کی ''پھوار'' میں بھیگے خوب صورت لفظوں میں حالاتِ حاضرہ کو بہت قرینے سے بیان کرتے ہوئے ایک عمدہ حل اور پیغام سمجھاتے ہوئے کاشی بھائی نے اپنے رائٹر ہونے کا فرض ادا کردیا۔ ویل ڈن بھیا! ''زادِ راہ'' بھی ایک عمدہ پیغام لیے ہوئے تھا جو آج کے حالات کی ضرورت بھی ہے۔ ''دوشیزہ'' کی محفل میں تبصرے بھی اچھے تھے۔ سائرہ قاضی کا کہنا بجا تھا۔ پیاری عقیلہ حق جی، مسز نوید ہاشمی، عادل حسین، رضوانہ کوثر، حنا لطیف کے تبصرے پسند آئے۔ ''منی اسکرین'' میں علی رضا عمرانی نے ٹی وی ڈراموں پر عمدہ تبصرے کیے، دلچسپ سلسلہ ہے یہ۔ س سے سوال اداکارہ ماورا کا انٹرویو بہت اچھا لگا، سوالات بھی خوب تھے اور جوابات بھی نیچرل، ویل ڈن ذیشان فراز صاحب! دلشاد نسیم صاحبہ کی ''دل کی باتیں'' تو بہت دل کو لگیں۔ کسی عام سی بات کو خاص بنا کر پیش کرنا عمدہ مشاہدے اور حساسیت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور محترمہ دلشاد نسیم صاحبہ یہ کمال رکھتی ہیں اور خوب رکھتی ہیں۔ ''ذرا خیال رہے'' کہ بعد دلشاد نسیم جی کی ''عرضی'' پڑھی تو وہ بھی بہت

لاجواب نکلی۔ واہ کیا عمدہ کہانی قلم بند کی ہے۔ کہانی کا اختتام اس کا حسن دو بالا کر گیا اور صفیہ تجل شاہ کا افسانہ گھریلو رنگ میں ایک لڑکی کی زندگی کی کہانی بیان کرتا پسند آیا۔ اچھی کاوش رہی ''اے زندگی۔'' مستقل سلسلے بھی لاجواب رہے۔ ''دوشیزہ گلستان'' میں کرن شہزادی، شاہین اور اروشے کا انتخاب بہترین تھا۔ ''نئے لہجے نئی آوازیں'' میں فصیحہ آصف خان، نبیلہ نازش راؤ، ثمینہ عرفان، ریحان آفاق، فرح علی کے کلام خوب رہے۔ ''لولی وڈ، بولی وڈ'' بھی دلچسپ رہا۔ ''نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل'' ایک مفید سلسلہ ہے۔ جزاک اللہ! ''کچن کارنر میں تو پکوان کی ورائٹی تھی ہر چیز مزے دار اور منفرد تھی سو پکانے اور کھانے میں بھی خوب مزہ آیا۔ بہت شکریہ نادیہ طارق جی اتنی ساری ڈشز پیش کرنے کے لیے۔'' بیوٹی گائیڈ'' ڈاکٹر خرم مشیر کے مشوروں سے سجا ہوا تھا اور ہم انتہائی سست واقع ہوئے ہیں کسی بھی بیوٹی ٹپ پر عمل کرنے کے معاملے میں، سو پڑھ کر دوسروں کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی عمل کرلو حسین ہو جاؤ گے۔ لیجیے جناب جتنا ہم نے'' دوشیزہ'' کو پڑھا تھا اُس پر تبصرہ فرما دیا۔ زندگی بخیر آئندہ ماہ حاضر ہوں گے اور ہاں آپی شگفتہ شفیق جی آج کل ٹی وی اینڈ دیگر مشاعروں میں بہت مصروف ہیں ان کو بھی بہت سلام اور عقیلہ حق، دردانہ نوشین خان کو رضوانہ پرنس کو بھی سلام خلوص پہنچے اور آپ سب کو'' دوشیزہ'' سے جڑے ہر فرد کو ماہِ رمضان کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ ہمارے پاکستان کی حفاظت کرے، پاکستان میں امن و آشتی کی فضا قائم ہو۔ آمین۔ آپ سب کی صحت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا گو!

ھ: اچھی بہن! آپ کی شکایات کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ انشاء اللہ اب آپ کو قطعاً شکایت نہ ہوگی۔ ''میاں جی'' جلد آپ کے پاس ہوں گے۔

✉: نورین ناز پہلی بار محفل میں سانگھڑ سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں یہ کسی بھی رسالے میں میرا پہلا خط ہے میں اس قدر مصروف رہتی ہوں کہ تبصرہ لکھنا بھی چاہوں تو نہیں لکھ سکتی لیکن عقیلہ حق اور بہت ساری رائٹرز کی خوب صورت ترین تحریروں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں آپ کو خط لکھوں۔ تمام کہانیاں اتنی زبردست ہوتی ہیں کہ ایک دفعہ شروع کر دو تو چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا کیوں کہ محفل میں محبت ہی محبت ہوتی ہے۔ اس قدر اچھا صاف ستھرا رسالہ نکالنے پر آپ کو دلی مبارکباد۔ عقیلہ حق کا ناول آئینہ، عکس اور سمندر، بہت خوب صورت ہے۔ اس قدر حقیقت سے قریب لکھا ہے لگتا ہے یہ میری کہانی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ان کے ہاتھ چوم لوں، کیا میں کبھی عقیلہ حق سے مل سکتی ہوں۔ پلیز مجھے ان کا ایڈریس دے دیں میں اُن کو خط لکھنا چاہتی ہوں اور نشاط خان بھی مجھے بہت پسند ہیں اور بینا عالیہ اللہ سب کو خوش رکھے۔

ھ: بہت اچھی نورین! خدا آپ کو زندگی کی تمام خوشیاں دکھائے۔ آپ کی آمد سر آنکھوں پر، آپ کا پیغام عقیلہ حق صاحبہ تک ان سطروں کے ذریعے پہنچ گیا۔ تھوڑا سا وقت نکال کر تبصرہ ارسال کر دیا کریں۔ آپ اپنے دل کی باتیں ہم سے شیئر کر لیا کریں۔ ہم سب ایک فیملی ہی کی طرح ہیں۔

✉: لاہور سے ہماری بہت بہت پیاری نسیم نیازی نے بڑے طمطراق سے محفل میں قلم کو آزمایا ہے۔ لکھتی ہیں کاشی بھیا آداب! تم نے تو خیر بہت اُکسایا کہ آپی لکھو کچھ تو لکھو مگر جو کام تمہارے بار بار کہنے پر

نہ ہوسکا، وہ کام ایوارڈ کی تقریب کی شرکت آخر کار مجھ سے کروانے میں کامیاب ہوگئی تو اعتراف تو ہے کہ حق ادا کرنے میں بہت کامیاب نہیں ہوئی مگر آپ کی اور ادارے کی حوصلہ افزائی یقیناً میرے اندر کی مردہ رائٹر کو زندگی بخش دے گی۔ چند تحریریں مزید ذہن کے گنبد میں گونج رہی ہیں انشاء اللہ اب قلم پکڑا ہے تو تھوڑا تھوڑا کر کے لکھنے کا عمل جاری رکھوں گی تاکہ انشاء اللہ تعالیٰ اب جب ایوارڈ کی تقریب ہو تو ہم بھی ایوارڈ ڈونرز کی صف میں اپنا ایوارڈ لینے کے لیے کھڑے ہوں۔ بشرط زندگی انشاء اللہ تعالیٰ اب کے آنے والی تقریب میں ایسا ہوگا۔ ایوارڈ کی تقریب کا احوال یقیناً پہنچ چکا ہوگا اس بار کے پرچے میں بہت امید تھی کہ احوال نہ سہی تصویری کہانی ضرور ہوگی۔ مگر پرچہ جیسے ہی ہاتھ میں آیا اس تیزی کے ساتھ کھولا اور پھر اسی تیزی نے مایوس بھی جی بھر کے کیا مگر ہم نے پھر سے خود کو اگلے شمارے کی آس میں لگا کر بہلا لیا۔ سو شدت کے ساتھ انتظار ہے اگست کے شمارے، جس میں جہاں مزے مزے کے خطوط ہوں گے اور تقریب کا احوال بھی۔ یقیناً ہر ایوارڈ ونر کی کہانی اس کی اپنی زبانی شامل ہوگی، مجھے بھی یاد ہے کہ میں نے شام یہ دو ہزار تین کی ایوارڈ کی تقریب کی آہٹ کی خبر دوشیزہ میں پڑھ کر پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے دوشیزہ کے دفتر فون کیا اور میری خوش قسمتی کہ میری بات بانی دوشیزہ سہام انکل سے ہوئی اور میں نے ایوارڈ میں شرکت کی اپنی خواہش ان سے بیان کی۔ میں ان دنوں کیماڑی میں این ایل سی ہیڈ کوارٹرز میں رہائش پذیر تھی۔ سو کراچی میں رہ کر تقریب سے محرومی مجھے قطعی گوارہ نہیں تھی، جس شوق کا میں نے اظہار کیا انکل سہام سے اتنی ہی محبت کے ساتھ انکل سہام نے مجھے شرکت کی دعوت دی، چوں کہ میں ان دنوں دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں خوب اِن تھی سو شوق اور جوش کا عالم بھی عجیب ہی تھا۔ مگر وہ تقریب بہت بڑی تقریب تھی یعنی مجھے یاد ہے کہ پی سی کا بہت بڑا ہال تھا اور رش کا یہ عالم تھا کہ لوگ جوق در جوق ہال میں آ رہے تھے۔ بہر حال اس مہنگائی کے دور میں اپنی روایت کو قائم رکھنا اور لے کر چلنا دوشیزہ کا خاصہ ہے، اللہ منزہ کو ہمت دے حوصلہ دے، تاکہ یہ روایت وہ اسی طرح لے کر چلتی رہیں۔

✉: نسیم آپی! سلامت رہیے، آپ نے اپنے تاثرات میں لکھا تھا نا کہ گاڑی چلے نہ چلے، موبائل چلے نہ چلے مگر باتیں چلتی رہتی ہیں۔ Non Stop تو آپ بھی اب قلم چلتا رکھیے گا۔ پھر شکایت نہ کیجیے گا کہ ہم نے تو شہرِ قرب سے......

✉: کراچی سے ہمیں یاد کیا ہے، ہمارے شاعر و لکھاری دوست عادل حسین نے، لکھتے ہیں پیارے کاشی جی! السلام علیکم، امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، رخسانہ آنٹی اور منزہ آپی کو بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں، جولائی کا دوشیزہ رمضان کی مبارک ساعتوں میں موصول ہوا۔ غزل کی اشاعت پر شکریہ، ٹائٹل کی حسینہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی کھوئی کھوئی سی تھی۔ مگر پیاری لگ رہی تھیں۔ محترم سہام مرزا صاحب کو آپ ہی نہیں ہم بھی سلام کرتے ہیں۔ سہام صاحب کی یاد میں لکھے گئے تمام مضامین خوب صورت تھے، حمیرا راحت صاحبہ کی نظم بھی خوب! محفل میں تمام چاہنے والے اپنی محبت کی خوشبو بکھیر رہے تھے۔ دل و دماغ دونوں معطر ہو گئے۔ منی اسکرین کے تبصرے اور عینی جعفری سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ ناول اسی شان سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کیے جا رہے ہیں۔ خارِ مغیلاں کا اختتام

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ ’’رفعت سراج‘‘

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

زرد کاغذ، گلابی پھول کے بعد......

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

بہت جلد ماہنامہ ’’دوشیزہ‘‘ ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

بس تھوڑا سا انتظار اور......

دل ہلا دینے والا مگر حقیقت پر مبنی تھا۔ خوب صورت تحریر پر بہت مبارک۔ خواہشوں کے سراب بھی بہت خوب صورت لگا۔ ثمینہ طاہر بٹ کو بھی مبارک۔ شنو جیسی لڑکیوں کا انجام اکثر ایسا ہی نظر آتا ہے۔ شائستہ عزیز صاحبہ کا میں ہاری ایک خوب صورت افسانہ تھا۔ انتہائی حساس موضوع کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ واقعی ایک یادگار آمد ہے یہ، صدف آصف کا ماضی، حال اور میں بہت زبردست لگا۔ ایک مرد کی بے کارانا، عورت کی ازلی فرمانبرداری، اولاد کی محبت سبھی کچھ تھا اس میں۔ ویری نائس صدف جی۔ اسماء اعوان جی کا نئی قیص بھی شاندار تحریر، طرز بیان بھی خوب...... اچھا لگا۔ روگ پڑھ کر دُکھ ہوا، لیکن مدیحہ اصغر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔ تسیم سکینہ صدف جی کی تحریر میں کہاں ہوں ایک مختلف تحریر تھی۔ جو کئی سوالات کر رہی تھی۔ جمیل میتلو جی کا پرسنل سیکریٹری بھی ایک عاشق مزاج باس کی کہانی، بنت اچھی تھی۔ نائس، شاد چندرانی کا جیتے لمحے، اپنی یادوں میں کھوئے ہوئے شخص کی روداد، صائمہ حیدر صاحبہ کا بن باس کے بعد ذراہٹ کے مگر اچھی تحریر تھی۔ انتخاب خاص میں منشا یاد صاحب کا سزا پڑھ کر مزا آ گیا۔ کدورت اسی کا نام ہے، مگر بیان کس خوب صورتی سے کی گئی اور ڈنر بالجبر نام کی طرح ہی پڑھ کر لطف اندوز ہوئے، گلستان بھی خوب تھا اور یہ ہوئی نا بات کے سوال وجواب بھی خوب۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سب کا کلام خوب صورت تھا۔ لولی وڈ بولی وڈ ہمیشہ کی طرح معلومات میں اضافے کا سبب بنا کچن کارنر اور بیوٹی گائیڈ تو ہیں ہی کامیاب سلسلے، مختار بانو طاہرہ جی کے لیے ہمیشہ کی طرح دعائیں۔ آخر میں سب کو رمضان کے بعد عید کی مبارک باد۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی، بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ

ج: عادل حسین! تم اُن لوگوں میں شامل ہوتے جارہے ہو، جن پر بلاشبہ ناز کیا جاسکے۔ خوش رہو۔

✉: یہ آمد ہے کراچی سے ہماری بہت اچھی لکھاری دوست عقیلہ حق کی، لکھتی ہیں آپ سب کو میری طرف سے رمضان کی برکات اور عید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔ اس دفعہ جب رسالہ میں پڑھا کہ جولائی میں سہام صاحب کی برسی ہوتی ہے تو دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا نکلی۔ میں کبھی ذاتی طور پر اُن سے نہیں ملی لیکن جب اُن کے بارے میں پڑھتی ہوں اور سنتی ہوں تو دل کو ملال ہوتا ہے کاش میں ایک دفعہ اُن سے مل پاتی۔ امید ہے جنت میں ملاقات ہوگی۔ میں آپ سب کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں، شوہر ہو یا باپ دونوں رشتے عورت کی زندگی میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ستونوں کے بغیر عورت کتنی ہی مضبوطی سے کھڑی ہو، وہ کہیں نہ کہیں، تنہا ہوتی ہے۔ میں اس تنہائی میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ڈیئر منزہ! میرے والد کے انتقال کو تقریباً سترہ برس ہو چکے ہیں، یقین کرو دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب ان کی یاد میرے دل پر چٹکی نہ لیتی ہو...... آج دنیا کی ہر خوشی، ہر نعمت ملنے کے باوجود میرا دل نہ جانے کیوں اکثر اُداس رہتا ہے میرے والد کا نام شفیق احمد تھا ایک زمانے میں، میں عقیلہ شفیق کہلاتی تھی لیکن اکثر میں اب یہ شعر پڑھتی ہوں۔

مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

خیر یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا دُکھ ہے۔ آتی ہوں رسالے کی طرف، رسالہ درحقیقت کاشی بہت محنت سے تیار کرتے ہیں، صفحہ اول سے لے کر صفحہ آخر تک ہر جگہ کاشی اور ان کے ساتھیوں کی محنت جھلکتی ہے۔ ان تمام ساتھیوں کا بہت شکریہ جن کو میرا مکمل ناول محبت رائیگاں میری پسند آیا۔ سجاد بابر صاحب آپ کی بڑی مہربانی جو آپ نے اس قدر محبت سے میری تحریر کو پڑھا لیکن یہ بات میں آپ کو بتادوں مقدس ایک جیتا جاگتا کردار ہے اور میں نے تو کم لکھا ہے، لڑکیاں بہت کچھ کرتی ہیں۔ جبھی تو بے موت ماری جاتی ہیں، کبھی زمین کے اوپر ایک لاش کی طرح رہتی ہیں اور کبھی زمین کی تہوں میں جا سوتی ہیں۔ عینی جعفری کی گفتگو اچھی لگی، میرے خیال سے رسالے میں سروے وغیرہ ہونے چاہئیں اور ہر ماہ کسی ایک رائٹر کا انٹرویو ہونا چاہیے، اس سے رسالہ نکھرے گا۔ جب ہم قاری تھے تو رائٹر کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار رہتے تھے تو آج کا قاری...... شائستہ عزیز کیسی ہیں؟ آپ کا افسانہ زبردست رہا، انتخاب خاص یا اللہ بہت زبردست تھا، نسیم آمنہ بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ ڈھیروں ڈھیر مبارکباد۔ مکمل ناول جلد باز مناسب رہا۔ اُم مریم اور بینا عالیہ اچھا لکھ رہی ہیں۔ پرسنل سیکریٹری اچھی رہی، ڈنر بالجبر حقیقی کہانی تھی۔ ہاں ایسا ہوتا ہے، لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمام مستقل سلسلے اچھے رہے۔ زین کے جوابات لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں، رسالہ کیوں کہ آج ہی ملا ہے تو تمام کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں لیکن جو پڑھا اُس پر رائے حاضر ہے۔ منزہ سے شکایت ہے کبھی ہم کو بھی لنچ پر انوائیٹ کرلو۔ یقین کریں میں بہت کم کھاتی ہوں۔ آپ کو زیادہ نقصان نہیں ہوگا اور میں غریب خوش ہو جاؤں گی (ہائے غریب کے

سپنے) دفتر میں سب کو درجہ بہ درجہ سلام۔

ج: پیاری عقیلہ جی! سلامت رہیے۔ آپ کا تبصرہ تو بھرپور تھا مگر رسالے پر کم اور...... مجھے امید ہے اگلے ماہ رسالے پر آپ بھرپور تبصرہ کریں گی اور ہاں اپنے گھر میں مہمانوں کی طرح نہیں آتے۔ جب دل چاہے آئیں لنچ کریں۔

✉: ڈیرہ اللہ یار، بلوچستان سے ہمارے ساتھی ساحل ابڑو رقم طراز ہیں۔ بعد عرض ہے کہ میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم بھی خیریت سے ہوگی دیگر احوال اس قدر ہے کہ ماہ جولائی کا تازہ شمارہ دوشیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کی اُداس شام نے میرے وجود کو اکھاڑ کر باہر رکھا اور میرے ارمانوں کی برسات نے برسنا شروع کردیا۔ جب میں نے ورق گردانی شروع کی تو نہ جانے کیوں دوشیزہ کی محفل نے مجھے یہاں سے اُٹھنے کے لیے مجبور کردیا اور میں اپنے گھر کی بالائی منزل پر چھوٹی سے لائبریری نما کمرے میں بیٹھ کر تمام خطوط کو پڑھنے لگا تو میں کہاں سے لاؤں رنگ برنگے الفاظ جو سطر کرتا جاؤں ان رائٹرز کے نام جن کی خوشبو سے یہ ادبی صحبت جھوم اٹھے۔ جی ہاں میں بات کررہا ان بہن بھائیوں کا جنھوں نے میری تحریر 'اجلے لوگ' کو پسند کیا جن میں نازیہ خانم، فرزانہ ناز، عادل حسین، نادر علی بھنگر، روبینہ شاہین، عامر زمان عامر اور مسز نوید ہاشمی، میں ان سب کا بہت اور بے حد شکر گزار ہوں جو میری تحریر کو رونق بخشی میں عقیلہ حق کا بھی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے میری تحریر کو بنا پڑھے تبصرہ کردیا کہ ساحل ابڑو کی کہانی نے قطعی متاثر نہیں کیا۔ تو عقیلہ صاحبہ یہ کہانی نہیں تھی بلکہ افسانہ تھا کہانیاں دوشیزہ میں نہیں بلکہ سچی کہانیاں میں شائع ہوتی ہے۔ آپ کو مزید مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ میری ذات کسی رائٹر کو برا بھلا نہیں کہتی اور ویسے بھی ہمارا ادب اتنا بھی سستا نہیں ہے جو کسی رائٹر کی دل آزاری کرے۔ بہر حال عقیلہ حق مجھے آپ کے ناول بہت اچھے لگتے ہیں۔ شاد پندرانی 'بیتے لمحے' نے تو مجھے ماضی کی یاد دلادی۔ زبردست شاد بھائی، بینا عالیہ، مریم، فوزیہ، احسان رانا نے بھی بہت اچھا لکھا۔ باقی تمام بہن بھائیوں سے میں معذرت خواہ ہوں کہ ان کے ناول، افسانوں پر میں تبصرہ نہ کرسکا کیوں کہ میں نے ابھی تک دوشیزہ پوری طرح سے پڑھا نہیں جس کی وجہ ہے خط میں تاخیر نہ ہوجائے۔ میں یہاں چند باتیں ضرور لکھوں گا کہ اس بار جو دوشیزہ پر محنت کی گئی ہے تو یقیناً یہ کاشی چوہان کی لگن ہے اور ٹائٹل سے لے کر اینڈ تک جو لفظوں کو خوب صورتی دی گئی ہے تو وہ سیاہی سے نہیں بلکہ کاشی کے خون کے ایک ایک قطرے سے لکھا گیا ہے۔ گڈ، دوشیزہ کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ دوشیزہ کے تمام کے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ دوشیزہ واحد ڈائجسٹ ہے جو ہر فیملی کا فرد بنا ہوا ہے۔ دوشیزہ کے تمام سلسلے بھی معیاری چل رہے ہیں اور خاص کر کے شاعری والے صفحے کی تو بات ہی کیا ہے۔ کیوں کہ شاعری وہ لطیف جذبہ ہے جو درس بھی دیتی ہے اور اپنے محبوب کی تخلیق سے بھی روشناس کراتی ہے، اجازت چاہوں گا۔

ج: اچھے ساحل! سدا خوش رہو، تمہارے عزم و حوصلے کی تعریف کرنا چاہیے کہ اتنی محبت سے نامہ ارسال کرتے ہو۔ خوش رہو۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉: ہماری بہت پیاری، شفیق سی رضیہ جی، کراچی سے محفل میں رقم طراز ہیں۔ پیارے کاشی، دو تین دن سے طبیعت اس قدر خراب ہے کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ڈائجسٹ آیا ہوا ہے مگر پڑھ نہیں سکتی۔ کل رات میاں جی نے بہت اصرار کیا کہ ڈائجسٹ پڑھ لو طبیعت بہل جائے گی۔ اُن کے اصرار پر اُٹھایا اور محفل سے حسب معمول شروع کیا اور پھر زور سے چیخ نکل گئی۔ 'کیا ہوا کیا ہوا' بیٹا اور میاں جی ایک ساتھ دوڑے میں انہیں کیا بتاتی چیخ کسی تکلیف سے نہیں اپنے خط کا حشر دیکھ کر ہوئی پلیز دیر بھی ہو گئی ہو تب بھی اسے ضرور لگا دینا۔ وفا کو دغا بنا دیا ظالم، میں نے لکھا تھا نگہت سیما کو کہ کون سی تحریر ہوگی جو توجہ نا کھینچ پاتی ہو بلکہ ہوتا تو یوں ہے (اب قاری نہیں لکھ رہی گرچہ بہت مشہور ہے) کہ تحریر کہتی ہے بس رک جاؤ دامن دل کو پکڑ لیتی ہے کہ بس یہی جگہ ہے ٹھہر جاؤ۔ سیما سے معذرت میری دوستی کا ہاتھ اب بھی بڑھا ہے۔ باقی آئندہ گر زندگی رہی تو۔

✍: اچھی! بہت اچھی رضیہ جی! آپ نے تو ہمیں پریشان کر دیا۔ اب طبیعت کیسی ہے؟ کمپوزر بھی تو اپنا ہی ہے، کیا کہوں اس کو بھی۔ پھر بھی معذرت، امید ہے سیما جی نے بھی معذرت قبول کر لی ہوگی۔

✉: کراچی سے ہماری ساتھی لکھاری نجیل متلو محفل میں موجود ہیں۔ لکھتی ہیں محترم کاشی جی ہمیشہ شاد مان رہیں، السلام علیکم۔ اللہ پاک کے کرم سے سب ادارے کے ممبران بھی خیریت سے ہوں گے اور رمضان کی برکتوں سے مستفید ہو رہے ہوں گے آمین، میری کہانی جولائی کے شمارے میں شائع کی بہت نوازش۔ خوشی سے دل باغ و بہار ہو گیا۔ اس گرمی میں بھی، شکریہ۔ ابھی رسالہ پڑھا نہیں ہے، اگست میں پر اسرار نمبر نکال رہے ہیں، ویسے عید اگست میں ہے تو عید نمبر ہونا چاہیے نا...... آپ کا کیا خیال ہے دوشیزہ کی محفلیں خوب جمیں آمین۔ عید کے موقع پر ایک کہانی لکھ کر بھیج رہی ہوں ہمیشہ کی طرح ضرور رسالے میں جگہ ملے گی شکریہ۔ اعزازی دوشیزہ بھیجنے کا بھی شکریہ۔ کاشی جی میری طرف سے آپ کو اور سب لکھنے والوں اور والیوں کو عید مبارک...... آج 17 واں روزہ ہے تو اب عید تو دور نہیں ہے نا باقی تبصرہ پھر کبھی۔ سب کو سلام دعائیں۔

✍: پیاری بہن! خدا آپ کو بھی بہت ساری خوشیوں سے سرفراز کرے۔ کہانی کے سلسلے میں آپ بہت لیٹ ہو گئیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉: تمثیلہ زاہد نے کراچی سے حقِ دوستاں کچھ یوں ادا کیا ہے۔ محترم رخسانہ سہام مرزا، منزہ سہام اور کاشی بھائی السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جولائی کا دوشیزہ میرے ہاتھ میں ہے، سب سے پہلے 27 ویں دوشیزہ تقسیم ایوارڈ کی تقریب میں سب ہی ایوارڈ یافتگان کو میری جانب سے ڈھیروں مبارک باد۔ مستقبل کے منصوبے بنانا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کی تمنا ہر ایک کی طرح میرے دل میں بھی تھی لیکن اس بات کا واثق یقین نہ تھا کہ یہ کامیابی دوشیزہ ایوارڈ کی صورت میں اپنی دوسری ہی تحریر پر مل جائے گی۔ اس کے لیے کاشی بھائی کی حوصلہ افزائی اور رخسانہ سہام مرزا کی شفقت و پیار کی ممنون ہوں جن کے خطوں کے پیارے جوابات پڑھ کر دل میں ڈھیروں توانائی محسوس کرتی ہوں۔ ایوارڈ کی تقریب کی پُر رونق محفل میں بیٹھ کر ان سب ہی چہروں کو دیکھنے کا قریب سے موقع ملا جن کی تحریریں ہم پڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا یہ سب ہی چہرے ایک دوسرے سے مل جل

رہے ہیں۔ آپس میں خوش گپیاں لگا رہے ہیں، یہ ایک دوسرے سے محبت اور انہوں نے رشتے کی ایسی ڈور میں بندھے ہیں کہ جن کی مضبوطی ان کے لفظوں کی چاشنی سے ٹپک رہی تھی۔ میں نے دیکھا یہ سب ہی چہرے، جس سایہ دار درخت کی چھاؤں تلے پروان چڑھ کر آج کامیابی کے روشن چمکتے ستارے ہیں۔ وہ اُن کے ذکر پر آب دیدہ ہیں...... وہ اب ہم میں نہیں، وہ جنہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اُن سے ملی نہیں۔ آج اُن کی باتیں اُن ہی کی بیٹی منزہ سہام اور اُن چمکتے ستاروں سے سن رہی ہوں۔ محترم سہام مرزا کو اگر میں شجر سایہ دار سے تشبیہ دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ روشن ستارے ادب کے آسماں پر اپنی تابناکی کیوں نہ دکھاتے کہ یہ ایسے درخت کے سائے تلے پروان چڑھے کہ جس کا مقصد ہی فن کی خدمت کرنا اور اُسے پروان چڑھانا تھا۔ ایسے لوگ بہت کم ہی پیدا ہوئے جن میں نئی سوچ کی آبیاری کرنے کی ہمت وحوصلہ ہو، بغیر کسی صلہ کی امید رکھے وقت اور توانائی خرچ کرنا چھوٹی بات نہیں۔ وہ سلسلہ جو محترم سہام مرزا صاحب سے چلا تھا ایوارڈ کی تقریب کے انعقاد کا یہ تسلسل منزہ سہام نے برقرار رکھا ہے۔ وہ اپنے والد کے مشن کو اُسی طرح لے کر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ انسان نے تو فنا ہو جانا ہے، اُس کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔ محترم سہام مرزا کا یہ بھی یہ عمل قابلِ تحسین ہے جو آج بھی جاری و ساری ہے اللہ انہیں بلند درجات عطا کرے آمین۔ عقیلہ حق کو جون کے ایوارڈ کی مبارک باد۔ صدف آصف، فوزیہ احسان رانا، مدیحہ اصغر نے اچھا لکھا۔ اور ہاں عینی جعفری سے ملاقات اچھی رہی۔ آپ سب ہی کو میری جانب سے عید مبارک، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اجازت چاہوں گی۔

ﷺ: اچھی بہن! آپ کو ایوارڈ مبارک۔ یہ محبتوں کے سلسلے آپ سب کی وجہ سے تو ہیں۔

✉: نیئر رضاوی صاحب کراچی سے مختصر ترین نامے کے ساتھ حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں محترم کاشی چوہان صاحب، السلام وعلیکم! سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو، دوشیزہ کے تمام اسٹاف کو اور تمام قارئین کو پیشگی عید مبارک۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفظ وامان میں رکھے (آمین) اس سے پہلے ایک غزل بھیجی تھی۔ آپ کی مہربانی سے 'دوشیزہ' کی زینت بن چکی ہے۔ اب ایک اور غزل ارسال کر رہا ہوں اُمید کرتا ہوں کہ یہ بھی جلد شائع ہو جائے گی۔

ﷺ: پیارے بھائی نیئر! یہ کیا اپنی کہی اور چلے گئے۔ پرچے پر تبصرہ کب تک اُدھار رکھیں گے؟

SMS کے ذریعے محفل کا حصہ بننے والے قارئین

شعبان کھوسہ، کوئٹہ ☆ عمران مظہر، ژوب ☆ شمیم ناز صدیقی، کراچی ☆ پھول رانی، بھوربن ☆ ظفر علی شاہ، کراچی ☆ ناظمہ ارشد، کرچی ☆ شاہدہ سعید، گوجرانوالہ ☆ نعیم اکبر، قصور ☆ یاسمین عمران، نیا کوہرا ☆ احسن عمرانی، سجاول ☆ مقصود بلوچ، دادو ☆ وصف اللہ، کوئٹہ ☆ عظمیٰ شکور، سرگودھا ☆ نوشین اقبال نوشی، کھاریاں۔

ساتھیو! لیجیے اس ماہ ہماری ملاقات اختتام کو پہنچی۔ آپ سب کو میری، میرے ادارے کے ساتھیوں اور پرل پبلی کیشنز کی جانب سے عید کی بہت بہت مبارکباد۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

آپ کا ساتھی
کاشی چوہان

سن کے سوال

ایف ایم 105 کی آر جے اور سچ سویرا کی میزبان

ہُما کاشف

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥:ہما کاشف۔
☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥:ہما۔
☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥:کراچی۔
☆زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
♥:Arles
☆علم کی کتنی دولت کمائی؟
♥:گریجویشن۔
☆بہن بھائیوں میں آپ کا نمبر؟
♥:پانچواں۔
☆برسر روزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہو گئیں؟
♥:بالکل۔
☆موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟
♥:ابھی تو بہت آگے جانا ہے۔
☆وجہ شہرت کون سا پروگرام بنا؟
♥:ریڈیو کا پہلا پروگرام بی ان اسٹائل اور وجہ شہرت آواز و انداز بنا اور اب سچ سویرا میں لوگوں نے پسند کر کے پہچان دی
☆پروگرام کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
♥:بالکل۔
☆:اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟
♥:اپنے لیے وقت نکالنا۔
☆:کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
♥:ہزاروں خواہشیں ایسی کہ......
☆:کون سی چیز کی کمی آپ آج محسوس کرتی ہیں؟
♥:کراچی میں اپنا گھر بنانا ہے۔
☆:اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟
♥:دوسروں کا خیال رکھتی ہوں، ان کی ہر ممکن مدد کرتی ہوں اور اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہوں مگر......
☆:اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟
♥:دوسروں پر جلد بھروسا کر لیتی ہوں۔
☆:زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟
♥:اپنوں نے تو نہیں ہاں پرائے لوگ دکھ دیتے ہیں۔

☆: لباس جگ بھاتا پہنتی ہیں یا من بھاتا؟
♥: مجھے اسٹائلش لباس پسند ہیں۔
☆: اردو والے "سفر" کا ذریعہ کیا ہے؟
♥: اپنی کار ہے۔
☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟
♥: فجر کی نماز پڑھ کر۔
☆ دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
♥: جب اپنے بیڈ روم میں ہوں۔ کیونکہ تھکن کے مارے برا حال ہوتا ہے اپنا بیڈ آغوش میں لے کر ماں کی طرح تھپکتا ہے۔
☆: حساس ہیں یا......؟

☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟
♥: ایک حد تک تو سب کو ہونا چاہیے۔
☆ یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟
♥: بچپن کی یادیں اور ماضی۔
☆: غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ وپکار؟
♥: کچھ بھی ہو سکتی ہے۔
☆: موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
♥: جب اپنی مرضی سے کام نہ ہو رہا ہو۔
☆: غصے میں کھانا پینا چھوڑا کبھی؟
♥: نہیں! میں اپنی صحت کا نقصان نہیں کرتی۔ غصہ لوگوں پر نکالتی ہوں کھانے پر نہیں۔

♥: بہت زیادہ۔
☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟
♥: اگنور کرنا دکھ کا باعث بنتا ہے۔
☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔
♥: عزت، صحت، محبت، شہرت اور دولت۔
☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟
♥: اندازِ گفتگو۔

☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟
♥: موبائل، گلاسز، پرس اور ATM۔
☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟
♥: بہت اچھی (ہاہاہا)۔
☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟
♥: موت سے ڈر نہیں لگتا۔
☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: سو فیصد۔
☆: کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟
♥: اماں کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں مگر اب ہر وقت ان کے ہاتھ کے کھانے تو نہیں کھا سکتے نا۔
☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟
♥: کچھ بھی مل جائے۔
☆ زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟
♥: دونوں کی۔
☆: ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟
♥: اپنی فیملی کے ساتھ۔
☆: پاکستان میں کس تبدیلی کی خواہاں ہیں؟
♥: تعلیم بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں تعلیم (خواندگی) ہی تبدیلی لا سکتی ہے۔
☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: خاموش، سناٹا، سکون، واؤ، زبردست ہے سمندر۔
☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری کے لیے؟
♥: مطالعہ بہت ضروری ہے، میری عادت ہے کیونکہ بہت ساری چیزیں انسان کتابوں سے سیکھتا ہے۔ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔
☆: لوگ آپ کی کس چیز کی زیادہ تعریف کرتے ہیں؟
♥: آواز کی۔
☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥: رحمت ہی ہے۔
☆ 365 دنوں میں کس دن کا زیادہ انتظار رہتا ہے؟
♥: اپنی برتھ ڈے کا۔
☆: کیا آپ اچھی راز داں ہیں؟
♥: بالکل۔
☆: پسندیدہ شخصیت؟
♥: قائداعظم۔
☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: آئینہ دیکھنے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔ جب کوئی تعریف کر دے تب دیکھتی ہوں۔ اُس وقت خیال تو کوئی نہیں آتا ہاں مسکراہٹ آجاتی ہے لبوں پہ۔
☆: ''یہ زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟
♥: جہاں تک ممکن ہو سکے۔
☆ موسیقی واقعی روح کی غذا ہے اور کیسی؟
♥: یہ تو آپ کی روح پر ڈیپینڈ کرتا ہے، ہر روح کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔
☆: آپ کی کوئی ایسی دوست جس سے ہزار بار ملنے کو دل چاہتا ہو؟
♥: میری دوست شعاع، میں اُس سے ہزار بار بھی ملوں تو کم ہے۔
☆: خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
♥: بزدل ہوتا ہے۔
☆: اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟
♥: اچھی بات یہ ہے کہ جب ہمارے ملک میں کوئی اچھا کام کرے تو اس کو سراہا جاتا ہے۔
☆: لوگوں کی کوئی عادت جو بہت بُری لگتی ہے؟
♥: جب بھی کوئی کام کرنے لگو (اپنے مائنڈ سے) تو لوگ خوامخواہ کی نصیحتیں شروع کر دیتے ہیں۔
☆: کون سا ملک بہت پسند ہے؟
♥: پاکستان! ہمارا پاکستان سب سے اچھا ہے اور اس کے بعد مجھے سعودی عرب بہت پسند ہے۔
☆: کیا ہم آزاد ہیں؟
♥: بالکل سو فیصد ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ پاکستان میں حقیقی جمہوریت ہے۔ ہم جس ایشو پر چاہیں بات کر سکتے ہیں تو یہ آزادی نہیں ہے کیا؟
☆: حرف آخر کیا کہنا چاہیں گی؟
♥: ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ آزادی سے پیار کریں۔ پاکستان سے پیار کریں۔

☆☆......☆☆☆

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی

جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''

''کہاں ہیں وہ......؟''

''لو...... یہ تو اللہ ہی جانے بیٹا۔''

''ٹھیک ہے...... میں انہیں تلاش کروں گا۔''

کیا یہ روایت دُرست ہے؟

اسی روایت کی کھوج میں نکلے اُس نوجوان کی کتھا......

جب ایک ڈاکٹر نے اُس کے جذبۂ جستجو کو ہوا دی

ڈاکٹر نے کہا

''تمہیں برین کینسر ہے...... تمہاری عمر مختصر ہے......''

''نہیں ڈاکٹر...... مجھے کینسر نہیں ہے...... اور اگر ہے تو بھی میں نہیں مروں گا...... میں بہت لمبی عمر جیوں گا......''

موت سے پنجہ کش ایک سرکش نوجوان کی ناقابلِ فراموش داستان

کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟

کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

ایک انوکھی داستان...... جو بہت جلد ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے صفحات کی زینت بن رہا ہے

منی اسکرین پر پیش کیے جانے والے مقبول عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ

علی رضا عمرانی

اس وقت پاکستان میں تقریباً بیسیوں چینل عوام کی دسترس میں ہیں۔ اس الیکٹرانک خوشحالی میں جہاں عوام کے پاس معیاری ڈراما دیکھنے کا کال نہیں' وہیں ڈراموں کی بہتات نے بہتر سے بہترین' معیار اور کوالٹی کے لیے چوائس آسان کر دی ہے۔ منی اسکرین میں ہم مقبول عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ شائع کریں گے۔

پاکستانی ڈراموں کی سب سے اچھی اور خاص بات یہ ہے کہ وہ جلد ختم ہو جاتے ہیں سالوں نہیں چلتے (عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے:) شاید اسی وجہ سے یہ نہ صرف پاکستان بلکہ پڑوسی ملک میں بھی شوق سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں اب ہمارے یہاں بڑی تعداد میں ڈرامے بنائے جا رہے ہیں، نت نئے نجی چینلز کھل چکے ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ نیا ٹیلنٹ بھی ابھر کر سامنے آ رہا ہے، جو اس انڈسٹری کے لیے خوشگوار جھونکا ثابت ہوا ہے۔

اِک محبت کے بعد

اے آر وائی ڈیجیٹل سے پیش کی جانے والی

ڈرامہ سیریل ''اِک محبت کے بعد'' اپنی خوبصورت کہانی کے باعث بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ ہر جمعرات کی رات 9 بجے شب یہ سیریل دیکھی جا سکتی ہے۔ وصی شاہ کی لکھی اس سیریل کی ہدایات کاشف نثار نے دی ہیں۔ اس سیریل کے نمایاں اداکاروں میں نعمان اعجاز، سبرین ہسبانی، وجیہہ خان، ارم اختر، عمیر رانا، منزہ عارف اور سیمی راحیل شامل ہیں۔ ان تمام اداکاروں کی شاندار اداکاری نے اس سیریل کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

سوتیلی

اے آر وائی ڈیجیٹل سے پیش کیا جانیوالا ڈرامہ ''سوتیلی'' سیما غزل کے قلم سے نکلی وہ حقیقت ہے جو قارئین کے دل میں گھر کر چکی ہے۔ سوتیلی کی ہدایات شہزاد شیخ نے دی ہیں۔ جبکہ یہ سپرہٹ سیریل ہر اتوار کی رات آٹھ بجے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سیریل میں عائشہ خان، دیپک پروانی، سبرین ہسبانی، عاشر وجاہت، صبا فیصل، شہزاد شیخ اور سعدیہ فیصل نے اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ سیریل اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں شوبز کی دنیا کی نامور شخصیت دیپک پروانی پہلی بار اسکرین پر زبردست رول کے ساتھ نمودار ہوئے ہیں۔

جیتو پاکستان، نمبرون رمضان شو

اس مرتبہ رمضان کی خصوصی ٹرانسمیشن کی دوڑ میں اے آر وائی ڈیجیٹل بھی کسی سے پیچھے نہیں یہ خصوصی شو جیتو پاکستان کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے جس کے میزبان فہد مصطفیٰ ہیں۔ رمضان کی خصوصی ٹرانسمیشنز جس طرح سے کمرشلائز ہوگئی ہیں اس سے تو سب ہی واقف ہیں۔ جیتو پاکستان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس ٹرانسمیشن کے عنوان میں ماہ رمضان کے بابرکت نام کو کمرشل ازم کا لبادہ نہیں اوڑھایا گیا۔ اس وقت جیتو پاکستان ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔ رمضان ٹرانسمیشن میں ریٹنگ کے حساب سے بھی ARY ڈیجیٹل کا جیتو پاکستان ریکارڈ ریٹنگ لے رہا ہے۔

میں نہ مانوں ہار

یہ مزاحیہ ڈرامہ ہم ٹی وی پر پیش کیا جارہا ہے، تاہم اس میں مزاح کا وہ عنصر مفقود نظر آرہا جو مشہور و معروف اداکار عمر شریف کا خاصہ ہوتا ہے۔ میں نہ مانوں ہار مصنفہ اور مشہور ناول نگار ثمرہ بخاری نے تحریر کیا ہے۔ اس کی ہدایت سیف حسن نے دی ہے۔ اداکاروں میں سکینہ سموں، عمر شریف، شہروز سبزواری، فائزہ حسن، سلیم شیخ اور ناہید شبیر وغیرہ شامل ہیں۔ اس ڈرامے کی تشہیر میں عمر شریف کا نام تو خوب استعمال کیا گیا ہے، تاہم ابھی تک ان کا کردار اس انداز میں سامنے نہیں آپایا ہے۔ اسکرپٹ سست سا ہے، کچھ سین فیملی فرنٹ اور تنہائیاں کی یادیں تو

تازہ کر رہے ہیں مگر ان میں بھی بے ساختگی کی کمی ہے۔ ڈرامے میں عمر شریف کو ایک دیہی علاقے کا نواب دکھایا گیا ہے، گاؤں کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے حل ہونے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ بھی لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ان مسئلوں کو چٹکی بجاتے ہی حل کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں، اکثر نواب صاحب کو اسی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ان کی جی جی کار میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ہی چیز انہیں خوشی فراہم کرتی ہے، اور وہ دوسروں کے مسائل میں کود پڑتے ہیں۔

الوداع

پاکستان کے خوبرو اور وجیہہ اداکار عمران عباس اور صنم جنگ، ہم ٹی وی کی نئی ڈرامہ سیریل الوداع میں ایک بار پھر ساتھ آ رہے ہیں۔ الوداع کی ہدایت شہزاد کاشمیری نے دی ہے، جو دل مضطر کے ہدایت کار بھی رہ چکے ہیں، جس میں ان دونوں اداکاروں کی جوڑی نے بہت مقبولیت پائی تھی۔ الوداع کی کہانی اور اسکرین پلے سمیرہ فضل نے لکھا ہے، جو اس سے قبل ''شک''، میرا نصیب اور کبھی کبھی جیسے یادگار ڈرامے تحریر کر چکی ہیں۔

دل کا دروازہ

ہم ٹی وی کی ڈرامہ سیریل ''دل کا دروازہ'' کو مشہور رائٹر رخ چوہدری نے لکھا ہے۔

اس کے ہدایت کار کامران اکبر خان اس کی کاسٹ میں طیفور خان نیازی، نیلم منیر، راشد فاروق، فرح ندیم اور عذرا مجید وغیرہ شامل ہیں۔ ڈرامے کی کہانی عزیز احمد اور ان کی اہلیہ شہلا کے گرد گھومتی ہے۔ ان کے دو بچے لیلی اور جنید ہیں۔ کہانی کے مرکزی کردار لیلی کو ماڈلنگ کرنے کا جنون ہوتا ہے، لیکن شہلا کی سوتیلی بہن کا بیٹا وجاہت اپنی ماں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلا اس سے لینے کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ لیلی سے شادی کے ذریعے عزیز احمد کی پوری دولت پر قبضہ جمانے کا خواہش مند ہوتا۔ لیلی بھی کچھ اور ٹھانے بیٹھے ہوتی ہے۔ کون اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا ہے اور ہار کس کا مقدر ٹھہرتی ہے یہ بات تو آہستہ آہستہ ہی کھلے گی۔

☆☆......☆☆

تقریب میں موجود مہمانانِ گرامی

آغازِ تقریب

کا اعلان کرتے ہوئے

قلم کار بہنیں اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے

دردانہ نوشین خان

رفعت سراج

فرزانہ آغا

رضوانہ پرنس

دلشاد نسیم

فرحت صدیقی

رضیہ مہدی

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتگان

شمیلہ زاہد، فرحت صدیقی، تسنیم منیر علوی، رضوانہ پرنس اور فرزانہ آغا، مہتاب اکبر راشدی سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

نسیم نیازی (نگہت سیما کا ایوارڈ) بشریٰ سعید احمد، سنبل، محمد تقی اور دلشاد نسیم، محمود شام سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

میجر عاصم (صمیم فضل خالق کے بھائی) زر افشاں فرحین، سیمار ضا ردا، نسیم آمنہ اور شہناز انور رشدا، فاطمہ ثریا بجیا سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

ایڈیسن ادریس مسیح، عقیلہ حق، سائرہ غلام نبی، رضیہ مہدی اور دردانہ نوشین خان، مہتاب اکبر راشدی سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

روحیلہ خان (روحیلہ کا ایوارڈ ان کے ننھے بھانجے نے وصول کیا) کاشی چوہان، فرح اسلم قریشی، ناہید فاطمہ حسنین اور علی زیدی، محمود شام سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

خصوصی ایوارڈ یافتگان

رخسانہ سہام مرزا نے جناب اکبر راشدی کو خصوصی ایوارڈ پیش کیا

محمد اقبال رحمان محمود شام سے خصوصی ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

فرزانہ آغا، سلمیٰ یونس اور دردانہ نوشین خان نے اپنے خصوصی ایوارڈز جناب اکبر راشدی سے وصول کیے

ستائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ 2014ء وصول کرنے والے رائٹرز کی ایک یادگار تصویر

تقریبِ ایوارڈ کی لمحہ بہ لمحہ رُوداد

کاشی چوہان کے قلم سے......

ابھی کل کی سی بات لگتی ہے جب میں نے جولائی 2008ء میں دوشیزہ جوائن کیا تھا۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تصاویر سے دل کشادہ کیے میرا بچپن جوانی کی سیڑھیاں چڑھ کر عین نوجوانی میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک دوشیزہ کو زندگی کا ہم سفر کر دیا گیا۔ ابھی دوشیزہ سے سیر ہو کر مستفید بھی نہ ہوئے تھے کہ اپنی محبوبہ کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے اور ایسا اسیر ہوئے کہ الحفیظ، الامان اور آج گھر اور باہر کی دونوں دوشیزاؤں پر پورا اختیار ہے۔ (جملہ حقوق کے ساتھ۔ ایڈیٹر کو اتنا تو کہنے کا حق ہے نا...... ہاہاہا) تو جناب بات چلی تھی کہاں سے اور دوشیزہ کہاں تک پہنچ گئی۔ 2009ء کی یکم جولائی کو غزالہ آپی (غزالہ رشید) کے ساتھ میں مجھے تحفتاً دے دیا گیا۔ (بقول آپی کے) کچھ ہی دنوں بعد غزالہ آپی کے آتے ہی میڈم منزہ نے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی 26 ویں تقریب کے انعقاد کے آرڈر جاری کر دیے (دیکھا غزالہ آپی کا رعب) غزالہ آپی اس سے پہلے بھی ان تقاریب کے انعقاد میں شامل رہی تھیں۔ مگر وہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اب ہم دونوں جت گئے اور دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ 2010ء کا انعقاد ہوا۔

غزالہ آپی 2012ء میں ہم ٹی وی کے شعبہ اسکرپٹ کو سدھار نے چلی گئیں اور رہ گیا میں اکیلا...... مگر ساتھیو! اس تنہائی نے مجھے مہمیز کیا۔ مجھے یاد ہے اگست 2012ء کا جو پرچہ دیا وہ بھی عید نمبر ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے Horse سے Donkey بن کر کام کیا اور...... (دوستو! اب خود بھی کچھ سمجھ جاؤ) میں اس سفر میں خدا کے بعد سب سے پہلے اپنی مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام کو سیلوٹ پیش کروں گا۔ جنہوں نے مجھے کچھ کر دکھانے کا نا صرف موقع فراہم کیا بلکہ میری صلاحیتوں پر جو اعتبار اور بھروسے کا Stamp لگایا وہ مجھے اس تقریب کو اتنے بھرپور انداز میں تکمیل پہنچانے میں کامیاب کر گیا۔ Thank You میڈم! خدا آپ کو تا حیات مسکراتا اور آلام سے دور رکھے۔ اب بات ہو جائے رائٹرز

ایوارڈ کی 27 ویں تقریب کی ...... ہم نے اگست 2013ء سے ایوارڈ کی تقریب کا اشتہار دینا شروع کردیا تھا۔ میڈم بہت Excited تھیں۔ 2010ء میں پانچ سال کے ایوارڈ کی تقسیم کی تقریب تھی تو اب 2014ء میں بھی 4 سال کے ایوارڈ کی تقریب منعقد کی جارہی تھی۔ کام آسان نہ تھا۔ مگر میں...... دل چاہتا تھا پورے پاکستان کو اس تقریب میں اکٹھا کرلوں کہ دیکھو آج بھی سہام مرزا "مرحوم" نہیں بلکہ زندہ جاوید ہیں۔

یہ رنگ رنگ کہانی ' یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں
یہ کام ہم نہیں کرتے ہمارے دفتر میں
یہ کام آج بھی حضرت سہام کرتے ہیں

جس طرح قائداعظم ہر وقت ہمیں دل سے زیادہ قریب لگتے ہیں۔ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں (رنگ برنگے نوٹ...... قائد کے بغیر بے کار ہوتے ہیں نا یار!) اسی طرح ہمارے اس مسلسل سفر میں مرزا صاحب کے بعد سے اب تک جتنے بھی شمارے نکلے اور یہ سفر جاری وساری ہے تو مرزا صاحب ہمارے درمیان کسی بھی صورت موجود ہیں۔ سچ کہوں تو اب جو بات میں تحریر کروں گا وہ میں نے آج تک کسی سے شیئر نہیں کی۔ مہینے کے کم از کم پندرہ دن میں دفتر سے بہت Late نکلتا ہوں۔ 6 بجے دفتر کا کام ختم اور میں جب تک اپنے کام سے Satisfied نہ ہوجاؤں بھلے رات کا ایک ہی کیوں نہ بج جائے نہیں نکلتا۔ حالانکہ طاہر (Accountant) کو کبھی کبھی چھ سے ساڑھے چھ ہوجائیں تو کہتا ہے کہ کاشی آدھا گھنٹہ اور رُک جاؤ میں اکیلے نہیں رُکتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

مجھے ہنسی آتی ہے اس کی بات پر۔ ہاں تو بات یہ تھی کہ اکیلے میں اکثر لوڈشیڈنگ کا بھوت بھی ڈراتا ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے شفیق سے سہام مرزا میرے کام کو دیکھ رہے ہیں اور میرے ساتھ ہی بیٹھے ہیں۔ ساتھیو! ایک بار تو مجھے سہام مرزا نے چائے بھی پلائی تھی۔ یہ واقعہ پھر کسی وقت...... حالانکہ میں نے مرزا صاحب کو اپنی زندگی میں براہ راست کبھی نہیں دیکھا مگر آج میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں۔ شہید کبھی نہیں مرتے بلکہ صرف دنیا سے پردہ کرلیتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی اپنی معطر خوشبو لیے موجود ہوتے ہیں۔

ساتھیو! تقریب کے انعقاد پر پورا اسٹاف مستعد تھا۔ ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی اور قمر تابندہ نے بہت تعاون کیا (میرے ساتھی ہیں)۔ ہمارے کمپوزرز مرزا یاسر بیگ اور محمد کاشف۔ محمد طاہر جس نے سردھڑ کی بازی لگادی اس تقریب کے انتظام و انصرام کے لیے۔ (اکاؤنٹنٹ ہیں ہمارے) محمد اقبال زمان جو کہ واقعی اقبال کے شاہین ہیں۔

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا والا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ ہمارے سفیان میاں اور آفتاب صاحب جو کہ سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کے اہم پُرزے ہیں اور ہماری بہت پیاری شبانہ...... جو کہ آپ کے ساتھ بالواسطہ اور بلاواسطہ ساتھ رہتی ہیں۔ جی ہاں آپ کے اور ہمارے درمیان ٹیلیفونک رابطہ شبانہ ہی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے نائب قاصد...... اقبال میاں۔ اور پھر ہمارے باس (Boss یار) زین العابدین...... ماشاءاللہ، خدا نظرِ بد سے بچائے نوجوان ہیں۔ (BBA کے فائنل سمسٹر کے اسٹوڈنٹ ہیں بھئی) ایک طائرانہ نظر میں پورے دن کا حال گوش گزار کردینے والے۔ یہ ہے ہماری ٹیم...... جس نے 27 ویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کو ممکن بنایا۔

SMS کے ذریعے اس دورِ جدید میں کوئی ایسا

نہ تھا جس تک درجن بھر Msgs نہ پہنچائے گئے ہوں۔ Call نہ کی گئی ہو مگر سلام ہے میرے پیاروں کو کہ جب میڈم نے Call کی۔
"ہمیں تو پتا ہی نہیں ہے۔ کب ہے تقریب منزہ۔" یہ کہا تھا اور 'کیوں' کہا تھا؟ میں اب تک اِس اندر جال سے نہ نکل پایا...... خیر جی سب سے پہلے دردانہ نوشین خان نے آنے کا عندیہ دیا۔ پھر فرزانہ

عاصم میرا ایوارڈ وصول کرنے آرہے ہیں۔ نسیم نیازی آخر تک رابطے میں رہیں کہ ہمیں کوئی ایوارڈ دو تو ہم آجائیں۔ مگر...... فیصلے ہو چکے تھے اب تو اعمال ناموں کا دن تھا۔
نسیم جی کا فون آیا نگہت سیما کا ایوارڈ ہم وصول کریں گے۔ (ساتوں کی) میں نے نگہت سیما سے ایوارڈ وصول کرنے کی اجازت لی اور نسیم نیازی جی

مهتاب اکبر راشدی صاحبہ

جب یہاں پر ہم پرانے محاورے دہراتے ہیں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مردانہ وار نکل آئی، کیا مطلب ہے، زنانہ وار بھی نکل کر آسکتے ہیں۔ اب بدل دیجیے یہ محاورے۔ اُس وقت یہ اُن مردوں نے لکھے تھے جب اُن کو مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔ اب عورتیں اپنی چیزوں کو سمجھتی ہیں۔ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

آغا نے حقِ دوستاں ادا کرنے کی حامی بھری۔ پھر دلشاد نسیم نے محبت کا یقین دلایا۔ فرحت صدیقی (خدا آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے اور عمر دراز کرے آمین) کا تو ہمیں سو فیصد یقین تھا کہ آپ جیسے محبتوں کے سفیر کب کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ بشریٰ سعید احمد بہت Excited تھیں آنے کے لیے۔ نیئر شفقت کا شکر ہے کہ فون نمبر مل گیا اور قربان جاؤں ایسی محبت کے، آپ نے آنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ پھر ہمیں انتظار تھا نگہت سیما، عابدہ سبین، احمد سجاد بابر، حافظ مظفر محسن، شمیم فضل خالق، اُم مریم، زرافشاں فرحین کا مگر یہ انتظار انتظار ہی رہا۔ زرافشاں فرحین کا اچانک سے پروگرام بنا (ہماری خوش قسمتی) اور آپ ہمارے پاس آگئیں۔ لیجیے جناب اب شمیم فضل خالق کو فون کیا تو انہوں نے کہا کہ میرے بھائی میجر

لاہور سے کراچی (یار آپی! آپ نے ہی تو حیدر آباد سے فون کر کے کہا تھا کہ میں تو واپس چلی بھی گئی لاہور...... مگر ساری بات کے اختتام پر آپ کے حیدر آباد والے کوڈ سے جب ہم نے آپ کو یاد دلایا کہ جناب تو وہاں کا کوڈ ہے......) ارے بابا۔ نسیم آپی آگئیں بس۔ بات ختم۔ غزالہ فرخ صاحبہ، ہماری بہت پیاری لکھاری دوست، متعدد ایوارڈز ونر، شاید اب انہیں نہ ایوارڈ کی ضرورت ہے نہ ہماری...... (غزالہ جی! آپ کا پچھلا ایوارڈ، ابھی تک ہمیں آپ کی یاد دلا رہا ہے اور اب تو ایک اور ایوارڈ بھی اُس کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے) اب لیجیے جناب دعوت جیسے تیسے، ایسے ویسے سب کو مل گئی اور 27 مئی کو کشاں کشاں دل کشاں (دل کشا) ہال ہمارے رائٹرز کی آمد سے سج گیا۔

آہستہ آہستہ رنگ بکھرتے جا رہے تھے، فضا عطر بیز ہوتی جا رہی تھی۔ رضوانہ پرنس جولندن سے بطور خاص اس تقریب خاص میں شرکت کے لیے تشریف لائی تھیں، منزہ سہام کے ساتھ ہی ہال میں داخل ہوئیں۔ منزہ سہام دیکھ رہی تھیں کہ سب آ رہے ہیں مگر کاشی...... (موصوف والدہ کی اچانک بیماری کے باعث تقریب میں تاخیر سے وارد ہوئے تھے) میں دیر نہیں کرتا۔ دیر ہو جاتی ہے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ (اس لیے اب کچھ نہ کہیں پلیز، پھر کبھی سہی) سیما رضا ردا، آصف الیاس اور ریڈیو کے ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھیں۔ غزالہ عزیز اپنی بہن کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ نشاط خان اپنی صاحبزادی کے ساتھ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی رخسانہ سہام مرزا، فرحت صدیقی کے ساتھ موجود تھیں۔ عقیلہ حق تقریب میں اکیلی آئی تھیں (ناراض تھیں شاید) رفعت سراج اور فرح اسلم قریشی اپنی اپنی فیملی کے ہمراہ تقریب کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ دلشاد نسیم بھی آ گئیں۔ اب ناہید فاطمہ حسنین، نزہت جبیں ضیاء، مسز نگہت غفار، الماس روحی، سنبل (اپنے میاں جی کے ساتھ) بشریٰ سعید احمد اور زرافشاں فرحین اپنے بھائیوں کے ساتھ، نیئر شفقت اپنے میاں جی کے ہمراہ، اور شگفتہ شفیق نرم، دلکش مسکراہٹ سجائے اپنی صاحبزادی ڈاکٹر کنزل کے ساتھ ہال میں موجود تھیں۔ ہماری بہت لچنڈ اور دوشیزہ کی چہیتی رائٹر دردانہ نوشین خان مظفر گڑھ سے بہت لیٹ آئیں۔ تقریب چونکہ شروع ہو چکی تھی اس لیے اُن کی سیٹ بُک ہو چکی تھی۔ (معذرت دردانہ جی یہ...... پاکستانی عوام ہے) شمیم فضل خالق کے بھائی میجر عاصم بھی آ چکے تھے۔ نسیم نیازی، سلمیٰ یونس، سکینہ فرخ، تمثیلہ زاہد بھی آ گئیں۔ اب آمد ہوئی ہماری دبئی سے آنے والی تسنیم منیر علوی اور ان کی بہن غزالہ علوی کی۔ اب ہمارے اسپیکر سید شاہد حسن (قومی اخبار) کی آمد ہوئی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے آپ اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سائرہ غلام نبی ساڑی میں ملبوس ہال میں آئیں، ان کے ساتھ اُن کی بہن بھی تھیں۔ پھر ہمارے سامنے تھیں ہماری بہت عزیز شائستہ عزیز اور اُن کی یارِ غار سیما مناف (سیما بہت اسمارٹ ہو گئی ہیں۔ نظر اتروا لیجیے گا) ارے بھول ہو گئی ساتھیو! افسر سلطانہ بھی رضیہ مہدی کے ساتھ ساتھ ابتدائی آمد والے مہمانوں میں شامل تھیں۔ (رضیہ جی! خدا صحت اور سلامتی دے آپ کو) محمد تقی بھی ہمارے ساتھ ساتھ تقریب میں پہنچے اور سیما، شائستہ کی طرح، کاشی اور ایڈی (ایڈیسن ادریس مسیح) بھی ایک ساتھ دل کشا میں وارد ہوئے تھے۔ پھر آئیں نسیم آمنہ اور ان کے ساتھ ہی بینا تاج بھی سفید لباس میں تقریب کا حصہ بن گئیں۔ پروین شروانی اور ان کے شوہر بھی بڑے مان کے ساتھ تشریف لا چکے تھے۔ (خدا ہر پل مسکراتا رکھے) اب ہماری اس تقریب کی صدر مہتاب اکبر راشدی صاحبہ ہمیشہ کی طرح ایک دلنشین مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے تقریب میں آ چکی تھیں۔ منزہ سہام اور رضوانہ پرنس نے بڑی گرم جوشی سے مہتاب صاحبہ کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہمارے مہمانِ خصوصی جناب محمود شام صاحب اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائے۔ منزہ سہام کے ساتھ دانیال، زین العابدین، اقبال زمان، ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی صاحب پُر تپاک استقبال کرتے ہوئے آپ کو اسٹیج تک لے آئے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہماری سبزہ زاروں کے شہر سے آنے والی ساتھی فرزانہ آغا اپنے چندر مکھ فراز شہزادے کے ساتھ تقریب میں آ گئیں اور پھر ہماری سابقہ ایڈیٹر فریدہ مسرور مخصوص پُر خلوص، مسکراہٹ سجائے اس محفل

محمود شام صاحب

جو بات دل میں اتر جائے، وہ ادب ہے۔ دوشیزہ کی کہانیاں اور اس میں دوسری چھپنے والی چیزیں دل میں اترتی ہیں۔ اور جب تنہائی میں دل نہ بہلتا ہو تو یہ کہانیاں بھی ساتھ دیتی ہیں اور خاص طور پر جیل میں ڈائجسٹ بہت ساتھ دیتے ہیں۔ وہاں کچھ عرصہ تو آپ کچھ سیریس کتاب پڑھتے ہیں لیکن زیادہ آپ کو ان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جیل میں بھی، ریل میں بھی۔

میں موجود تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم، اب تقریب کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ سیما رضا ردا کے ہاتھوں میں مائیک آچکا تھا۔

سیما رضا نے محمد اقبال کو حسنِ قرأت کے لیے مدعو کیا اور قرأت کے ساتھ ہی اس حسین تقریب کا آغاز ہو گیا۔ اسٹیج پر محمود شام، سید شاہد حسن، مہتاب اکبر راشدی اور منزہ سہام موجود تھے اور قرأت کے بعد سیما رضا نے اسٹیج پر بیٹھے خاص مہمانوں کا تعارف کرایا۔

''ہماری اس تقریب میں کرسی ادارت پر جو فائز ہیں۔ یہ بہت بڑا نام ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے ہمیں رکھ رکھاؤ ملتا ہے، تہذیب ملتی ہے، ایک سچائی ملتی ہے، لفظوں کی حرمت کا پاس ملتا ہے۔ میں چاہوں گی کہ آپ ان کا بھرپور استقبال کیجیے۔ 'مہتاب اکبر راشدی صاحبہ'۔ (اب پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا)

میرے دوسرے مہمان، ان کا نام بھی بہت بڑا ہے صحافت کا، بہت قد آور شخصیت ہیں جس بھی اخبار سے وابستہ ہوتے ہیں وہاں جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ جب وہاں سے چلے جاتے ہیں تو لوگ ان کے قدموں کے نشان کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور وہ جا کر ایک نیا جہان آباد کر لیتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں، کالم نگار بھی ہیں۔ کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا ایک شعر جو اکثر میری زبان پر رہتا ہے۔

وہ جن کی دھن میں ہم اتوار کو بھی گھر نہ رہے
ملا جو شام تو اپنی طرف دیکھتا نہ تھا

''محمود شام صاحب''

(پنڈال پھر سے تالیوں سے گونج اٹھا تھا)

تیسرے مہمان ہیں ہماری اس تقریب کے اسپیکر، قومی اخبار میڈیا گروپ سے وابستہ ہیں۔ پرل پبلی کیشنز کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ دکھ سکھ کا ساتھی ہونا کتنی بڑی بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ دوستی کی سب سے بڑی تجدید ہے۔ آپ نے سچ کے لیے اذیتیں برداشت کیں اور قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ جب دکھ انسان جھیلتا ہے تو اس کا نام سرفہرست ہو جاتا ہے۔ محترم سید شاہد حسن صاحب کو بھی ہم یہاں خوش آمدید کہتے ہیں۔

اب چلتے ہیں پروگرام کے پہلے حصے کی جانب، یہ دوشیزہ کی تقریب ہے۔ ہر سال تو نہیں ہوتی مگر جب بہت سارے ایوارڈز اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ تقریب کی جاتی ہے۔ (سیما جی! اب ہر سال تقریب ہوا کرے گی)

دوشیزہ ایوارڈز ایسے ایوارڈ ہیں جو خواب بھی دکھاتے ہیں اور تعبیر بھی دکھاتے ہیں۔ اس کی مدیر اعلیٰ منزہ سہام مرزا جس محنت اور عرق ریزی سے کام کررہی ہیں وہ قابلِ احترام ہے۔ منزہ کے لیے میں اگر یہ کہوں کہ

میرے پاس اِک ایسا طلسم ہے
جو کئی زمانوں کا اسم ہے
جسے چاہا واپس بلالیا
جسے جب چاہا جیسا بنادیا

منزہ میں یہ کوالٹی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

منزہ سہام مرزا نے کہانیاں بھی لکھیں۔ ایڈیٹر بھی ہیں۔ چین کو مزید سکون دینے کی خاطر کالم نگاری کا سہارا لیا اور کالم نگاری کے میدان میں جھنڈا گاڑ دیا۔ آپ سب کی بھرپور تالیوں میں 'منزہ سہام مرزا'۔

منزہ سہام نے دھیمے انداز میں اپنا سپاس نامہ پیش کیا اور اس کے بعد جو اسپیکر آئے وہ تھے۔ سید شاہد حسن صاحب۔ سید شاہد حسن صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں بہت سارے قلم کاروں، سینئر رائٹرز سے آج مخاطب ہوں۔ آج سب کی موجودگی اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ہر ایک کا رشتہ قلم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ قلم جس سے ہم معاشرے میں تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات سماجی شہرت کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اور ہم سب کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم اپنی موجودہ نسل کا کتاب سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کریں۔ اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو ایک ماں بہت اچھے طریقے سے جوڑ سکتی ہے۔ چرچل نے یونہی نہیں کہا تھا کہ آپ مجھے اچھی مائیں دیں، میں آپ کو اچھی قوم دوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

شاہد حسن صاحب نے بڑی نپی تلی اور کھری گفتگو کی (جو آپ کو اگلے صفحات پر تفصیل کے ساتھ ملے گی) اس کے بعد سیما رضا نے شگفتہ شفیق صاحبہ کو اسٹیج پر بلایا اور شگفتہ نے نہایت خوبصورت انداز کے ساتھ منزہ سہام اور ان کی کتاب اجلے حروف پر ایک نظم پیش کی۔

شگفتہ کے بعد سیما رضا نے منزہ سہام کی کتاب اجلے حروف میں شامل ایک کالم پیش کرنے کے لیے ٹی وی اینکر، براڈ کاسٹر آصف الیاس کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ آصف نے مائیک سنبھالتے ہی 14 اگست کے اُس کالم کو زندگی دے دی۔ (واہ آصف کیا غضب کی آواز ہے آپ کی) اور جب کالم پیش کیا جارہا تھا کہ فاطمہ ثریا بجیا کی آمد ہوئی۔

تمام حاضرین بجیا جیسی قد آور شخصیت کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہوگئے اور پھر سیما نے آصف الیاس کا کالم سننے کے بعد فرزانہ آغا صاحبہ کو دعوت دی کہ وہ اپنے اور دوشیزہ کے ساتھ استوار رشتے پر کچھ خیالات کا اظہار کریں۔ فرزانہ نے دوشیزہ سے اپنی محبتوں کے اظہار میں کہا:

''دوشیزہ کی یہ جیتی جاگتی محفل، جس سے ہمارا برسوں کا تعلق ہے۔ آج اس میں یہاں ہونا اور نو برس کے بعد ہونا میرے لیے اتنا ہی اعزاز ہے جتنا جب میں یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی اور جو میرے محسوسات تھے۔ دوشیزہ اور اپنے حوالے سے اگر کچھ سوچتی ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ اوائل عمری سے مجھے اعلیٰ ترین دماغوں کا ساتھ نصیب ہوا اور کوتاہ عقلی یہ رہی کہ مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا۔ میں جانتی ہوں کہ دخل کم عمری کا بھی تھا پر زیادہ دخل کوتاہ عقلی کا ہی ثابت ہوگا

کہ وہ سب کندن ذہن، سب کے سب بے انتہا عاجز، مشفق، وسیع القلب جوہر شناس تھے، ایسے کہ 'انا' کی خود فریبی میں مبتلا نہ تھے۔ سہام مرزا انہی قد آور شخصیات میں سے ایک تھے۔

''سہام مرزا ایک شخصیت...... ایک عہد کا نام یا پھر یہ ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے۔ میرے خیال میں بہت سے گزرے برس ایک واضح رائے دے چکے ہیں۔ اس دنیا میں حاصلِ زندگی تو یہ رہا کہ ایک مخلص، بے لوث انسان دنیا میں رہے نا رہے وہ تب بھی آپ کے آس پاس ہی ہوتا ہے۔ کبھی آپ کے عملِ خیر کی صورت اور کبھی کسی دعائے خیر کی صورت۔ میرے تعارف میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سبزہ زاروں کے شہر سے آئی ہے۔ اب سبزہ زار سے ساگر کنارے پہنچنے کا ایک علیحدہ قصہ ہے۔ وہ کچھ ایسے کہ میرے والد محترم خورشید انور جیلانی راولپنڈی کی بڑی مشہور ادبی شخصیت تھے اور ان کی مفارقت کے بعد بھی ان کی شہرت کا ڈنکا شہر میں بجتا تھا۔ جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں کوئی میرے خاندانی پس منظر کے طفیل مجھے کوئی طفیلی قسم کی شاباشی نہ دے دے۔ تو میں اپنی کھوج کے لیے یا اپنی پرکھ کی کھوج کے لیے رخسانہ اور سہام مرزا تک پہنچی کہ کہیں دور کام کیا جائے، اجنبی لوگوں میں کام کیا جائے تو پتا چلے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے پہلا افسانہ 'جوگ' لکھا وہی ایوارڈ یافتہ قرار پایا۔ اُس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ افسانہ کہانی بھی بنا، افسانہ انشائیہ بھی بنا اور مضامین سے ہوتا ہوا ناول نگاری تک پہنچا۔ اس تیس سال سے زائد کے سفر میں رُخسانہ، منزہ، ادارے کے تمام لوگ، میرے ریڈرز اور میرے تمام کولیگز، سب کا تعاون اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید آج میں یہاں نہ ہوتی۔ دوشیزہ کی سرپرستی میں لاتعداد نو آموز رائٹرز کو ایک پلیٹ فارم فراہم ہوا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ جو بڑی مختلف سی بات ہے اور بہر حال یہ ابھی تک جاری و ساری ہے۔ لیکن اس پینل پر ایک مزید کریڈٹ ہے ہم تمام رائٹرز کے لیے کہ یہاں سے لاتعداد مخلص لوگوں کا ہمیں ساتھ ملا۔ میرے دوستوں کا سب سے وسیع سرکل کراچی میں ہے اور بہت پہلے کی بات ہے جب میں نے رخسانہ سے یہ کہا تھا۔

''میری پڑوسن ملی تو میں نے اس سے کہا کہ میں کراچی جا رہی ہوں۔ تو میرے چہرے پر اتنی بشاشت تھی کہ وہ کہنے لگی۔ آپ کا میکہ ہے کراچی میں۔ تو میں نے کہا کہ یہی سمجھیں کہ میرا میکہ ہے۔

یہ بات میں نے سب سے شیئر بھی کی اور اس کے بعد ہم خواتین میں ٹرم چل نکلی کہ یہ ہمارا میکہ ہے۔ تو بس اللہ پاک رخسانہ کو، منزہ کو سلامت رکھے کہ ان کے اعزاز میں ہم سب یہاں آتے ہیں۔ ہم تمام رائٹرز ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں اور ہم سب قلبی اور روحانی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ اس کی مثال میں ذاتی دوں گی۔

میرے بیٹے کو ساڑھے سات سال پہلے ایک حادثہ پیش آ گیا اور اُس پہلے دن سے لے کر آج تک سب اُسی طرح میرے ساتھ ہیں۔ میں آج اُن سب کا شکریہ ادا کرنے بھی یہاں آئی ہوں۔ اللہ پاک نے کرم کیا اور وہ اتنے بہتر ہیں کہ آج میرے ہم سفر بنے ہیں۔

میرے استادِ محترم اشفاق احمد، جب خط کا اختتام کیا کرتے تھے تو وہ ایک سطری جملہ علیحدہ سے لکھتے تھے۔ اور اس میں لکھا ہوتا تھا۔

''فرزانہ میں تم سے راضی ہوں۔''

آپ سب کی محبت اور اس عزت افزائی کا جو 35 سال یا اس سے زیادہ عرصے سے ہے۔ یقین

سید شاہد حسن صاحب

زیرِ موضوع کتاب اُجلے حروف منزہ سہام کی عظمت و ہمت کی گواہی دے رہی ہے۔

میرے لیے باعث فخر ہے کہ منزہ سہام نے کالم نگاری کے میدان میں جب قدم رکھا تو پہلا کالم مجھے ہی دیا۔ پھر کیا تھا۔ منزہ نے قلم اٹھایا اور لکھتی ہی چلی گئیں۔

ما ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میرے پاس میرے استادِ محترم کا یہی جملہ ہے کہ رخسانہ میں آپ سے، منزہ سے، ادارے میں، میرے ریڈرز، میرے رائٹرز، میں آپ سب سے راضی ہوں اور اللہ پاک آپ کو مجھ سے راضی رکھے۔"

فرزانہ آغا یہ کہہ کر اسٹیج سے اُتریں اور پھر سیما رضا نے فیصل آباد سے آنے والی ہماری سینئر لکھاری فرحت صدیقی کو اظہارِ خیال کے لیے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، فرحت اسٹیج پر آ چکی تھیں۔ فرحت نے پہلے اپنی نظم بعنوان "آج کی شام کے نام" سنائی۔ (آپ کو نظم فرحت کے تاثرات میں پڑھنے کو مل جائے گی) "یہ نظم میں نے سہام مرزا کے نام لکھی ہے جن کی چاہت، جن کی شفقت میں مجھے باپ کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میرے والد کے انتقال کے بعد سہام مرزا صاحب نے میرا بہت خیال رکھا اور آج جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو مجھے ان کی محبت رخسانہ میں نظر آئی، منزہ میں نظر آتی ہے۔ آپ سب کو میری جانب سے ایوارڈ کی اس تقریب کی بہت بہت مبارکباد، شکریہ۔"

فرحت یہ کہہ کر اسٹیج سے نیچے آ گئیں اور اس کے بعد سیما جی نے ہماری ایک بہت اچھی رائٹر، جو ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ دوشیزہ کی سابق مدیر بھی ہیں، بطورِ خاص انگلینڈ سے تشریف لائی ہیں۔ رضوانہ پرنس صاحبہ کو اظہارِ خیال کے لیے مدعو کیا۔ اب رضوانہ جی روسٹرم پر موجود تھیں۔

"سب سے پہلے تو رخسانہ جی اور منزہ کو مبارکباد اتنی خوبصورت تقریب کے لیے۔ اور کتنے پیارے پیارے خوبصورت جگمگاتے چہرے یہاں پر موجود ہیں۔ ہم کل ہی لندن سے واپس آئے ہیں اور صرف اور صرف منزہ کی وجہ اور رخسانہ کی وجہ سے۔ ہمیں اس تقریب میں آنا تھا اور ہم اس تقریب کو زندگی میں کبھی مس کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بھلے سے کوئی بڑی سے بڑی تقریب ہوتی۔ مگر ہمیں اس تقریب میں آنا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں ہمیں ایوارڈ بھی ملنا تھا۔ (پورا ہال مسکرا اٹھا، رضوانہ کی خوشی پر) اصل میں منزہ ہمیں عزیز بھی بہت ہیں۔ منزہ اور ہم میں ذہنی ہم آہنگی بھی بہت ہے اور ہم ایک دوسرے کے پکے دوست ہیں۔ منزہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ کڑے سے کڑے حالات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور رخسانہ جی کو بہت سی خوشیاں دکھائے اور ایسی بہت سی تقریبات ہم لوگ دیکھتے رہیں۔ یہ تقریب 27 ویں ہے انشاء اللہ 127 ویں بھی ہوگی۔ اس میں منزہ تو نہیں ہوں گی۔ مگر بہر حال کافی لوگ ہوں گے۔ (ہال پھر سے زعفران زار ہو گیا تھا) او کے تھینک یو سو مچ۔"

یہ کہہ کر رضوانہ مسکراتے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتر گئیں اور سیما رضا ردا نے مائیک سنبھالا اور بولیں "رضوانہ صاحبہ اللہ کرے 127 ویں تقریب بھی ہو مگر ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی ہوں۔ آپ نے منزہ کو اچھا کیا کہ کہا کہ آپ نہیں ہوں گی۔ مگر ہمارے بارے میں تو سوچتیں۔ آپ کس طرح آ رہی ہوں گی۔ میں کس طرح سے آ رہی ہوں گی۔ سوچیں 127 سال میں ہمارا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ بھوت بن کر آ رہے ہوں گے ہم سب۔ (ہال میں شوخیوں کی تتلیاں منڈلا رہی تھیں)

اب سیما رضا نے جس رائٹر کو یہاں پر آنے کی دعوت دی وہ کراچی سے لاہور جا کر بس گئی ہیں۔ سب کی محبتوں میں دلشاد نسیم صاحبہ اسٹیج پر آ گئیں۔ دلشاد کی دراز زلفوں پر سیما نے فی البدیہہ کہا کہ جتنے لمبے ان کے بال ہیں اتنی زیادہ تالیوں کا تو میں نے نہیں کہا۔

دلشاد نسیم کے لیے قطعی غیر متوقع تھا یہ موقع مگر آپ آئیں اور اپنے اور دوشیزہ کے مابین رشتے کو کچھ یوں بیان کیا۔

"یہ میرے لیے بالکل غیر متوقع ہے یہاں آ کر کچھ بولنا۔ میرے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے، کوئی کاپی نہیں ہے، میں کچھ بھی نہیں لکھ سکی جو بھی کہوں گی بہت محبت سے فی البدیہہ کہوں گی۔ سب سے پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ لکھنے کا سلسلہ تو میرا بہت پرانا ہے جیسے کہ فرزانہ آغا صاحبہ نے کہا۔ 1978ء یا 1979ء سے لکھ رہی ہوں۔ 1980ء کی دہائی کے آخر کی بات ہے کہ میں نے اخبار میں دیکھا دوشیزہ ایوارڈ کی تقریب کی روداد آئی ہے۔ میں نے سوچا کہ کاش ایسا ہو کہ میں بھی کبھی اس جگہ پر کھڑی ہوں جہاں پر یہ رائٹرز کھڑی ہیں۔

اور پھر 1988ء کے اگست میں، میں نے کانچ کے آنسو کے نام سے ایک افسانہ دوشیزہ میں بھیجا۔ افسانہ شائع ہوا اور میرے اُس افسانے کو ایوارڈ مل گیا۔ اور جب میں اپنا ایوارڈ لینے کے لیے تقریب میں آئی تو اُس کی ایک الگ ہی کہانی تھی۔ بہت یادگار تقریب تھی۔

ایوارڈ پا کر میرے پیروں تلے زمین نہیں ٹک رہی تھی، لگ رہا تھا کہ میں ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں۔ اور آج بھی میں اتنی خوش ہوں کہ میں ایوارڈ بھی لے رہی ہوں، اس روسٹرم پر کھڑی ہوں جہاں پر کھڑا ہونا کبھی میرے خواب میں شامل تھا اور اب مہتاب صاحبہ میرے ساتھ ہیں۔ بجیا میرے سامنے ہیں اور پھر ان سب کے سامنے یہاں کھڑے ہو کر بولنا...... میں شاید اپنے جذبات بیان ہی نہیں کر سکتی۔

اسپیشلی میں کل رات ہی کراچی اس تقریب کے لیے پہنچی ہوں۔ کاشی مجھے لکھنے کے لیے ہر وقت فورس کرتا ہے اور ہر وقت پیچھے پڑا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے میں دوشیزہ میں بہت زیادہ لکھتی ہوں۔

کاشی تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے مجھے دوبارہ دوشیزہ میں اِن کر دیا۔"

شکریہ ادا کر کے دلشاد نسیم اسٹیج سے اُتریں تو سیما نے مائیک سنبھالتے ہی ایک خوبصورت شعر دلشاد جی کے گھنے اور دراز بالوں پر عطا کیا۔

زرا ان کی شوخی تو دیکھیے لیے خم شدہ میرے ہاتھ میں
میرے پیچھے آئے دبے دبے، مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

پھر سیما نے دبئی سے تشریف لانے والی تسنیم منیر علوی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی لیکن وہ کچھ پرابلم کی وجہ سے نہ آ پائیں۔

اب دعوت دی گئی خواتین کی محبوب قلم کار رفعت سراج صاحبہ کو (رفعت سراج، موصوف کی استادِ محترم بھی ہیں جناب) اب مائیک رفعت سراج کے ہاتھ میں تھا۔

"بہت عرصے بعد دوشیزہ کی تقریب میں شرکت اور آپ لوگوں سے ملاقات کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ تقریب بہرملاقات کا اہتمام کرنا آج کے زمانے میں، آج کے عہد میں، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ گھر سے نکلتے ہیں تو فون بجنا شروع ہو جاتے ہیں کہ مت نکلیے گا راستے میں یہ ہوگیا ہے، وہ ہوگیا ہے۔ تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے منزہ کی نیک نیتی کا بھرپور ساتھ دیا کہ ایسے وقت میں لوگ گھروں سے نکلے اور تقریب میں پہنچے اور آج ہم مدتوں بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔

ماشاء اللہ منزہ نے یہ سارا نظام سنبھالا اور بہت خوبصورتی سے سنبھالا ہوا ہے۔ مرحوم سہام مرزا کے لیے میں اپنے جذبات ایک جملے میں کہنا چاہوں گی کہ وہ ایک انسان دوست شخصیت تھے۔"

آپ یقین کیجیے کہ میرا اُن سے صرف سلام دعا کا تعلق تھا۔ میں نے اُن سے فون پر لمبی لمبی باتیں نہیں کیں۔ لیکن جب میرا بھائی بہت سیریس بیمار ہوا اور سہام مرزا مرحوم کو پتا چلا تو انہوں نے اپنی کہانیاں میں بابا صاحب، جو قرآنی آیات سے شفا کے طریقے بتاتے ہیں۔ اُن سے میری بات کروائی اور پھر مجھے خود فون کر کے کہا کہ رفعت بابا صاحب نے

فرزانہ آغا صاحبہ

میرے والد محترم خورشید انور جیلانی راولپنڈی کی بڑی مشہور ادبی شخصیت تھے اور ان کی مفارقت کے بعد بھی ان کی شہرت کا ڈنکا شہر میں بجتا تھا۔ جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں کوئی میرے خاندانی پس منظر کے طفیل مجھے کوئی طفیلی قسم کی شاباشی نہ دے دے۔ تو میں اپنی کھوج کے لیے یا اپنی پرکھ کی کھوج کے لیے رخسانہ اور سہام مرزا تک پہنچی کہ کہیں دور کام کیا جائے، اجنبی لوگوں میں کام کیا جائے تو پتا چلے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے پہلا افسانہ 'جوگ' لکھا وہی ایوارڈ یافتہ قرار پایا۔

میں نے دوشیزہ میں پہلی کہانی لکھی تو لکھا ہار، اور میری پہلی کہانی کو ہی ایوارڈ ملا تھا اور اُس تقریب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں مہمانِ خصوصی عصمت چغتائی تھیں اور میں نے اپنا پہلا ایوارڈ عصمت چغتائی کے ہاتھ سے لیا۔ اور وہ تقریب میری زندگی کی یادگار تقریب ہے۔ اُس وقت منزہ، تابندہ چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ یہ دونوں ہمیں انٹرنس پر ملیں۔ کٹ سلوز انہوں نے پہنے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ اتنی مگن تھیں کہ ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

بھائی کے لیے جو بارش کا پانی دم کر کے رکھا ہے وہ آ کر میرے آفس سے لے جانا۔"

تو میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ ایک قلم کار کے ساتھ صرف وہ یادیں نہیں ہیں جو قلم کی حد تک ہیں۔ اس ادارے کے جو بانی ہیں مرحوم سہام مرزا ان کے لیے جو میرے جذبات ہیں وہ آخری سانس تک ہیں۔ ڈاکومنٹیشن کارروائی جو میرے بھائی کی رُکی ہوئی تھی کیوں کہ اُن کا رائٹ ہینڈ پیرالائز ہوگیا تھا۔ تو وہ پانی میں نے ان کو استعمال کرایا، جو پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ وہ پڑھا تو وہ ایک ہفتے میں دستخط کرنے

کے قابل ہو گیا۔ تو میں ان کی دعائے مغفرت کے لیے، ایصالِ ثواب کے لیے جتنی دعائیں کروں کم ہیں۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

قلم ہمارا ذریعہ بن جاتا ہے، بہترین لوگوں سے ملاقاتوں کا اور اچھے انسانوں سے ملنے کا، یہ بھی قلم کی حرمت ہے۔ تیسری بات میں اپنی تمام ہم عصر، سینئر خواتین وحضرات سے کہوں گی کہ ایک تو قلم کا استعمال بہت ذمہ داری سے کیجیے، ہم لوگوں نے عادت سی بنالی ہے کہ بس ایک دوسرے پر تنقید کرنا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے اچھے اچھے کاموں میں عیب تلاش کر کے اُس کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

نئی نسل کو ہم لوگ بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ نئی نسل سے جو آپ کو شکایات ہیں۔ ان شکایات کے ذمہ دار ہم خود ہی تو ہیں۔ ایک ماں چار دیواری میں اپنے بچوں کی ذمے داری تو پوری کرے نا۔ اگر وہ پوری قوم کے لیے یا بڑے کینوس پر کام نہیں کر سکتی۔ دو تین یا چار بچے اگر اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ تو وہ اُن کی تو دیکھ بھال صحیح سے کرے۔ ان کو تو ٹھیک سے انسان بنانے کی کوشش کرے نا۔

نسلوں کا قصور نہیں ہوتا۔ ایک قول یہاں دہرایا بھی گیا جو مدتوں سے دہرایا بھی جاتا ہے کہ چرچل کہتا ہے تم مجھے بہترین مائیں دو تو میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔ تو قلم کار جو بھی کام کریں، ضروری نہیں کہ وہ مبلغ بن جائیں۔ مگر آپ کہانیوں کو اس رُخ سے پیش کر سکتے ہیں نیکی اور بدی کی جنگ میں، کسی کے اندر ایک ایسی تحریک بیدار کریں کہ نیک بننے کا یا نیک راستے پر چلنے کی اس کے اندر اُمنگ تو جاگے۔ اگر ادب کی حد تک یہ کام نہ ہو تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ پھر یہ گناہِ عظیم نہ کیا جائے، آپ جو بھی کام کریں، بہت ذمے داری سے کریں۔ قلم کا استعمال بہر طور خوب ذمہ داری سے ہونا چاہیے۔ سچ وہ نہیں جو دل آزاریوں کا سبب بن جائے۔ سچ بولنے کی بھی تمیز ہونی چاہیے۔ ایک منہ پھٹ ہونا ہوتا ہے اور ایک کلمۂ حق بلند کرنا ہوتا ہے۔ تو اس چیز کا فرق ہم لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ منہ پھٹ ہونا کیا ہے اور کلمۂ حق بلند کرنا کیا ہے۔"

یہ کہہ کر ہماری بہت خوبصورت رائٹر رفعت سراج شکریہ ادا کر کے اسٹیج سے اتریں۔ اب سیما رضا نے ہمارے مہمانِ خصوصی کو روسٹرم پر آنے کی دعوت دی پہلے ان ہی کا ایک شعر نذرِ سامعین کیا۔

آنکھ رکھتا تھا کھلی اور طبیعت موزوں
تجربے دوسرے کرتے تھے سنورتا میں تھا
"محمود شام"

پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور اسی گونج میں محمود شام نے روسٹرم سنبھال لیا۔ شام صاحب نے جو کچھ عرض کیا وہ تفصیل سے اگلے صفحات پر موجود ہے۔ یہاں پر ہم آپ کے لیے صرف کچھ باتیں لکھ رہے ہیں۔

"ابھی میں کینیڈا میں تھا تو وہاں بھی منزہ سہام مرزا کے بارے میں ایک بہت اچھا جملہ تھا۔ Very Big Soul In A Very Very Young Body۔ کالم نگاری کے بارے میں جب سنا تو اُس میں نظر آتا ہے کہ ایک بہت ہی سنجیدہ، عمر رسیدہ شخصیت ہمیں بہت سی نصیحتیں کر رہی ہے اور سیما رضا صاحبہ جو آپ کو تالیوں کی تربیت دے رہی ہیں۔ حالانکہ ہماری قوم کو تالیاں بجانے کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا۔ میں یہاں صرف ایک سامع کی حیثیت سے آیا تھا مگر......"

"جب سے دوشیزہ کے یہ ایوارڈ شروع ہوئے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میں نے شرکت کی تھی۔ آپ لوگ جو مصنفین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اُسی سے متاثر ہو کر ہم نے بھی اپنا ایک ماہنامہ "ٹوٹ بٹوٹ"

رفعت سراج صاحبہ

میں نے دوشیزہ میں پہلی کہانی لکھی نولکھا ہار، اور میری پہلی کہانی کو ہی ایوارڈ ملا تھا
اور اُس تقریب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں مہمانِ خصوصی عصمت
چغتائی تھیں اور میں نے اپنا پہلا ایوارڈ عصمت چغتائی کے ہاتھ سے لیا۔

بچوں کے لیے نکالا تھا۔ اور آپ کے بعد ہم نے بھی اُن بچوں کے لیے ایوارڈز کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ دوشیزہ سے ہی ہم Inspire ہوئے تھے۔ کئی سال وہ سلسلہ چلا۔''

اس کے بعد شام صاحب نے اپنی تخلیق ''بیٹیاں پھول ہیں'' نذرِ سامعین کی اور پھر عرض گزار ہوئے۔

''آج آپ کو بھی دلی مبارک باد اور جو بھی دوشیزائیں یہاں پر ایوارڈ حاصل کریں گی ان کو بھی دلی مبارکباد۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں سے ہم بہت مطمئن، پُراُمید بلکہ ایک یقین کی قوت لے کر واپس جائیں گے اور یہ یقین ہوگا کہ پاکستان آگے بڑھ رہا ہے اور پاکستان ایک قوم بن رہا ہے۔''

یہ اُمید لے کر محمود شام صاحب واپس اپنی نشست پر آگئے اور سیما نے صدرِ مجلس، مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کو بہت عقیدت اور محبت کے ساتھ اسٹیج پر آ کر اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت اس قطعے کے ساتھ دی۔

کھلا کھلا ہو یہ جہاں دھلا دھلا سماج ہو
تری زمیں پہ اے خدا محبتوں کا راج ہو
وہ دے جواب اس طرح، کھلے گلاب جس طرح
مخاطب اپنے پیار کا بڑا ہی دلنواز ہو

اب مہتاب اکبر راشدی صاحبہ نے مائیک سنبھالا۔

''محترمہ فاطمہ ثریا بجیا صاحبہ، محمود شام صاحب، رخسانہ سہام مرزا صاحبہ، شاہد حسن صاحب، میری بہت ہی پیاری منزہ اور بہت ہی قابلِ احترام خواتین وحضرات جو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

یہ محفل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہماری آنکھوں سے اُتر کر دل میں بسی ہے۔ سالوں سے بسی ہوئی ہے، ہم اس کا حصہ رہے ہیں۔ گاہے بگاہے آتے رہے ہیں۔ مجھے دو چیزوں پر گفتگو کرنی ہے۔ ایک تو بذاتِ خود دوشیزہ، اس کے دیے جانے والے ایوارڈز اور دوسری وہ دوشیزہ اب جس کے ہاتھ میں دوشیزہ کی تقدیر ہے۔ یہاں پر منزہ کی بہت باتیں ہو رہی ہیں پتا نہیں لوگ ان کو کتنا جانتے ہیں۔ لیکن یہ شاید اُن کچھ لوگوں میں سے ایک ہیں جو پتا نہیں کیا کرتی ہیں۔ حکم کرتی ہیں کہ میں کہہ دیتی 'ہاں'۔

''آپ کو آنا ہے۔'' تو میں کہتی ہوں 'جی ہاں' جب منزہ کا فون آیا تو میں نیویارک میں تھی۔ تو منزہ نے کہا کہ ایوارڈ تقریب میں آپ نے آنا ہے۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ کبھی میں نے 'نا' بولا ہے۔ میں ضرور آؤں گی۔ مجھے نہیں پتا تھا تاریخ کون سی ہے۔ بس مجھے یہ پتا تھا کہ مجھے یہاں جانا ہے۔

پچھلا جو دوشیزہ کا ایوارڈ کا فنکشن ہوا تھا۔ اُس میں منزہ وہاں نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور میں حیران تھی کہ یہ نیچے بیٹھی ہے اور یہ بڑے سکون سے بیٹھی تھی۔ اس کے اندر کتنا طلاطم تھا وہ کسی کو محسوس نہیں

ہوا لیکن آج جب وہ اوپر بیٹھی ہے تو لگتا ہے کہ ہر چیز کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ That Is The Woman Of Pakistan پاکستان کی عورت اتنی ہی حوصلہ مند ہے۔ جب یہاں پر ہم پرانے محاورے دہراتے ہیں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مردانہ وار نکل آئی...... کیا مطلب زنانہ وار بھی نکل کر آ سکتے ہیں۔ اب بدل دیجیے یہ محاورے۔ اُس وقت یہ اُن مردوں نے لکھے تھے جب اُن کو مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔ اب عورتیں اپنی چیزوں کو سمجھتی ہیں۔ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

اور منزہ آپ کی کتاب سامنے رکھی ہے، اس کی بھی رونمائی ہے۔ اس میں سے جو کالم پڑھے گئے بہت جاندار تھے اور ایک مثبت پیغام دیتے ہیں۔ آپ کو بہت مبارک باد۔ ہم آپ کی ایسی اور بہت سی تحریروں کے منتظر رہیں گے۔ میری عزت افزائی کے لیے بھی بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس تقریب کے لیے منتخب کیا اور یہاں پر جو ایک سنہرا ہاتھ، سنہرے قلم کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ یہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ بہت بہت شکریہ۔''

یہ کہہ کر صدرِ مجلس مہتاب اکبر راشدی صاحبہ اپنی نشست پر بیٹھ گئیں۔

ایوارڈ کے دوران ہماری سینئر اور لازوال لکھاری دردانہ نوشین خان جو کہ اُسی دن مظفر گڑھ سے کراچی پہنچی تھیں نے جو خطاب کیا۔ وہ آپ کی بصارتوں کی نذر۔

''بہت سی باتیں ہو چکی ہیں اور بہت سے جذبات میرے دل میں بھی مچل رہے ہیں۔ دوشیزہ کے ساتھ اُس وقت سے ہوں جب دوشیزہ تھی۔ ایک بات جو بہت کہی جا چکی ہے کہ دوشیزہ ہمارا میکہ ہے تو میں اُس سے بھی بڑھ کر کچھ کہوں گی۔ وہ ایک بہت مشہور سی لائن ہے۔

''تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔''

دوشیزہ کے پاس میں اتنی پروازیں کینسل کرنے کے بعد، اتنا گشت کاٹ کر یہاں آئی ہوں تو اُس پر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا گھر ہے۔ دوشیزہ کے ساتھ میرا عشق ہی تھا جو مجھ کو یہاں پر لایا ہے۔''

رضیہ مہدی نے بھی اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا۔

''منزہ کی میں اتنی تعریفیں سنتی رہی ہوں کہ سب کہہ رہے ہیں کہ یہ میریکل کیسے کیا۔ سہام صاحب جیسی قدر آور شخصیت کے سامنے ایک ایسی لڑکی جو ابھی بچی ہی تھی تو اس نے ایسے میں اتنی ذمہ داریاں کیسے سنبھال لیں تو میں جاوید اختر کا ایک مصرعہ پڑھنا چاہوں گی۔

شہر کے دکانداروں ، کاروبار الفت میں
سود کیا زیاں کیا ہے' تم نہ جان پاؤ گے

جو لوگ زندگی کے پُل صراط کی بہت باریک سی تار سے آسانی سے گزرتے ہیں۔ غم ہو یا خوشی ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے، تو دراصل وہ کاروبار الفت کے رموز بجھ چکے ہوتے ہیں۔ منزہ کاروبارِ الفت کے رموز جانتی ہیں اور انہیں اچھی طرح پہچانتی ہیں۔ نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے۔ بہت شکریہ۔''

ساتھیو! سیما رضا ردا صاحبہ نے تقریب کا پہلا حصہ بہ حسن خوبی انجام تک پہنچایا اور پھر مجھے دوسرے حصے کے آغاز کے لیے اسٹیج پر بلا لیا۔

اب روسٹرم پر میں تھا اور میرے سامنے میرے لکھاری ساتھیوں کا سونامی! آپ کی دلچسپی کے لیے من وعن رودادِ تقسیم ایوارڈ پیش ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

بہت شکریہ سیما صاحبہ! سب سے پہلے تو میں نے منزہ سہام صاحبہ، صدرِ مجلس مہتاب اکبر راشدی صاحبہ' مہمان خصوصی محمود شام صاحب قابلِ قدر اسپیکرز اور معزز مہمانانِ گرامی حضرات کو پرل پبلی

گیشنز کی جانب سے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈز کی 27 ویں تقریب میں ایک بار پھر خوش آمدید کہا۔
اب ہم نے شروع کیا ایوارڈز کی تقسیم کا سلسلہ جس کا سب کو بے چینی سے انتظار ہے۔
سب سے پہلے میں نے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی شہناز انور شفا صاحبہ کو۔ فروری 2010ء کے افسانے سحر ہونے تک اور نومبر 2011ء کے ناولٹ آنگن میں تمھو ہر پر شہناز انور شفا صاحبہ (کراچی) نے ایوارڈ حاصل کیا۔ معاشرے کی حساس عکاسی پر آپ کو کمال حاصل ہے۔
اب ایوارڈز وصول کرنے کے لیے آئیں سنبل صاحبہ (کراچی)۔ سنبل نے مئی 2010ء کے افسانے تعمیر جنت اور جولائی 2013ء کے افسانے ڈول ہاؤس پر ایوارڈ حاصل کیا۔
جب سنبل صفحہ قرطاس پر اپنا جادو جگاتی ہیں تو ایک شاہکار تخلیق پا جاتا ہے۔ سنبل کا قلم اس وقت عروج پر ہے۔ سوچ کو نئے راستوں پر ڈالتا ہر افسانہ دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سنبل اپنی اس کامیابی کا کریڈیٹ دوشیزہ ہی کو دیتی ہیں۔
اگلے ایوارڈ کے لیے زحمت دی گئی محمد تقی صاحب (کراچی) کو، جو دوشیزہ کے اولین لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تحریر کی سلاست اور روانی آج بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے۔ محمد تقی نے اکتوبر 2012ء میں شائع ہونے والے اپنے افسانے اپائنٹمنٹ پر ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ تقی بھائی کے لیے ایک شعر۔

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا محبت ہے
نئی لغت کے مطابق یہی محبت ہے

اب ایوارڈ کے لیے جس مصنفہ کو دعوت دی گئی وہ تھیں دردانہ نوشین خان۔ مظفر گڑھ سے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں آنے والی ہماری یہ مصنفہ 80ء کی دہائی سے ہمارے ساتھ ہیں۔ دوشیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں اور ناول نے دردانہ نوشین خان کی شہرت دو چند کردی۔ کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈز حاصل کرنے والی دردانہ کو یہ ایوارڈ ان کی جولائی 2011ء میں ذواضعاف اقل اور مارچ 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر حاصل ضرب پر دیا گیا۔
اپریل 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر فیصلہ پر ایوارڈ حاصل کرنے آئیں تمثیلہ زاہد۔ تمثیلہ زاہد کا تعلق کراچی سے ہے۔ آپ نے اپنا پہلا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ وصول کیا۔ نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی سہام مرزا صاحب کے دور سے دوشیزہ کی روایت رہی ہے اور آج کا دن یہ بات ثابت کر رہا تھا

رضوانہ پرنس صاحبہ

ہم کل ہی لندن سے واپس آئے ہیں اور صرف منزہ کی وجہ اور رخسانہ کی وجہ سے ہمیں اس تقریب میں آنا تھا اور ہم اس تقریب کو زندگی میں کبھی مس کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بھلے سے کوئی بڑی سے بڑی تقریب ہوتی۔ مگر ہمیں اس تقریب میں آنا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں ہمیں ایوارڈ بھی ملنا تھا۔

کہ ہم نے سہام مرزا کی روایت کو قائم رکھا ہے۔

اب میں نے جس شخصیت کو ایوارڈز حاصل کرنے کے لیے بلایا وہ تھیں رضوانہ پرنس۔ رضوانہ ایک باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ لندن سے بطورِ خاص اپنا ایوارڈ وصول کرنے آئیں۔ یہ محبت خدا قائم رکھے (آمین) رضوانہ جی کی نذر ایک تحفہ تھی۔

تمہارے شہر کی گلیوں میں سیلِ رنگ بخیر
تمہارے نقشِ قدم پھول پھول کھلتے رہیں
وہ رہگزر جہاں تم لمحہ بھر ٹھہرتے چلو
وہاں پہ ابر جھکیں، آسمان ملتے رہیں

اس کے بعد فروری 2011ء میں شائع ہونے والی تحریر سمجھوتا اور دسمبر 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر قیمت پر اپنا ایوارڈ وصول کیا عقیلہ حق (کراچی) نے۔ یہ وہ نام ہے جس نے دوشیزہ میں اپنی تحریروں کا جادو جگانا شروع کیا تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے ''اثاثۂ محبت بس اتنا'' تک پہنچ گئیں اور ان دنوں آئینہ، عکس اور سمندر کی صورت دوشیزہ میں عقیلہ کا پہلا ناول بھی دھوم مچا رہا ہے۔ سادگی سے اپنی بات کہنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔

اب میں نے دعوت دی غزالہ عزیز صاحبہ (کراچی) کو۔ جنہوں نے جون 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر ''سمجھوتے زندگی کے'' پر ایوارڈ حاصل کیا۔ غزالہ عزیز صاحبہ کا یہ پہلا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تھا۔

جنوری 2011ء میں شائع ہونے والی تحریر تمہارے بعد پر ایوارڈ وصول کرنے آئیں ناہید فاطمہ حسنین صاحبہ (کراچی)۔ بات کہنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ ناہید کا بھی یہ پہلا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تھا۔

دوستو! اب میں نے جس مصنفہ کو ایوارڈز وصول کرنے کے لیے بلایا، وہ تھیں تسنیم منیر علوی۔ آپ بطورِ خاص دبئی سے اپنا ایوارڈ وصول کرنے کراچی آئی تھیں۔ تسنیم منیر علوی کی تحریر کی خاص خوبی اُن کا سہل اور سلیس اندازِ بیاں ہے۔ تحریر کی روانی خوب ہے۔ تسنیم منیر علوی صاحبہ نے یہ پہلا ایوارڈ اپنی جون 2011ء میں شائع ہونے والی تحریر بونسائی پلانٹ پر حاصل کیا۔

اب ایوارڈ وصول کرنے کے لیے زحمت دی گئی صفحۂ قرطاس پر لفظوں کے موتی بکھیرنے والی فرزانہ آغا صاحبہ کو۔ آپ کا تعلق سبزہ زاروں کے شہر اسلام آباد سے ہے۔ فرزانہ آغا نے دوشیزہ کے علاوہ کسی میگزین میں نہیں لکھا۔ تحریر کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ فرزانہ کی تحریر جادو اثر رکھتی ہے اور اُس دور کی یاد تازہ کر دیتی ہے، جب بیمار کو قصہ سننے سے شفا حاصل ہونے کی نوید دی جاتی تھی۔ نومبر 2010ء کی تحریر دور کا مسافر، ستمبر 2011ء کی تحریر میں تڑ کے گھڑے دا پانی اور فروری 2013ء کی تحریر بخت گھڑے دا پر آپ نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔

اب اپنا ایوارڈ وصول کیا سکینہ فرخ صاحبہ (کراچی) نے۔ اپریل 2010ء کی تحریر مہلت کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ کشمیری مائی صغراں کا نیلا دھنیا ہمیں آج بھی یاد ہے۔

اب ایوارڈ وصول کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہماری پرفیکٹ روحیلہ خان صاحبہ (کراچی) کو۔ ارے دوستو! پرفیکٹ روحیلہ خان کی اس تحریر کا نام ہے جو اگست 2010ء میں شائع ہو کر ایوارڈ کی حق دار ٹھہری تھی۔ روحیلہ خان کا ایوارڈ اُن کے ننھے بھانجے نے وصول کیا۔

رضیہ مہدی صاحبہ (کراچی) کو اکتوبر 2010ء میں شائع ہونے والی تحریر ''عادل اور میں'' پر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ رضیہ جی پچھلے دنوں بہت زیادہ بیمار رہی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رضیہ مہدی آج ہمارے درمیان موجود تھیں اور آپ نے ہم سب کی دعاؤں کے حصار میں اپنا ایوارڈ وصول کیا۔

ایوارڈ وصول کرنے کے لیے اب دعوت دی گئی فرح اسلم قریشی صاحبہ (کراچی) کو۔ فرح اسلم قریشی بھی دوشیزہ کے علاوہ کہیں نہیں لکھتیں۔ ان کے لیے پہلی اور آخری ترجیح دوشیزہ ہے۔ فرح اسلم قریشی صاحبہ کو ستمبر 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر "الارم" پر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔
اب ساہیوال سے تشریف لانے والی ہماری سینئر ساتھی نیئر شفقت صاحبہ کو ایوارڈ کے لیے پکارا گیا۔ مارچ 2011ء میں سراب اور جون 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر "ٹی سیٹ" پر نیئر شفقت کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ نیئر شفقت کے قلم کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ نیئر کی تحریریں معاشرے کی خوب عکاسی کرتی ہیں۔
اب ایوارڈ وصول کرنے کے لیے آئیں سائرہ

صدیقی کا شمار بھی دوشیزہ کی اولین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ایوارڈ تقریب کے لیے ہمیشہ فرحت اپنا وقت نکال کر رسم تجدید وفا کو نبھاتی آئی ہیں۔
اب ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے تشریف لائیں مینا تاج (کراچی)۔ جولائی 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "کھٹیا" پر آپ کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ مینا تاج کا شمار بھی نئے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ مینا کا یہ پہلا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تھا۔
خصوصی طور لاہور سے تقریب میں شریک مصنفہ زرافشاں فرحین صاحبہ نے اب ایوارڈ وصول کیا۔ اپریل 2012ء میں شائع ہونے والے افسانے رازِ حیات کے لیے آپ کی نامزدگی تھی۔ زرافشاں کی تحریر کی خوبی اُس کا سادہ اور فطری ہونا ہے۔

دلشاد نسیم صاحبہ

پہلا ایوارڈ پا کر میرے پیروں تلے زمین نہیں ٹک رہی تھی، لگ رہا تھا کہ میں ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں۔ اور آج بھی میں اتنی خوش ہوں کہ میں ایوارڈ بھی لے رہی ہوں اس روسٹرم پر کھڑی ہوں جہاں پر کھڑا ہونا کبھی میرے خواب میں شامل تھا اور اب مہتاب صاحبہ میرے ساتھ ہیں۔ بجیا میرے سامنے ہیں اور پھر ان سب کے سامنے یہاں کھڑے ہو کر بولنا...... میں شاید اپنے جذبات بیان ہی نہیں کر سکتی۔

غلام نبی صاحبہ (کراچی)۔ سائرہ ادبی دنیا کی جانی مانی شخصیت ہیں۔ انہیں ستمبر 2012ء میں شائع ہونے والے افسانے "لاحاصلی کا حاصل" پر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ سائرہ کا یہ پہلا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تھا۔
اب اسٹیج پر آئیں فیصل آباد سے آئی ہوئی ہماری دوست لکھاری فرحت صدیقی صاحبہ۔ مارچ 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "ریت کا گھر" پر آپ کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ فرحت

زندہ دلانِ لاہور سے تشریف لانے والی ہماری ہر دلعزیز مصنفہ دلشاد نسیم صاحبہ کو پکارا گیا۔ دلشاد نسیم دوشیزہ کے ساتھ تین دہائیوں سے ہیں۔ کمال لکھتی ہیں، ہماری خوش نصیبی ہے کہ لاہور سے خصوصی طور پر تشریف لائی ہیں۔ ستمبر 2010ء کی تحریر "ایسی چوری" پر دلشاد نسیم کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا۔ دلشاد کے لیے ہماری دعا ہے کہ اُن کے قلم کی بہار کو خدا سلامت رکھے (آمین)

ایک شعر دلشاد نسیم کے لیے:

مرا کمال ہی سب کچھ نہیں مرے فن میں
مرا خلوص بھی شامل مرے ہنر میں ہے

اب دعوت دی گئی ایوارڈ وصول کرنے کے لیے ایڈیسن ادریس مسیح صاحب (کراچی) کو۔ ایڈیسن کے قلم کی کاٹ سے دوشیزہ قارئین بخوبی واقف ہیں۔ موصوف کے موضوعات اتنے حساس ہوتے ہیں کہ معاشرہ آئینہ دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ایڈیسن صرف دوشیزہ کے لیے لکھتے ہیں یا پھر اگر اب لکھتے ہیں تو وہ ڈرامہ بن کر آن ایئر چلا جاتا ہے۔

اسکرپٹ رائٹر کہانی کار سب کچھ ہیں اور مزے کی بات ہے ہر جگہ مکمل، پرفیکٹ۔ سیما رضا ردا صاحبہ نے اپریل 2011 میں شائع ہونے والی تحریر زارا میری سہیلی اور اگست 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "نوری کا چاند" پر ایوارڈ حاصل کیا۔

خوشبو جیسے لوگ ملے افسانے میں
ایک پرانا خط کھولا انجانے میں
شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں

دردانہ نوشین خان صاحبہ

دوشیزہ کے ساتھ اُس وقت سے ہوں جب دوشیزہ تھی۔ ایک بات جو بہت کہی جاچکی ہے کہ دوشیزہ ہمارا میکہ تھا تو میں اُس سے بھی بڑھ کر کچھ کہوں گی۔ وہ ایک بہت مشہور سی لائن ہے۔ تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔

چاند آدھا ہے......

(اچانک میرا کہنا تھا کہ تقریب پر سناٹا چھا گیا۔ ارے بھائی یہ نام ہے افسانے کا) نسیم آمنہ صاحبہ (کراچی) اپنے اس افسانے پر ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے تشریف لے آئیں۔ دوشیزہ کے ساتھ آپ کا تعلق ابتدائی دنوں سے ہے۔ کمال لکھتی ہیں کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ حاصل کرنے والی نسیم آمنہ کی نومبر 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر چاند آدھا ہے کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اب میں نے ایوارڈ وصول کرنے کے لیے بلایا سیما رضا ردا صاحبہ (کراچی) کو۔ سیماجی کے بارے میں کیا کہوں۔ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ایک ہی وقت میں ڈائریکٹر' پروڈیوسر' ایڈمنسٹریٹر' شاعرہ'

چاند نے کتنی دیر لگادی آنے میں

واقعی میں ہم نے بہت دیر لگادی آپ کو بلانے میں۔ دوستو! اب میں نے ایوارڈ وصول کرنے کے لیے بلایا ہماری لاہور سے آنے والی مصنفہ بشریٰ سعید احمد صاحبہ کو۔ عام بات کو اپنے انداز سے بہت خاص کر دینا بشریٰ کی تحریر کا خاصا ہے۔ قلم کا کمال ہے۔ مئی 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "بونا" اور اکتوبر 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر "بختاں والی" پر بشریٰ سعید احمد ایوارڈ کی حقدار قرار پائیں۔

ہم فقیروں سے دعاؤں کا کہا ہی نہ کرو
رد ہوئے تم تو ہمارا بھی یقیں جائے گا

اس شعر کے شاعر اور ہمارے لکھاری ساتھی علی زبیر (کراچی) کو اب ایوارڈ وصول کرنے کے لیے زحمت دی گئی۔ تحریر میں بلا کے اُجلے پن اور پختگی نے دوشیزہ میں بہت جلد انہیں نامور کر دیا۔ دسمبر

2013ء میں شائع ہونے والی تحریر "عورت" پر علی زبیر صاحب ایوارڈ کے حق دار قرار پائے۔

چکوال سے تعلق رکھنے والی نگہت سیما صاحبہ کا دوشیزہ کے اولین لکھاریوں میں شمار ہوتا ہے اور بے پایاں مصروفیات میں سے وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ بوجوہ مصروفیات ایوارڈ تقریب میں شامل نہ ہوسکیں۔ آپ کا ایوارڈ وصول کرنے کے لیے تشریف لائیں لاہور سے نسیم نیازی صاحبہ۔ نومبر 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "ست بھرائی" نے نگہت سیما کو ایوارڈ کا حقدار قرار دلوایا۔

اب ایوارڈ تھا ہماری راولپنڈی سے تعلق رکھنے والی رائٹر گل کا۔ گل کی تحریر کی سادگی پڑھنے والے کو مسحور کر کے محصور کر دیتی ہے۔ گل آج کل صاحب فراش ہیں۔ کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر گل باوجود کوشش کے بھی اس تقریب میں شریک نہ ہوسکیں۔ (گل کا ایوارڈ آپ کی بھانجی قرۃ العین نے ہمارے آفس سے وصول کرلیا ہے)۔ مارچ 2010ء کی تحریر "خودکشی" اور دسمبر 2012ء میں شائع ہونے والی تحریر "دو ٹکے کی عورت" پر گل ایوارڈ کی حقدار قرار پائیں۔

فاصلے ہیں بھی اور نہیں بھی' ناپا تولا کچھ بھی نہیں
لوگ بضد رہتے ہیں پھر بھی رشتوں کی پیمائش پر

دوستو! اب جس شخصیت کے ایوارڈ کا اعلان کیا گیا وہ تھیں شمیم فضل خالق۔ ہماری زندہ دل رائٹر خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والی شمیم فضل خالق کا تعلق دوشیزہ کے اولین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ شمیم صاحبہ کے بھائی میجر عاصم آپ کا ایوارڈ وصول کرنے کے لیے ہمارے پاس موجود تھے۔ میجر عاصم تشریف لے آئے اور جون 2010ء میں شائع ہونے والی تحریر "مشورہ خانم" پر شمیم فضل خالق کا ایوارڈ وصول کیا۔

اب ایک ایوارڈ کے لیے میں نے منزہ سہام مرزا صاحبہ سے گزارش کی کہ اُس ایوارڈ کو آپ اناؤنس کیجیے، یہ کہہ کر میں منزہ سہام کو روسٹرم پر بلا کر خود لکھاریوں کی صف میں جا کر کھڑا ہوگیا۔

منزہ سہام نے پکارا۔ "کاشی چوہان" جولائی 2010ء میں شائع ہونے والی تحریر "سایہ" اور جون 2013ء میں شائع ہونے والی تحریر "گھر کی راکھی" پر کاشی چوہان ایوارڈ کے حقدار قرار پائے۔ "اپنا ایوارڈ وصول کیا اور پھر مابدولت دوبارہ روسٹرم پر موجود تھے۔

ساتھیو! اب ہم بڑھے اپنے اگلے مرحلے کی جانب۔ یہ مرحلہ تھا خصوصی ایوارڈز کا۔ اس مرحلے کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے حاضرینِ محفل کی نذر ایک شعر کیا۔

گھڑی گھڑی نہ اِدھر دیکھیے کہ دل پہ مجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

جی جناب اب ہم آگئے خصوصی ایوارڈز کی جانب سب سے پہلے بہترین سلسلے وار ناول "یاد کے پچھلے پہر" کے لیے میں نے ایک بار پھر زحمت دی شہرِ اقتدار سے تشریف لانے والی ہر دلعزیز لکھاری فرزانہ آغا صاحبہ کو۔ "یاد کے پچھلے پہر" ایک ایسا طلسم ہوشربا تھا جس نے اہلِ دوشیزہ کو اپنے سحر میں یوں جکڑا کہ آج بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اب اور کیا میں عرض کرتا کہ بہت ساری باتیں فرزانہ آغا صاحبہ کے بارے میں پہلے ہی ہو چکی تھیں۔

دوسرے خصوصی ایوارڈ 2010ء تا 2013ء کے بہترین مکمل ناول "دیوار پہ دستک" کے لیے میں نے مظفر گڑھ سے تشریف لانے والی ہماری بے مثال لکھاری ساتھی وردانہ نوشین خان صاحبہ کو پکارا۔ 'دیوار پہ دستک' نے خواتین میں چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کی زبردست تحریک پیدا کی۔ بلاشبہ یہ تحریر خصوصی ایوارڈ کی حقدار قرار پائی۔

اب میں نے تیسرے خصوصی ایوارڈ کے لیے جس رائٹر کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ وہ تھیں سلمیٰ یونس (کراچی) بہت کم عمری ہی سے لکھنے کا آغاز

کرنے والی سلمٰی کی تحریر میں بلا کی پختگی تھی۔ گزشتہ دہائی سے ادبی میدان میں وارد ہونے والی سلمٰی یونس

اے خالو! ذرو ابھی شاہد حیات ہے
بہت پیارے ساتھیو! لیجیے ایوارڈ کا مرحلہ اختتام

رضیہ مہدی صاحبہ

جو لوگ زندگی کے پل صراط کی بہت باریک سی تار سے آسانی سے گزرتے ہیں۔ غم ہو یا خوشی ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے، تو دراصل وہ کاروبار الفتِ کے رموز سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ منزہ کاروبارِ الفت کے رموز جانتی ہیں اور انہیں اچھی طرح پہچانتی ہیں۔ نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے۔

کی خواہش تھی کہ وہ بھی دوشیزہ ایوارڈ ونر رائٹرز کی صف میں شامل ہو جائیں۔ آج 2010ء تا 2013ء کے بہترین مکمل ناول چور دروازے پر خصوصی ایوارڈ کی نامزدگی نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ (چور دروازے، آج کل، اک نجی ٹی وی چینل پر بھی آن ایئر ہے)

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اس خصوصی ایوارڈ کے لیے محمد اقبال زمان صاحب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ اقبال صاحب کے لیے کیا کہنا تھا۔ سب دیکھ ہی رہے تھے ایک کل بیٹھتے ہی نہیں۔ یہ خصوصی ایوارڈ محمد اقبال زمان صاحب کو 2010ء تا 2013ء کے بہترین انٹرویو شاہد حیات صاحب سے ایک یادگار ملاقات پر دیا گیا۔

ایک قطعہ جو شاہد حیات صاحب کے لیے ہوا تھا وہ میں نے سب سامعین کی نذر کیا۔

جرأت سے سامنا کیا ہر ظلم و جبر کا
شاہد تمہاری زیست تمہاری حیات ہے
کرسی اِدھر اُدھر ہوئی اور کچھ نہیں ہوا

پذیر ہوا۔ مگر کچھ خصوصی ایوارڈز باقی تھے۔ جن کے لیے میں سیما رضا ردا کو دوبارہ اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ اب سیما روسٹرم پر موجود تھیں۔

پانچویں خصوصی ایوارڈ 2010ء تا 2013ء کے بہترین کالم "ہم سے ملیے" اور خصوصی ناولٹ "کڑوی روٹی" پر میرا نام پکارا گیا۔ سیما نے کہا۔ بطور شاعر ادیب مدیر استاد اپنی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہیں۔ میں نے اپنا خصوصی ایوارڈ وصول کیا۔ میرے لیے یہ لمحہ، زندگی کا حاصل تھا۔

اس کے بعد صدرِ مجلس مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کو بھی خصوصی ایوارڈ دیا گیا۔

ساتھیو! اس طرح ایوارڈ کی تقسیم کا عمل مکمل ہوا اور رائٹرز کو مہمانانِ گرامی حضرات کے ساتھ گروپ فوٹوز کے لیے اسٹیج پر بلا لیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سیما جی نے حاظرین محفل کا شکریہ ادا کر کے ہائی ٹی سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی اور یہ سنہری پل کھٹا کھٹ کیمرے کی آنکھوں میں محفوظ ہوتے، ایک یادگار کی صورت ذہن و دل میں امر ہو گئے۔

☆☆......☆☆

صدر محفل محترمہ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ
مہمان خصوصی محترم محمود شام
معزز اسپیکر سید شاہد حسن
ملک بھر سے آئے ہوئے دوشیزہ کے تمام قلم کار، صحافی برادری، ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے نمائندگان اور شرکائے محفل کو میں منزہ سہام دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی ستائیسویں تقریب میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتی ہوں۔

آج کا دن میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کی وجہ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کا انعقاد ہے۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی یہ تقریب چار سال کی تاخیر سے ہو رہی ہے۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا......

اہم بات یہ ہے کہ آج ہم سب ایک بار پھر ایک ساتھ موجود ہیں۔

دوشیزہ کا پہلا شمارہ 1972 میں شائع ہوا اور تقریباً 8 سال بعد 1980 میں پہلی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تقریب کا انعقاد ہوا اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

پہلی تقریب بھی اسی ہوٹل میں ہوئی جو اُس وقت انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کہلاتا تھا اور آج ستائیسویں تقریب بھی یہیں ہو رہی ہے۔ ان ستائیس سالوں میں جو مہمانِ خصوصی یہاں تشریف لائے اُن میں سے چند نام جنرل ضیاء الحق، چیف منسٹر اختر علی جی قاضی صاحب، جنرل معین الدین حیدر، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، جاوید جبار صاحب، بیگم عباسی، حبیب جالبی صاحب، بریگیڈیئر صدیق سالک، دوست محمد فیضی اور انور مقصود صاحب، عصمت چغتائی۔

میرے والد (مرحوم) سہام مرزا کی خواہش تھی کہ قلم کاروں کو وہ عزت اور مرتبہ ضرور ملنا چاہیے جس کے وہ حق دار ہیں۔ قلم کار معاوضے سے زیادہ عزت کا خواہاں ہوتا ہے۔

جس دور کی میں بات کر رہی ہوں تب معاوضہ بھی برائے نام ملا کرتا تھا۔ ایسے میں پانچ ستاروں

والے ہوٹل میں، بنا Sponsers فنکشن کرنے کے خیال کو اکثریت نے دیوانے کی بڑ جانا۔ یقیناً اپنی جیب سے خطیر رقم خرچ کرنا بہت ہمت کی بات ہے اور بدلے میں صرف یہ چاہنا کہ قلم کار اپنے آپ کو کبھی کسی سے کم تر محسوس نہ کرے دیوانے کی ہی خواہش ہو سکتی ہے۔

بہر حال ایوارڈ کا سلسلہ شروع ہوا...... ابو کے انتقال کے بعد بھی میں نے اس سلسلے کو رُکنے نہیں دیا۔ آج میں وہاں کھڑی ہوں جہاں کبھی 40 سال قبل میرے والدین کھڑے تھے۔ کوشش پوری کی کہ دفتر، گھر، اولاد، والدہ سب کی ذمہ داریاں بہتر طور پر نبھا سکوں...... بادِ مخالف کا بھی سامنا جرأت کے ساتھ کرتی رہی اور آج یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ بیٹیاں بھی ذمہ داری اٹھانے کی اہل ہوتی ہیں۔

باپ کے نام کو وہ بھی زندہ رکھ سکتی ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آس پاس زندہ لوگ موجود ہوں۔ صرف سانس لینا زندگی کی علامت نہیں، باضمیر ہونا بھی بہت ضروری ہے اور میں وہ خوش نصیب ہوں جس کے اردگرد زندہ اور اچھے لوگوں کا ایک حصار ہے جو مجھے ہر دُکھ اور پریشانی سے بچا لیتے ہیں۔

ڈیڑھ سال قبل میری پہلی کتاب ''کانچ کی عورت'' کی اشاعت ہوئی اور اب میری دوسری کتاب ''اُجلے حروف'' مجموعہ ہے ان کالمز کا جو میں نے مختلف اخبارات میں لکھے۔ یہ کالمز زیادہ تر پولیس ڈپارٹمنٹ پر ہی ہیں۔

تعریف بھی کی، تنقید بھی کی...... جن مشکلات کا سامنا ہماری پولیس کو ہے اس کا بھی ذکر کیا......

کوشش یہی رہی کہ سچ لکھوں اور بے جا تنقید سے دور رہوں...... کیسا لکھا یہ تو اب لوگ پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں، میں آپ کی آرا کی منتظر رہوں گی۔

ہمیشہ کی طرح سہام مرزا ایوارڈ اس بار بھی اپنی فیلڈ میں کارہائے نمایاں دکھانے والی شخصیت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمراہ چھوٹا سا کیش پرائز بھی ہے۔ اس سے قبل یہ ایوارڈ مرحومہ حمیدہ اختر رائے، مرحوم قمر علی عباسی صاحب اور مہتاب اکبر راشدی صاحبہ نے وصول کیا۔

سندھ اسمبلی میں مہتاب اکبر راشدی جیسے لوگ ہوں تب حالات کو بہتر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کاش یہ بات اربابِ اختیار کو بھی سمجھ میں آ جائے کیونکہ سچ یہ ہے کہ War Of Titans میں جیت ہمیشہ طاقت ور کی ہوتی ہے۔ لیکن اس سارے پروسس میں کچلے صرف عوام جاتے ہیں۔

کبھی کبھار اچھے لوگوں کو بھی حکومت کا حصہ بننا چاہیے...... قابل لوگ ہی اداروں کا تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ پاکستان کو اگر پھلتا پھولتا دیکھنا ہے تو صحیح لوگوں کو صحیح وقت پر صحیح جگہ لانا ہوگا۔

اور اب مجھے بھی صحیح وقت پر صحیح شخص کے حوالے مائیک کر دینا چاہیے۔ لیکن اُس سے پہلے میں اپنے اسٹاف کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کیونکہ اُن کے تعاون کے بغیر یہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔

آخر میں ایک بار پھر مہتاب اکبر راشدی صاحبہ، اسپیکرز، معزز مہمان، میرے تمام رائٹرز اور میڈیا آپ سب کی آمد کا بہت شکریہ۔

☆☆......☆☆

تقریب کے مقرّر

سید شاہد حسن صاحب

"میڈم، مہتاب اکبر راشدی صاحبہ، محمود شام صاحب معزز خواتین و حضرات
السلام و علیکم!

میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں بہت سارے قلم کاروں سینئر رائٹرز سے آج مخاطب ہوں۔ آج سب کی موجودگی اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ہر ایک کا رشتہ قلم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ قلم جس سے ہم معاشرے میں تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔

میری گفتگو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگی۔ لیکن منزہ سہام مرزا نے دعوت نامہ بھیجنے کے بعد مجھے جس قدر خلوص کے ساتھ مدعو کیا میں اس کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حاظرین جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارا میڈیا حالتِ جنگ میں ہے۔ جنگ وجدل کی یہ کیفیت اپنی حدوں کو چھورہی ہے۔ ان حالات پر نا چاہتے ہوئے بھی ایک صحافی پر بعض ایسی ذمہ داریاں ٹھونس دی جاتی ہیں۔ جسے مجبوراً پورا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہے۔ جن حالات سے میں اس وقت گزر رہا ہوں۔ ان کی وجہ سے آج میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کاش میں صحافی نہ ہوتا۔ کیونکہ میڈیا پر ہمارے سینئرز کی اقدار کو پامال کیا جارہا ہے۔ قلم کی حرمت کو خاک میں ملادیا گیا ہے۔ اسکرین پر اس وقت چھاتہ بردار قسم کے صحافی کس وقت اور کون سی اول فول بک دیں ہر وقت کان ایسی باتیں سُننے کے لیے تیار ہیں۔

یہ ہماری صحافت نہیں تھی۔ یہ ہماری اقدار نہیں تھی۔ جو ہمارے سینئر قلم کار تھے، آج جو ہم ان کے ساتھ بدیانتی کررہے ہیں۔ ایسے ماحول میں آپ جیسے قلم کار ہماری رہنمائی کریں۔ آواز اٹھائیں، لوگوں کو بتائیں کہ صحافت وہ نہیں جو آپ لوگ کررہے ہیں۔ صحافت یہ ہے جو ہم کررہے ہیں۔ جو ہم لوگوں کو بتارہے ہیں۔ میڈیا ہاؤسز کی چھتوں پر اترنے والے چھاتا بردار صحافی۔ جنہوں نے صحافیوں کو تقسیم کردیا۔ صحافی تنظیموں کو تقسیم کردیا۔

علماء کو تقسیم کر دیا۔ سیاسی جماعتیں تقسیم ہوگئیں۔ یہاں تک کہ معاشرہ تک آج تقسیم لگ رہا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کو پسند کر رہا ہے، کسی نہ کسی کا ساتھ دے رہا ہے جبکہ ہماری تو یہ ذمہ داری نہیں تھی۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم حقیقت لوگوں کو بتائیں۔ ہم ان اختلافات کا شکار ہوگئے جس کی وجہ سے حقیقتیں پسِ پردہ جاتی ہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے کہ دل کی بھڑاس نکالوں۔ شام جی! معذرت کے ساتھ لیکن مجبوری ہے۔

کانچ کی عورت جب آہنی کتاب لے کر آئی۔ منزہ کی جس وقت پہلی کتاب آئی تو میں نے اس وقت کہا کہ عورت تو یہ کانچ کی ہی لگتی ہے مگر ان کی تحریروں سے آہنی عزم کا اظہار جس انداز میں ہوتا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ یہ واقعی سہام مرزا کی صاحبزادی ہیں۔

زیرِ موضوع کتاب اُجلے حروف منزہ سہام کی عظمت و ہمت کی گواہی دے رہی ہے۔ میرے لیے باعثِ فخر ہے کہ منزہ سہام نے کالم نگاری کے میدان میں جب قدم رکھا تو پہلا کالم مجھے ہی دیا۔ پھر کیا تھا۔ منزہ نے قلم اٹھایا اور لکھتی ہی چلی گئیں۔

جنابِ صدر اس محفل میں بڑی اچھی قلم کار خواتین موجود ہیں۔ شعر و ادب سے ان کا تعلق ہے۔ اپنے افسانوں اور کہانیوں میں بڑے حساس موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ صرف ازل سے ابد تک کے واقعات کو موضوع بناتی ہیں اور کالم نگار کوزے میں دریا کو بند کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے منزہ یہ فن اچھی طرح سے جان گئی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ منزہ اب اُجلے حروف کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

خواتین و حضرات سماجی شہرت کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اور ہم سب کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم اپنی موجودہ نسل کا کتاب سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کریں۔ اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو ایک ماں بہت اچھے طریقے سے جوڑ سکتی ہے۔ چرچل نے یونہی نہیں کہا تھا کہ آپ مجھے اچھی مائیں دیں، میں آپ کو اچھی قوم دوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

پیاری منزہ سہام کے لیے

خوشبو سے ہے مہکتی پھولوں کی یہ لڑی
جادو کی چھڑی لے کے کھڑی ہو کوئی پری
تحریر اُس کی سادہ پر موتیوں بھری
اُصولوں میں اپنے لیکن منزہ بہت کڑی
ڈرتی نہیں کسی سے بہادر ہے وہ
حق کی بات پہ تو سُنا دے کھری کھری
غم کو چھپا کے ہنسنے کا رکھتی ہے ظرف وہ
جو بھیگ جائیں اُس کی آنکھیں بڑی بڑی
"اُجلے حروف" لے کر محفل میں آئی ہے
چھوٹی سی اُس کی کوشش سمجھیں تو ہے بڑی

شگفتہ شفیق

''مہتاب اکبر راشدی صاحبہ، فاطمہ ثریا بجیا'' (بجیا سامنے بیٹھی تھیں۔ شام صاحب اسٹیج سے نیچے اترے اور بجیا نے گلے لگا کر انہیں پیار کیا) شام صاحب روسٹرم پر دوبارہ گئے۔ سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

''ہم سب کو بجیا کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ہم سب کی سرپرستی اور شفقت کے لیے وہ اتنی زحمت کرتی ہیں۔ بجیا کو جب بھی ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے اور زیادہ حوصلے بڑھتے ہیں۔ ان کا بہت کنٹری بیوشن ہے اس فورم کی تعمیر میں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے اور ہم انہیں اپنے درمیان دیکھتے رہیں۔ شاہد حسن صاحب، منزہ سہام مرزا۔

ابھی میں کینیڈا میں تھا تو وہاں بھی منزہ سہام مرزا کے بارے میں ایک بہت اچھا جملہ تھا۔ Very Big Soul In A Very Very Young Body۔ کالم نگاری کے بارے میں جب سنا تو اُس میں نظر آتا ہے کہ ایک بہت ہی سنجیدہ، عمر رسیدہ شخصیت ہمیں بہت سی نصیحتیں کر رہی ہے اور سیما رضا صاحبہ جو آپ کو تالیوں کی تربیت دے رہی ہیں۔ حالانکہ ہماری قوم کو تالیاں بجانے کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا۔ میں یہاں صرف ایک سامع کی حیثیت سے آیا تھا مگر۔

منزہ کے کالموں کے بارے میں انہوں نے خود ہی کہا کہ Police ان کا محبوب موضوع ہے۔ سہام مرزا صاحب کا بھی Police بہت محبوب موضوع تھا۔ دوشیزہ کا ادارہ ہو یا دوسرے ادارے ان میں مالکان، ایڈیٹرز، صحافیوں کی کئی نسلیں ہیں، جو ان اداروں کو آگے بڑھاتی ہیں۔ لیکن آج کل افسوس ناک صورتِ حال نظر آ رہی ہے۔ ایک ادارہ جو بہت سے ایڈیٹرز نے، مالکان نے آگے بڑھایا تھا۔ اپنی ہی غلطیوں اور غلط پالیسیوں کی وجہ سے مسائل کا شکار ہے۔ پہلے لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ نے جنگ کیوں چھوڑا اور آج میں اُن سے کہتا ہوں کہ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے مناسب وقت پر چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ آج دفاع کرنا بہت مشکل ہوتا۔ چونکہ جو کچھ بھی وہ کر رہے ہیں، وہاں ہوتے تو اس کا دفاع ظاہر ہے کرنا پڑتا۔ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کو ہم اُس وقت سے

جانتے ہیں جب یہ مہتاب چندہ تھیں۔ مہتاب بھی چاند کو کہتے ہیں اور چندہ بھی چاند کو کہتے ہیں۔

جب سے دوشیزہ کے یہ ایوارڈ شروع ہوئے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میں نے شرکت کی تھی۔ آپ لوگ جو مصنفین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اُسی سے متاثر ہو کر ہم نے بھی اپنا ایک ماہنامہ "ٹوٹ بٹوٹ" بچوں کے لیے نکالا تھا۔ اور آپ کے بعد ہم نے بھی اُن بچوں کے لیے ایوارڈز کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ دوشیزہ سے ہی ہم Inspire ہوئے تھے۔ کئی سال وہ سلسلہ چلا۔

جب سے انٹرنیٹ شروع ہوا ہے پوری دنیا میں یہ مسئلہ اٹھا ہے کہ پرنٹ رہے گا یا نہیں رہے گا۔ وہاں یہ بھی کہا گیا کہ انٹرنیٹ کتاب کی موت ہے یا Death Of Word لیکن اِس وقت بھی پوری دنیا میں امریکہ، کینیڈا کہیں بھی پرنٹ اپنی طاقت منوا رہا ہے اور آج کی یہ تقریب بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ پرنٹ کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اپنی تحریر یا حرفِ مطبوعہ کے ذریعے آپ اپنے دل کی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہی اصل بات ہے جو ایک دل سے دوسرے دل تک پہنچ سکے۔

میں یہاں اپنی ایک نظم بھی درمیان میں سنانا چاہوں گا۔

بیٹیاں پھول ھیں

پھول جب شاخ سے کٹتا ہے بکھر جاتا ہے
پتیاں سوکھتی ہیں سوکھ کر اڑ جاتی ہیں
بیٹیاں پھول ہیں
ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں
ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں
باپ کے دل کا سکوں ہوتی ہیں
گھر کو جنت سا بنا دیتی ہیں
ہر قدم پیار بچھا دیتی ہیں
جب بچھڑنے کی گھڑی آتی ہے
غم کے رنگوں میں خوشی آتی ہے
ایک گھر میں اترتی ہے اُداسی لیکن
دوسرے گھر کے سنورنے کا یقیں ہوتا ہے
بیٹیاں پھول ہیں
سوکھتی ہیں نا بھی ٹوٹتی ہیں
اِک نئی شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں

☆......☆......☆

آپ لکھنے والی ہماری مشعلیں ہیں، جن سے معاشرے میں روشنی ہے۔ ادبی حلقوں میں ایک یہ بحث بھی چلتی ہے کہ ڈائجسٹوں میں لکھنے والوں کی کہانیاں ادب کا حصہ ہیں یا نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو دل میں بس رہا ہے حکومت اسی کی ہے۔"

جو بات دل میں اتر جائے، وہ ادب ہے۔ دوشیزہ کی کہانیاں اور اس میں دوسری چھپنے والی چیزیں دل میں اترتی ہیں۔ اور جب تنہائی میں دل نہ بہلتا ہو تو یہ کہانیاں بھی ساتھ دیتی ہیں۔ اور خاص طور پر جیل میں ڈائجسٹ بہت ساتھ دیتے ہیں۔ وہاں کچھ عرصہ تو آپ کچھ سیریس کتاب پڑھتے ہیں لیکن زیادہ آپ کو ان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جیل میں بھی، ریل میں بھی۔ اور میں اُجلے حروف پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ جس وقت ہم جہان پاکستان میں تھے۔ اُس وقت آپ نے جہان پاکستان کو اپنے کالموں کے لیے منتخب کیا تھا۔ آپ کے کالمز پر وہاں ہمیشہ اچھا ریسپانس بھی آتا تھا۔

آج آپ کو بھی دلی مبارک باد اور جو بھی دوشیزائیں یہاں پر ایوارڈ حاصل کریں گی ان کو بھی دلی مبارکباد۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں سے ہم بہت مطمئن، پُراُمید بلکہ ایک یقین کی قوت لے کر واپس جائیں گے اور یہ یقین ہوگا کہ پاکستان آگے بڑھ رہا ہے اور پاکستان ایک قوم بن رہا ہے۔"

☆☆......☆☆

مہتاب اکبر راشدی صاحبہ

کا حُسنِ بیاں

محترمہ فاطمہ ثریا بجیا صاحبہ، محمود شام صاحب، رخسانہ سہام مرزا صاحبہ، شاہد حسن صاحب، میری بہت ہی پیاری منزہ اور بہت ہی قابلِ احترام خواتین و حضرات جو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

یہ محفل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہماری آنکھوں سے اُتر کر دل میں بسی ہے۔ سالوں سے بسی ہوئی ہے، ہم اس کا حصہ رہے ہیں۔ گاہے بگاہے آتے رہے ہیں۔ مجھے دو چیزوں پر گفتگو کرنی ہے۔ ایک تو بذاتِ خود دوشیزہ، اس کے دیے جانے والے ایوارڈز اور دوسری وہ دوشیزہ اب جس کے ہاتھ میں دوشیزہ کی تقدیر ہے۔ یہاں پر منزہ کی بہت باتیں ہو رہی ہیں پتا نہیں لوگ ان کو کتنا جانتے ہیں۔ لیکن یہ شاید اُن کچھ لوگوں میں سے ایک ہیں جو پتا نہیں کیا کرتی ہیں۔ حکم کرتی ہیں کہ میں کہہ دیتی 'ہاں'۔

''آپ کو آنا ہے تو میں کہتی ہوں' جی ہاں' جب منزہ کا فون آیا تو میں نیویارک میں تھی۔ تو منزہ نے کہا کہ ایوارڈ تقریب میں آپ نے آنا ہے۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ کبھی میں نے 'نا' بولا ہے۔ میں ضرور آؤں گی۔ مجھے نہیں پتا تھا تاریخ کون سی ہے۔ بس مجھے یہ پتا تھا کہ مجھے یہاں جانا ہے۔ اُس کی وجوہات ہیں۔ پہلی تو بات آپ یہ دیکھیے کہ کوئی ایک ایسا رسالہ جو اپنے تسلسل کے ساتھ جاری رہے، اپنے معیار کو برقرار رکھے اور اپنی روایات کو بھی برقرار رکھے۔ روایات میں سے ایک روایت اگر اپنے لکھنے والوں کی پذیرائی ہے اور اُن میں مقابلہ کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ یہ چیزیں ہیں جو آپ کو زندگی میں اپنی منزل پانے کے لیے اُکساتی ہیں۔ ستائیسواں ایوارڈ اگر دیا جارہا ہے۔ اتنے دور دراز علاقوں سے خواتین آتی ہیں، اپنا ایوارڈ وصول کر کے جاتی ہیں تو یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا لمحہ ہوتا ہے، جو اُن کو اِس چیز پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس سے بھی اچھے موضوعات پر مزید لکھیں اور مسلسل ایوارڈ حاصل کریں۔

اتنی بڑی تعداد میں جو ایوارڈز یہاں رکھے ہوئے ہیں تو آپ یہ دیکھیے کہ وہ کتنے قلم ہوں گے،

وہ کتنے ذہن ہوں گے، وہ کتنی خواتین ہوں گی جو اس کی حقدار قرار پائی گئی ہیں۔ اور وہ سب کے سامنے یہ پذیرائی، یہ منزل پائیں گی۔ لوگ ان کی تعریفیں کریں گے۔ اور ہم اُس وقت بہت تالیاں بجائیں گے۔ ایک چیز تو یہ ہوگئی۔ دوسرا یہ کہ میں منزہ پر اس لیے بات کرنا چاہتی ہوں کہ یہ جو آپ کو بہت خوبصورت خاتون، بہت پُرسکون بیٹھی نظر آ رہی ہیں۔ میں نے اس کو بہت گمبھیر لمحوں میں اسی طرح پُرسکون دیکھا ہے۔ اب یہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو انسان کو بکھرنے نہیں دیتی؟ اس کے اندر اپنا ایک اعتماد ہوتا ہے، ایک یقین ہوتا ہے، اور اپنے پیچھے جو لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا ان کو جو ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اُس خاتون کو، مرد کو یا عورت کو یا انسان کو مضبوط بناتا ہے۔ میں تفصیل میں بالکل نہیں جاؤں گی۔ بہت سارے لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں پتا نہیں کتنے نشیب و فراز سے گزرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بہت کم عمری میں ان تکلیفوں سے گزرے یا نشیب و فراز سے گزرے اور اپنے حوصلے کو نہ کھونے دے، وہ زندہ رہے اور اپنا مقام حاصل کرے تو وہ سب سے بڑی بات ہوتی ہے۔ تو میرے لیے منزہ اس لیے بہت اہم ہے، قیمتی ہے۔ Gorgious ہے۔ بہت باہمت ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے مثال ہے۔ تو اس نے اپنے آپ کو کھوتے کھوتے دوبارہ سے دریافت کیا۔ اور اپنے آپ کو، اپنے قلم کے ذریعے سے منوایا۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے لیے دوشیزہ ایک پلیٹ فارم تو تھا ہی جو باقی خواتین کے پاس بھی ہے لیکن اپنے قلم کو آزمانے کے لیے کالم نگاری شروع کرنا۔ ایک کتاب کا لے آنا ایک نہیں دو کتابیں لے آنا بہت کم عرصے میں، یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ بہت بڑی بات ہے۔ یہ ذہن کی سوچ ہوتی ہے۔ تسلسل ہوتا ہے۔ تخلیق ہوتی ہے۔ جو آپ کے اندر ہوتی ہے جو آپ کو ایک مثبت پہلو کی طرف لے جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم رونا دھونا شروع کریں اور ہم اپنے ہی غم و الم لوگوں تک پہنچائیں۔ ہم حوصلے کے ساتھ بات کرتے ہیں تو حوصلہ آپ لوگوں تک منتقل ہوتا ہے۔ آپ کو ایک راہ دکھاتا ہے، تو یہ ایک بہت خوشی کی بات ہے۔ پچھلا جو دوشیزہ کا ایوارڈ کا فنکشن ہوا تھا۔ اُس میں منزہ وہاں نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور میں حیران تھی کہ یہ نیچے بیٹھی ہے اور یہ بڑے سکون سے بیٹھی تھی۔ اس کے اندر کتنا طلاطم تھا وہ کسی کو محسوس نہیں ہوا لیکن آج جب وہ اوپر بیٹھی ہے تو لگتا ہے کہ ہر چیز کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ That Is The Woman Of Pakistan پاکستان کی عورت اتنی ہی حوصلہ مند ہے۔

جب یہاں پر ہم پرانے محاورے دہراتے ہیں تو مجھے فوراً تکلیف ہوتی ہے۔ مردانہ وار نکل آئی...... کیا مطلب زنانہ وار بھی نکل کر آ سکتے ہیں۔ اب بدل دیجیے یہ محاورے۔ اُس وقت یہ اُن مردوں نے لکھے تھے جب اُن کو مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔ اب عورتیں اپنی چیزوں کو سمجھتی ہیں۔ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اور آپ دیکھیے کہ جب اس طرح کے مرد (اسٹیج کی طرف اشارہ تھا) ہمارے ساتھ ہوتے ہیں اور جو بیٹیوں کے لیے اس قدر خوبصورت اشعار لکھتے ہیں تو ان کو قدر ہوتی ہے کہ بیٹی کیا ہوتی ہے۔ بیٹے ہماری سر آنکھوں پر۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ مرد سے تو ہمارا جھگڑا ہی نہیں ہے۔ ہم جھگڑا کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری زندگیوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ وہ ہمارے وجود کو لانے والے ہوتے ہیں۔ ہمیں آگے بڑھانے والے ہوتے ہیں۔ ہماری پیشانیوں کو چوم کر احساس دلاتے ہیں کہ ہم ان کو کتنی عزیز ہیں لیکن تکلیف جب ہوتی ہے۔ جب وہی

مرد، رسم ورواج کا ایک حصہ بن کر، اپنی ہی بیٹیوں کو روند ڈالتے ہیں۔ صرف یہ تکلیف ہوتی ہے۔
تو یہاں جتنے بھی مرد حضرات بیٹھے ہیں۔ وہ کچھ نہ کریں بس اپنے آنگن میں پلنے والی اُن کونپلوں کو دیکھیں اور یہ دیکھیں کہ بے شک وہ فیصلہ کرنے والے ہیں لیکن تقدیر کا فیصلہ خدا کرتا ہے۔
آپ صرف انصاف سے کام لیجیے۔ جو چیز آپ اپنے بیٹوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کیوں ضروری نہیں سمجھتے۔ صرف اس پر غور کیجیے۔ آپ اپنے بیٹوں کی من مانیوں کو لاڈ اور پیار کا نام دیتے ہیں۔ جو کچھ وہ چاہیں کر لیتے ہیں۔ لیکن بچی جب اپنا حق مانگتی ہے تو آپ دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ذرا اس پر بھی غور فرمائیے۔ یہ چیزیں ہمیں آپ کو اس لیے بھی سمجھانی پڑ رہی ہیں کیونکہ شاید ہماری ہی کوتاہی ہوتی ہے کہ ہم اپنی گود میں پلنے والے بیٹوں کو وہ چیزیں نہیں سمجھاتے کہ عورت کی تعظیم اور تکریم کیوں کرنی چاہیے۔ کس لیے کرنی چاہیے۔ جب آپ اُن کی تعظیم اور تکریم اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں تو آپ یہ دیکھیں کہ آپ کی بہوویں بھی خوش رہتی ہیں، آپ کی ماں اور بہنیں بھی خوش رہتی ہیں اور اپنے گھروں میں، اپنے معاشرے میں آپ کو توازن محسوس ہوتا ہے۔
تو اس میں ہم عورتوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ سمجھنا چاہیے کہ ہماری گود میں پلنے والی اولاد کو ہم بہت سی چیزیں منتقل کر رہے ہیں۔ اگر ایک عورت ساس بنتی ہے تو ساس ہی کیوں بن جاتی ہے۔ جس کے پاس ایک بچی آتی ہے۔ وہ ماں کیوں نہیں بنتی۔ آپ ایک گھر سے بچی لے کر آتے ہیں اپنے گھر میں تو وہ ایک بجلی کا بٹن تو نہیں ہے کہ دبایا تو وہ ایک دم سے بدل گئی۔ ماحول میں ڈھل گئی، تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ ایک چھوٹا سا پودا کہیں سے لاتے ہیں۔ ایک پودا کہیں لگا ہوا ہو، اُسے اُکھاڑ کر کسی دوسری جگہ لگاتے ہیں تو آپ کتنی محبتوں سے اس کی نشوونما کرتے ہیں کیونکہ اس کو جڑ پکڑنے میں وقت لگتا ہے۔ وہ تو ایک انسان ہے۔ وہ بھی ایک ماحول سے نکل کر آئی ہے۔ دوسرے ماحول میں بسنے کے لیے اُس کو وقت چاہیے۔ ایک سال، دو سال، وہ خود بخود مانوس ہو جائے گی۔ لیکن اگر ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ کہ ہمارے گھر میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ چونکہ بچی تو وہ (ساس) کہتی ہی نہیں۔ تو آپ موقع دے دیجیے، وہ بچی سمجھ جائے گی۔ وہ اپنے آپ کو ڈھال لے گی۔ وہ جس مرد کے پیچھے آئی ہے اس کی عزت کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بھی عزت کرے گی۔
ایک مثال دیتی ہوں چھوٹی سی۔ میرا بیٹا ہوتا یہاں تو مجھ پہ ناراض ہوتا۔ پچھلے دو تین ہفتے میری بہو بہت بہت بیمار تھی۔ اتنی بیمار ہوئی کہ ہم سب پریشان ہو گئے۔ اُس کا بخار 104 سے کم نہیں ہو رہا تھا اور ایک دن تو 105 پہ پہنچا۔ میں بھی گھر پر نہیں تھی، لاہور تھی اور مجھے وہاں سے اسلام آباد جانا تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اپنا اسلام آباد جانا ختم کیا اور گھر آ گئی۔ تو میں نے دیکھا رافع اُس کو مسلسل اسپنجنگ کر رہا تھا۔ اور ایک لمحے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں روک رہا تھا کہ کسی صورت اس کا بخار کم ہو جائے۔ اس کے ساتھ میں بھی بیٹھ گئی۔ رات کے دو بج گئے، تین بجے گئے۔ تاکہ بچی کا کچھ بخار اترے۔ یہ ایک دن نہیں ہوا، مسلسل کئی دن سے ہو رہا تھا۔ تاکہ اس کا بخار کچھ کم ہو جائے اس نے کہا کہ آپ جا کر آرام کریں۔ تھکی ہوئی آئی ہیں۔ لیکن میں نہیں اٹھی۔
اُس کو دیکھ کر یقین کریں مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے اُسے بہت پیار کیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری تربیت آج میرے سامنے کھڑی ہے اور میرا بیٹا اپنی بیوی کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

ہم اپنی بہوؤں کو اپنی بیٹیاں سمجھیں گے تو گھر کیسے اچھا نہیں ہوگا۔ انسانی احساسات، تربیت اور عورت کی تقدس، یہ چیزیں جو پاکستان کی عورت کو اپنا مقام حاصل کرنے میں مدد کریں گی یہ جملہ یہاں بڑھا گیا کہ جب تک عورت خود اپنی عزت نہیں کرے گی تو دوسرا کیوں کرے گا۔ عام طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ جی ہم نے اپنے ماں باپ کی عزت کی خاطر یہ کیا۔ تو بھئی ماں باپ کی عزت تو بعد میں آتی ہے۔ پہلے تو آپ کی خود کی عزت آتی ہے۔ پہلے

کہ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے ایک کھلا میدان ہے۔ جب آپ کی صلاحیتوں کو منوایا جاتا ہے تو اسی طرح سے یہ ایوارڈ کی تقریبات ہوتی ہیں۔ اور اتنے لوگوں کے سامنے آپ کی پذیرائی ہوتی ہے۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ ایک لوگ نام بنا کر جاتے ہیں اور ان کے پیچھے دوسرے لوگ آتے ہیں۔ بجیا نے ایک اینٹ رکھی اور کتنی عمارتیں کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے ایک مثال قائم

مہتاب اکبر راشدی کے دوران تقریب کچھ خوشگوار پل

آپ اپنی خود کی عزت کا خیال کریں اور پھر ماں باپ کی عزت آٹومیٹکلی ہو جاتی ہے۔

You Try To Understand

Learn Your Self جب تک آپ اپنی عزت اور احترام اور عظمت کا خیال نہیں کرتے تو کوئی بھی آپ کی عزت نہیں کرے گا۔ آپ چاہیں تو سب کچھ کر سکتی ہیں۔ اپنی جرأت سے آپ معاشرے کو بدل سکتی ہیں۔ ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ ابتدا خود اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ تبھی آپ کو یہ رنگ چاروں طرف چڑھتا ہوا نظر آئے گا۔

تو یہاں پر دوشیزہ نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے

کی اور خواتین نے لکھنا شروع کر دیا۔ تو ہمارے سامنے تو ایسی ایسی مثالیں ہیں۔ ابھی جب آپ تشریف لا رہی تھیں تو میں نے شام صاحب سے کہا کہ بجیا کی ہمت کو دیکھ کر تو ہم داد دیتے ہیں۔ اللہ ان کو جیتا رکھے۔ اتنی ہمت، اتنی جرأت کے ساتھ آنا، سامنے بیٹھنا، لوگوں کو حوصلہ دینا۔ کتنی بیماریوں سے نہیں گزری ہیں۔ لیکن بجیا نے بیماریوں کو بھی شکست دے دی۔ ہمیں سیکھنا چاہیے ان لوگوں سے جو ہمارے سامنے ایک مثال ہیں۔ ہمارے سامنے ایک شام صاحب کی بھی مثال ہے۔ ہمیشہ مثبت لکھا، ہمیشہ اچھا لکھا۔ ہمیشہ ہمت افزائی والا لکھا۔ قوم کی

خاطر وہ تمام چیزیں لکھیں جو انہوں نے اپنے تجربوں سے حاصل کیں۔ دیکھیں اور بیان کیں، یہاں پر صحافت کی بھی ایک شخصیت شاہد حسن صاحب تشریف فرما ہیں۔ دیکھیں ایک فیز سا آ گیا ہے۔ ایک محاذ سا ہے۔ ایک طرف جنگ ہے ایک طرف جیو ہے۔ تو بجیا جب آئیں تو انہوں نے جیو جیو کہا تو میں نے کہا کہ یہ تو پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ (مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ چونکہ ہماری بجیا سب کے سروں پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے جینے کی دعا دیتی ہیں)

صحافت تو یہی ہے کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ تھوپیں مت کہ ہم جو کہہ رہے ہیں۔ وہ صحیح ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہے۔ آپ اپنا بتا دیجیے۔ لیکن اگر یہ زعم ہے کہ حکومتیں ہم لائیں گے، حکومتیں ہم گرائیں گے تو میرا خیال ہے یہ خام خیالی ہے۔ اس سے پہلے کے موضوع سے اِدھر اُدھر ہو جاؤں میں مبارک باد دینا چاہوں گی منزہ کو۔ اس کو خود اپنی تلاش میں جو کامیابی ہوئی ہے ایک ہمت کی۔ اور ان کے سامنے ہمت کی دوسری مثال ان کی والدہ بیٹھی ہیں جو سنا ہے کہ دخل در معاملات کرتی ہیں۔ لیکن پھر بھی برداشت کی جاتی ہیں۔ بہت اچھی بات ہے لیکن وہ بھی بہت مثبت پہلو سے کرتی ہوں گی، کوئی برا نہیں مانتا ہوگا۔ آپ کی موجودگی میرا خیال ہے سب کے لیے، ادارے کے لیے، منزہ کے لیے بہت ہمت افزائی کی بات ہے۔ آپ کو یہاں دیکھ کے بہت خوشی ہوئی اور بہت اچھے مہمان میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ بہت دل خوش ہوا ان کو دیکھ کے اور آج جن کے ہاتھ میں یہ ایوارڈ جائیں گے ان کو پہلے سے مبارک باد اور منزہ آپ کی کتاب سامنے رکھی ہے اس کی بھی رونمائی ہے۔ اس میں سے جو کالم پڑھے گئے بہت جاندار تھے اور ایک مثبت پیغام دیتے ہیں۔ آپ کو بہت مبارک باد۔ ہم آپ کی ایسی اور بہت سی تحریروں کے منتظر رہیں گے۔ میری عزت افزائی کے لیے بھی بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس تقریب کے لیے منتخب کیا اور یہاں پر جو ایک سنہرا ہاتھ، سنہرے قلم کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ یہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی دسویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن ال کے

ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ ام فروا، ام زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ ام فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید ام فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد ام فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ ام فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اہل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن اہل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

''ہیلو ماہی۔''

''کیسے ہو شان؟''

''بہت مزے میں۔'' وہ ہنسا۔ لیکن اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

''کیا کر رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں بیٹھی ہوئی تھی لان میں۔'' جواباً وہ بھی زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں بھی کہاں زندگی کی کھنک تھی۔

''تمہیں بتایا تھا نہ شام سات بجے کی میری فلائٹ ہے۔ اب نو بجے کا ہے۔'' وہ دل چاہنے کے باوجود بھی نہ کہہ سکا۔ ''ماہی تم آ جاؤ۔ تم میرے لیے دعا کرو گی ناں۔''

''کیوں نہیں تم ہر لمحہ میری دعاؤں میں رہو گے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' کاشان احمد کی آواز کی اداسی ماہین سے چھپ نہ پائی تھی۔

''شان تم اپنا بہت خیال رکھنا۔''

''ہاں ماہی ضرور رکھوں گا تم جو کہہ رہی ہو۔ تمہاری بات رد نہیں کر پاؤں گا۔''

''یقیناً پروموشن کے ساتھ لوٹو گے وہاں سے۔''

''اسی لیے تو جا رہا ہوں۔ ورنہ اپنا ملک چھوڑنے کو کہاں دل چاہتا ہے۔ ایسے پیارے لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' اچانک اس کا گلا رندھ گیا اور آواز بیٹھ رہی تھی۔ وہ دوبارہ بولا۔

''سب اپنوں کے لیے ضرور لوٹ کر آؤں گا۔ انشاء اللہ بشرط زندگی رہی تو۔''

''شان تم جلد لوٹو گے پھر ہم سبھی دوست خوب ہلہ گلہ کریں گے۔ چلو وی آئی پی قسم کا ڈنر میری طرف سے ابھی سے پکا۔'' اس نے خشک ماحول میں قدرے تازگی بھرنے کی کوشش کی۔

''ماہی تم ماما، پاپا کی خیریت معلوم کرتی رہنا۔''

''شان یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' ماہین منتظر رہی کہ وہ ایک بار تو کہہ دے۔ ماہی مجھے خدا حافظ کہنے

آ جاؤ۔ لیکن کاشان نے ایسا کچھ نہ کہا۔ اگر دوبارہ سے دونوں کا سامنا ہو جاتا۔ تو حوصلے بکھر جاتے۔

''سنو ماہی جب میں یاد آؤں تو بچپن کے وہ سندر دن یاد کرنا، جب ہم تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے اور میں اپنے حصے کے تمام جگنو تمہاری مٹھی میں بھر دیا کرتا تھا۔'' وہ کب سے پلکوں کو بھگوتے آنسو آنکھوں کے اندر جبراً روکے تھی۔

''ماہی تمہارے جانے کے بعد ماما بہت ڈسٹرب رہیں۔ جوں جوں میرے جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہیں۔''

''ڈونٹ وری شان۔ وقت کے ساتھ ساتھ خوب بخود سنبھل جائیں گی۔''

''ہوں۔ سنو ماہی اپنا بہت خیال رکھنا۔ اوکے پھر اللہ حافظ جو تھوڑا ٹائم ہے وہ ماما اور پاپا کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

''شان فی امان اللہ۔'' وہ مخملی گھاس پر زور زور سے اپنے نوکیلے ناخن گاڑ رہی تھی۔

☆......☆......☆

امل کی شادی خوش اسلوبی سے انجام پا چکی تھی۔ میجر محمد علی بہت خوش تھے۔ ساس، سسر، نندیں سبھی امل پر واری صدقے جا رہے تھے۔ محمد علی بہت اچھی نیچر کے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ شادی سے پہلے امل خوش نہیں تھی۔ بار بار اُسے مدثر حسین کا خیال پریشان کرتا۔ اس نے خود کو لاکھ سمجھایا لیکن یہ پاگل دل کسی کی کہاں سُنتا ہے، ہمیشہ اپنی من مانی کرتا ہے۔

امل اکثر خود سے باز پرس کرتی۔ ''مدثر حسین کو سوچنا کیوں نہیں چھوڑ رہی ہو۔ وہ تمہارا ماضی تھا جو تاریکیوں کے دشت میں مدفن ہو چکا ہے۔ اب بار بار اُس کی مٹی مت کھرچو بلکہ اُس کی لحد پر فاتحہ پڑھ کر ہمیشہ کے لیے بری الذمہ ہو جاؤ، پھر اُس ماضی کو کبھی نہ کریدنے کے لیے۔ امل ایک روشن صبح کا نرم اُجالا تمہارا منتظر ہے۔ آگے بڑھ کر خوشی سے اُسے گلے لگالو۔ اسی میں تمہاری اور تم سے جڑے بہت سارے لوگوں کے لیے سکون و بقا ہے۔''

محمد علی نے ایک وقار عزت و تکریم کے ساتھ امل کو اپنی محبتوں کی پناہوں میں سمیٹا کہ واقعی وہ وقتی طور پر مدثر حسین کو بھول گئی۔ اُسے اپنے آج میں جینا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے محمد علی اسے ہنی مون کے لیے مختلف پُر فضا مقامات پر لے گئے۔ گریس فل محمد علی کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی۔ وہ مدثر حسین کو بھولنے لگی تھی۔ کچھ امل کی اپنی بھی کوشش تھی ماضی کو بھول جانے کی۔ محمد علی اس کے کزن تھے اور منگنی بھی دونوں کی رضامندی سے ہوئی تھی۔ امل کی خواہش پر ہی تو انہوں نے آرمی جوائن کی تھی کیونکہ آرمی لائف کو امل آئیڈیلائز کرتی تھی۔ چند روز بعد وہ میجر محمد علی کے ساتھ کھاریاں آگئی جہاں اُن کی پوسٹنگ تھی۔

☆......☆......☆

آج پھر فیری ماں نے بلال حمید کو بلایا تھا۔

''السلام علیکم فیری ماں۔'' دیوانِ خاص میں آکر فیری کے قریب آتے ہوئے بلال حمید نے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

فیری بلال حمید کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔ فیری بلال حمید سے بہت خوش تھی۔ وہ اچھا مال ہی اُسے لا کر دیتا تھا۔ اس بار بلال حمید نے جو ہیرا اٹھا شا تھا وہ کروڑوں سے کم نہیں تھا۔ اس وجہ سے بلال حمید پر زیادہ پریشر نہیں ڈال رہی تھی۔ وہ جانتی تھی بلال حمید اپنے کام میں کبھی ہیرا پھیری نہیں کرتا، ہمیشہ ایمانداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی لیے تو بلال حمید کو اجرت دیتے ہوئے اُس کے دل میں گرہیں نہ پڑتی تھیں۔ اس بار بھی اُمِ فروا کو دیکھنے کے بعد دس لاکھ اجرت بلال حمید کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ چار لاکھ اُسے دے چکی تھی باقی چھ لاکھ اُمِ فروا کی بولی لگنے پر اسے ملنے تھے۔ وہ کبھی فیری کو پیسے فوری دینے کے لیے تنگ نہیں کرتا تھا۔ جتنا فیری ایڈوانس دے دیتی وہ خوشی خوشی لے لیتا ورنہ عنصر، سمیرا، زین وغیرہ بک بک ضرور کرتے تب فیری ماں اپنی مخصوص لینگویج میں اُنہیں خوب گالیاں دیتی۔ فیری ماں کی جیب سے پیسے بہت مشکل سے نکلتے تھے۔ منہ پھٹ عنصر تو کہہ ہی دیتا۔

”فیری ماں تم نے اس قدر کثیر تعداد میں حرام کی کمائی جمع کر رکھی ہے۔ اتنی دولت کا کرو گی کیا۔ تمہارا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ نا بیٹا، نا بیٹی پھر کس لیے اتنی دولت اکٹھی کر رہی ہو۔“

”تیرا مقبرہ بنواؤں گی تاج محل جیسا۔ آخر اُس پر پیسا تو لگے گا ناں۔“

”فیری ماں تُو مجھے چھوڑ اپنے لیے لاہور کے شالیمار باغ میں اپنے مزار کے لیے جگہ خرید لے۔ چلو اگر تم کہو گی تو میں تمہارے عالی شان مزار کا مجاور بن جاؤں گا۔ اگر تم کہو تو پیرنی فیروزہ ملک کے نام کی تختی بھی لکھوا دوں گا۔ میری بھی وہاں سے کمائی ہوتی رہے گی۔ بھئی لوگ چڑھاوے تو چڑھائیں گے نا پیرنی فیروزہ ملک کے مزار پر۔“ قریب بیٹھی سب لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

”عنصر تُو بہت بک بک کرنے لگا ہے۔“ فیری ٹھٹھا مار کر ہنسی۔ وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مناتی تھی کیونکہ ان سب کو وہ اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھی۔ اس کام میں آئے اُسے کتنے ماہ و سال بیت چکے تھے اب تو اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ زمانے بیت گئے تھے، یہ سیاہ کاریاں کرتے ہوئے۔ لیکن ایک دن بھی ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہونا اس نے پسند نہ کیا۔ جس دلدل میں اس کے پیر جم چکے تھے وہاں سے نکلنا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اپنے دل پر فریب کی چربی چڑھائے رکھی تھی۔ وہ کیوں سوچتی کہ ایک دن اُسے خدا کے حضور بھی پیشی دینی ہے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے فیری ماں نے اپنے سامنے بیٹھے بلال حمید کی طرف دیکھا۔

”بالو جب تک تمہیں بلاؤں نہیں تم آتے نہیں ہو۔ لگتا ہے آج کل غیر معمولی مصروفیات اپنا رکھی ہیں تم نے؟“

”فیری ماں جو تم سوچ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو بلال حمید اپنے کام میں کبھی ہیرا پھیری نہیں کرتا۔ آزمائش شرط ہے۔“

”بالو بہت بار تمہیں جانچ چکی ہوں اسی لیے تو تم پر سب سے زیادہ بھروسا کرتی ہوں۔“ فیری ماں نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

”پیو گا سگریٹ؟“

”میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دی ہے۔“

”بالو تم نے سگریٹ چھوڑ دی ہے..... واہ بھئی واہ۔“ وہ اپنے اوپر دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے

بولی۔
"یہ بتا لڑکی کو شک تو نہیں ہو گیا۔"
"بھلا اُسے کیونکر شک ہو گا۔" بلال حمید۔ لاپروائی سے انجان انداز میں بولا۔
"بالو اُس کا شوہر ہوتے ہوئے تم اُس سے دور رہ رہے ہو، اس بارے میں تو اُس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کیونکہ ہر لڑکی نئی زندگی کے خواب بنتی ہے۔"
"فیری ماں وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند، نیک اور سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ میں نے اُسے باتوں باتوں میں جتلا دیا ہے کہ مجھے یرقان ہو گیا تھا۔ حکیم کی دوائیں کھا رہا ہوں۔ چھ مہینے کا کورس پورا کرنے تک مجھے بے احتیاطی نہیں کرنی۔"
"واہ بھئی بالو! تُو تو بڑا تیز ہے۔ کیا وہ تمہاری بات مان گئی ہے؟"
"ہاں سمجھ دار لڑکی ہے۔ فیری ماں۔ وہ ایک نیک مولوی کی بیٹی ہے۔ خاوند کے رتبے کو خوب پہچانتی ہے۔"
"بالو لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ پوری آفت ہے۔ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹتی۔ اگر کوئی اس کی کروڑ سے اوپر کی بولی دے تو اپنے وارے نیارے ہو جائیں گے۔"
"فیری ماں تم فکر نہیں کرو انشاء اللہ بولی بہت آگے تک جائے گی بس تم صبر اور تھوڑا انتظار کرو۔"
"بالو تمہیں میں نے لڑکی کی تصویریں دی تھیں، کیا بنا اسی کام کے لیے تو تمہیں بلایا تھا۔"
"فیری ماں وہ پانچوں تصاویر میں نے اس ملک کے امیر کبیر رئیسوں تک بھجوا دی ہیں۔ مجھے امید ہے وہ لڑکی دیکھتے ہی اس کی بولی بڑھا دیں گے۔ پانچوں کو اکٹھا بلا کر بولی لگوائیں گے۔ کوئی وڈیرا ملک سے باہر ہے تو کوئی اپنی ریاست کے کاموں میں بہت مصروف ہے۔ کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ صبر تو اب کرنا پڑے گا فیری ماں۔" بلال حمید چہرے پر بیوپاری مکروہ چہرہ چڑھائے بول رہا تھا۔ لیکن اندر سے خود کو کوس رہا تھا کہ اس باعزت عصمت والی لڑکی کے متعلق میں ایسی گھٹیا زبان استعمال کر رہا ہوں۔"
"بالو اب یہ کام جلدی ہو جانا چاہیے۔"
"فیری ماں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے میں کہہ رہا ہوں ناں کچھ صبر کر جاؤ، میں بھی اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ اچھے رزلٹ کے لیے انتظار تو کرنا پڑے گا۔ فیری ماں ایک اور بات وہ یہ کہ ایک اور لڑکی بھی میری نظر میں ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ صرف سولہ سال کی ہے۔ اُس کے لیے بھی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر وہاں کام بن جائے تو کیا بات ہے۔" وہ فیری کی توجہ اُم فروا سے ہٹا کر دوسری طرف لگانا چاہتا تھا تاکہ فیری ہر وقت اُم فروا کے لیے اُسے پریشان نہ کرے۔ وہ جلد محفوظ جگہ پہنچ جائے۔
"کہاں رہتی ہے وہ نئی لڑکی؟" واقعی وہ نئی لڑکی کا سُن کر خوشی میں تھوڑی دیر کے لیے اُم فروا کو بھول گئی تھی۔
"آج کل تو لاہور ہی میں ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"آئی ہری پور ہزارہ سے ہے۔ اسمگل ہو کر آئی ہے۔"
"دھوکے سے لائی گئی ہے کیا؟" آنٹی فیری تو ہمیشہ گمان کی گود میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ بلال حمید کو محتاط ہونے کا مبہم سا اشارہ تھا۔

''دو ہزار پانچ کے زلزلے میں اس کا پورا خاندان ختم ہو گیا تھا وہ بچی معجزانہ طور پر بچ گئی۔ اُس کی خالہ جو لاہور میں فیکٹری ایریا کے علاقہ میں رہتی تھی۔ وہ اُسے اپنے پاس لے آئی۔ اب وہ بچی جوان ہو چکی ہے۔ اصلی جدی پشتی خاندانی پٹھان ہے۔ اس کی خالہ اُس لڑکی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کسی کے ذریعے بات آگے چلائی ہے۔ اس لڑکی کے عوض اس کی خالہ ایک لاکھ مانگ رہی ہے۔ تب وہ اُس کا نکاح مجھ سے کردے گی۔ میں نے اُسّی ہزار کہا ہے۔ غریب عورت ہے، اُمید ہے مان جائے گی۔ فیری ماں لڑکی بہت زیادہ خوبصورت ہے۔''

''تم نے دیکھی ہے؟''

''وہ...... ہاں...... ہاں میرے دوست نے مجھے دکھائی ہے۔'' اس نے مزید جھوٹ بولا وہ ایک گھڑی گھڑی فرضی کہانی سُنا رہا تھا۔ جس کے جھوٹ در جھوٹ سے گونگے لمحے بھی تپھلنے لگے تھے۔

فیری ماں بلال حمید کی عیاریوں کو سچ تصور کر رہی تھی۔ بلال حمید کا جھوٹ فیری کے سینے پر کڑکڑاتے نوٹوں کی طرح کر رہا تھا۔

''کسی دن میں آپ کو لے چلوں گا۔ آپ بھی اُس پری وش کو دیکھ لینا اور اُس کی خالہ سے رقم کی بات بھی کر لینا۔ میں جانتا ہوں اُس کے تم مجھے بیس لاکھ تو ضرور دو گی۔ اُس کا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ بے شک تم اُسے اردن، شام، سعودیہ کے شاہی خاندان کے کسی بگڑے ہوئے شہزادے کو سونپ دینا۔ تمہیں دولت سے مالا مال کر دے گا۔ ممکن ہے وہ اس حسینہ کو اپنی بیوی بنا لے۔ ممکن ہے تب ایک نیک کام تمہارے اور میرے حصے میں آجائے اور وہ بچ گئی تو شاید ہماری آخرت سنور جائے۔''

وہ فیری کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اُم فروا کا دھیان فیری کے ذہن سے نکال رہا تھا اور وہ بھی دلچسپی سے بلال حمید کی باتیں سُن رہی تھی۔

''بالو تمہارا یہ آئیڈیا پسند آیا ہے کہ اُسے بھاری رقم کے عوض کسی شاہی خاندان کے حوالے کر دیا جائے۔'' فیری کا حرص اچانک بڑھنے لگا تھا۔ واقعی اس وقت وہ اُم فروا کو بھولی بیٹھی تھی۔ جس کے لیے آج فیری ماں نے بلال حمید کو بلایا تھا۔

بلال حمید بھی یہی چاہتا تھا کہ فیری کے ذہن سے اُم فروا نکل جائے اور وہ اُسے کسی محفوظ مقام پر پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ جو چار لاکھ اُس نے فیری ماں سے لیے تھے۔ وہ اس نے بینک سے نکلوا کر گھر میں محفوظ کر لیے تھے۔ یہ رقم کسی بھی وقت فیری کو واپس کر کے وہ اپنا معاہدہ ختم کر سکتا تھا۔ اُسے بہت سوچ بچار کے بعد لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ وہ سوچتا فیری بہت ہی بُری عورت ہے۔ اُم فروا کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اس کی چھوٹی بہن اُم زارا بھی جوان اور بے حد خوبصورت ہے۔ رقابت میں اُسے نہ اپنے قبضے میں کر لے۔

''یہ لڑکیاں کہاں ہیں؟'' بلال حمید نے موضوع بدلا۔

''غزل اور نوری۔ رات کو کسی بیوروکریٹ کے بیٹے کی دعوت ولیمہ کے فنکشن سے صبح ہی آئی ہیں۔ ابھی تک سوئی پڑی ہیں۔ ڈولی اور نیلی وڈیرے شاہ زمان بلوچ کی حویلی میں ہیں۔''

بات مکمل کرنے کے بعد فیری چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ بھرے ہوئے تھی۔ وہ دوسرا سگریٹ سلگانے لگی۔ جانے اس عورت کو اس قدر طمانیت کیوں محسوس ہوتی تھی اس دھندے سے۔

اس وقت بلال حمید کو اُس سے شدید گھن محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن فیری ماں اس کام کو معیوب نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اکثر کہتی سنی جاتی۔ خدا ہماری مجبوریاں دیکھ رہا ہے۔ معاشرے کے انہی مردوں نے ہمیں یہ راہیں دکھائی ہیں۔'' فیری ماں خود کو جھوٹی تسلیاں دیتی اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی۔

''خدا ہی انصاف کرنے والا ہے۔'' وہ اوپر نظریں اُٹھا کر کہتی۔ وہ کم فہم عورت یہ نہ سمجھتی تھی خدا سے کبھی بھی انصاف نہ مانگو۔ اگر مانگنا ہی ہے تو رحم مانگو۔ اگر رب انصاف کرنے پر آ گیا تو ہمیں چھپنے کے لیے کوئی پناہ نہیں ملے گی۔ ہمارا اعمال نامہ تو گناہوں سے سیاہ ہوا پڑا ہے۔ ہمیں تو اُس کی طرف سے رحم چاہیے۔ فیری ماں ہر بار، سزا و جزا کا تجزیہ اپنی خودی کے زنداں میں جکڑے ہوئے ہی کرتی تھی۔

''فیری ماں غزل اب تو تنگ نہیں کرتی۔'' فیری کو گہری سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر بلال حمید نے ٹاپک بدلا۔

''شروع میں تو اس نے میرا بڑا خون جلایا ہے۔ ایک معروف آدمی کے چہرے پر تھوک دیا تھا۔ تب اُس نے غزل کی خوب پٹائی کی تھی اور پھر اُسے میرے پاس لے آیا۔ میں نے بھی اُس موٹے سانڈ کو خوش کرنے کے لیے بے چاری کو بہت مارا۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے میں نے ایسا ناروا سلوک اس بچی سے کیوں کیا۔ آخر یہ لڑکیاں بھی انسان ہیں۔ تنگ پڑ جاتی ہیں، گھبراتی ہیں ان جنونی جنگلی بھیڑیوں سے۔''

سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کے بیچ الگا فیری کا چہرہ بلال حمید گھور رہا تھا جس پر آج اُداسی چھلک رہی تھی۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے رنج و الم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ بلال حمید نے آج سے پہلے فیری کو اس طرح مضطرب نہیں دیکھا تھا اب کی بار وہ آہستگی سے ہونٹوں کے درمیان سے دھواں نکال رہی تھی۔

اس وقت فیری ماں خاصی افسردگی میں گھری ہوئی تھی۔ بلال حمید دل ہی دل میں اس عورت کی خود غرضی کو بددعائیں دے رہا تھا۔ اسے ظالم عورت کا خطاب دے رہا تھا۔ قصاب کی اولاد گردان رہا تھا۔ ابھی تک فیری کے دماغ میں غزل گھسی ہوئی تھی۔

''اب میں غزل کو گائیکی کی محفلوں میں بھیج دیتی ہوں اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اک سماں باندھ دیتی ہے۔ غزل اب مجھ سے بہت خوش ہے۔ مجھے اپنی ماں کا درجہ دیتی ہے۔ مجھے بھی یہ تمام لڑکیاں اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں۔''

وہ اس طرف کیسے آئی تھی۔ فیری نے تھوڑا بتا رکھا تھا بلال حمید کو۔ وہ اکثر جب شدید انتشار کا شکار ہوتی تو ٹھنڈی کوکین سپ سپ حلق میں اُتارتی رہتی جو دھیرے دھیرے اس کے دماغ کو سن کرتی اس پر غنودگی طاری کر دیتی۔ اس وقت فیری نے اپنے متعلق اول فول بکے تھے کہ کیسے اس کے شوہر آرنڈ ولیم نے فیری کو اپنے باس کے پاس بھیجا تھا سجا سنوار کر۔ وہ پستہ قد کالا آدمی۔ بلے جیسی بھوری خوف ناک آنکھوں اور بھدے جسم والا۔

اس وقت فیری کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں یہ پہلا موقع تھا جو اُس نے فیری ماں کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔ ''تب میں نے بہت بڑا فیصلہ کر لیا کہ اب میری عزت پر داغ تو لگ ہی چکا ہے۔ جسے میں اب چھپا نہیں سکتی۔ اگر دنیا سے چھپا لو لیکن گاڈ یسوع فادر اور اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتی۔ چلو پھر ایسے تو ایسے ہی سہی۔ تب میں نے اُس بلے کی آنکھوں والے پستہ قد شخص کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹی۔''

فیری ماں اچانک خاموش ہو گئی تھی۔ فیری نے پھر اور کوئی بات نہ کی۔ تب اچانک بلال حمید فیری ماں کے لیے دکھی ہو گیا۔

"ٹھیک کہتے ہیں، کوئی پیدائشی برا نہیں ہوتا۔ نا مساعد حالات اور معاشرہ اسے بدترین بنا دیتا ہے۔"
فیری نے بلال حمید کو اشارے سے کہا تم اب یہاں سے جاؤ۔ وہ خاموشی سے اُٹھا اور دیوان خانے سے باہر نکل گیا۔ جو صرف فیری کے ہاں رہنے والی لڑکیوں اور فیری کے ساتھ کام کرنے والے تینوں لڑکوں کے لیے تھا۔ جہاں دن کا بیشتر حصہ گزارہ جاتا تھا۔ ایوانِ خاص مخصوص مہمانوں کے لیے تھا۔ جن کا دیوان خانے کی طرف آنا منع تھا۔
جب بلال حمید گھر پہنچا تو اُم فروا اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مغرب کی نماز سے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔ سفید بڑے سے دوپٹے کو ماتھے تک لیے ہوئے تھی۔ اُس کی کمان بھنویں اُس میں سے جھانک رہی تھیں۔ سیاہ گھنیری پلکوں والی آنکھیں، جن میں کاجل کی دھار کمال لگ رہی تھی۔ گلابی عارضوں پر گلابی ہونٹ۔ اس سادگی میں اُسے اور خوبصورت بنا گئے تھے۔
"آپ نے بہت دیر کر دی۔" بلال حمید کو اندر آتا دیکھ کر اُم فروا بولی۔
"ایک دوست کے پاس بیٹھ گیا تھا۔" صبح کے ناشتے کے سامان کا شاپر بلال حمید نے اُمِ فروا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔
"مغرب کی نماز پڑھ لی آپ نے؟" اُم فروا نے بلال حمید کو آگے بڑھتے ہوئے روک کر پوچھا۔
"راستے میں تھا، نہیں پڑھ سکا۔"
"ابھی وقت ہے آپ جلدی سے وضو کر کے پڑھ لیں۔" اُم فروا نے نرم مسکراہٹ سے بلال حمید کو کہا۔ جواباً اُس نے بھی خنداں مسکان سے اُم فروا کو دیکھا۔ تب وہ دل ہی دل میں مہکتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ڈبل روٹی اور جیم کی بوتل اُس نے فریج میں رکھی۔ انڈے براؤن لفافے میں سے نکال کر پلاسٹک کی ٹوکری میں ڈالے اور دھونے کے لیے سنک میں رکھے۔ ایک ایک انڈا اچھی طرح دھو کر دوسری ٹوکری میں رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لاؤنج میں آئی تو بلال حمید نماز پڑھ کر آ چکا تھا۔
"سنیں جی۔" وہ بلال حمید کے قریب آ گئی۔
"فرمایئے بیگم صاحبہ۔"
"آپ کوشش کیا کریں باجماعت نماز پڑھنے کی۔"
"بہت بہتر کوئی اور حکم۔"
"اگر آپ میری یہ درخواست اللہ کا دیا گیا حکم سمجھ کر مان لیں تو تاحیات آپ کی ممنون رہوں گی۔"
"مشکور بھی رہو گی۔" بلال حمید نے اس کی مشکل اردو میں ایک لفظ کا مزید اضافہ کیا۔
"جی بالکل۔" وہ بے ساختہ ہنسی تو گالوں پر گہرا بھنور بنتا چلا گیا۔ بلال حمید اُسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ وہ تو ہر روپ میں یکتا تھی۔ بے خودی میں بلال حمید نے اپنے قریب بیٹھی اُم فروا کا ملائم سپید ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہچکچائی۔
"فروا گھبرا کیوں رہی ہو۔"
"ہم ابھی اتنے فری نہیں ہوئے ناں۔" اچانک اُس کے منہ سے بے خودی میں نکلا۔ وہ کھسیانا ہو کر مسکراتے ہوئے خجل ہوا۔
"فرو میں شرمندہ ہوں کہ میں تم سے اب تک کلوز نہیں ہو سکا۔ حکیم صاحب کا کورس پورا ہونے میں ابھی چند

ماہ باقی ہیں۔" بلال حمید تائیدی انداز میں بولا۔

"وہ جی میں معافی چاہتی ہوں، بس نادانستگی میں کہہ گئی ہوں۔" بلال حمید نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے آنکھوں کو جنبش دی۔ اُس کے ہونٹوں کے کناروں پر اب بھی معنی خیز مسکان ٹھہرتی ہوئی تھی۔

"تمہیں میری محبت پر بھروسا ہے ناں؟"

"بہت زیادہ۔" اب بلال حمید اُسے آہستہ آہستہ اپنے قریب کر رہا تھا۔ اُس نے اُمِ فروا کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

"فروبہ بلال حمید تمہیں بہت چاہتا ہے اتنا کہ کہنے کے لیے الفاظ ناپید ہو جائیں، وقت تھم جائے۔ زمین اپنے محور پر چلتی ساکت ہو جائے، چاند، سورج بھول بھلیوں میں کھو جائیں۔ ان تمام باتوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے میری محبت۔ وہ اُنس جو مجھے تم سے ہے......" تبھی جذبات سے مغلوب ہو کر بلال حمید نے اپنے سلگتے ہونٹ اُمِ فروا کی آنکھوں پر رکھ دیے تھے۔ وہ تو کب سے ایسی ارفع ساعتوں کی منتظر تھی۔ وہ دم سادھے اپنے عزیز از جاں شوہر کی محبت کو اپنی روح میں سموتی رہی۔ اُس کے اندر کے اُداس موسم ایک دم گنگناتے کھل اٹھے تھے۔

"فروجان میں خود کب تم سے دور رہنا چاہتا ہوں، بس چند مجبوریاں ہیں۔ دعا کرو وہ ختم ہو جائیں۔ تب جنگل میں موروں کے رقص جیسا احساس ہماری زندگی میں امنڈ آئے گا۔" پاگل دل تھا کہ اُمِ فروا کی تمنا کیے جا رہا تھا۔ بلال حمید نے دل سے مجبور ہو کر اُس کے لرزتے وجود کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ گرفت مزید تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک جب ہوش آیا تو وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا۔ اُمِ فروا نے توقف بعد جھکی جھکی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ بلال حمید کی مے کش آنکھوں میں اب بھی گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

"میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" وہ نیچے ڈھلک جانے والا دوپٹا اٹھاتی تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں کی جلن مزید بڑھ گئی تھی۔ اُس کا دل چیخ رہا تھا مگر بلال حمید کو ہر صورت ثابت قدم رہنا تھا اور جلد اس اچھی لڑکی کی فلاح کے لیے کچھ مثبت کرنا تھا۔

ان کی شادی کو پندرہ دن ہو چکے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگ رہا تھا۔ اُمِ فروا، بلال حمید کا بہت خیال رکھتی۔ بلال حمید کی بھی کوشش ہوتی زیادہ وقت اُمِ فروا کے ساتھ گزارے۔

بلال حمید نے خدا کی رحمت کو پکارتے ہوئے گڑگڑا کر رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی، توبہ کی تھی۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گناہوں میں لتھڑی یہ زندگی چھوڑ کر، نوکری تلاش کرے گا۔ لیکن سب سے پہلے اُمِ فروا کو فیری کے چنگل سے آزاد کرانا تھا۔ جس کے لیے ہر وقت اُس کا دماغ پلاننگ کرتا رہتا، رب کے حضور گڑگڑا کر فریاد کرتا۔ "مالک کوئی معجزہ دکھادے رحم فرمادے رب کائنات مالک دوجہاں۔"

وہ رب سوہنے کے کرم کا منتظر تھا۔

☆......☆......☆

اُس روز مولوی ابراہیم، بے بے جی اور اُمِ زارا اس سے ملنے آئے تھے۔ بے بے جی، اُمِ فروا کے لیے بہت کچھ لے کر آئی تھیں۔ وہ اُمِ فروا کا گھر دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ مکمل طور پر فرنیشڈ فلیٹ تھا، جو روشن اور ہوا دار بھی تھا اور اچھے طریقے کا بنا ہوا تھا۔ بلال حمید اُمِ فروا کا خیال رکھتا ہے۔ اس احساس سے مولوی ابراہیم اور بے بے جی مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ اُمِ فروا نے پُرتکلف کھانا تیار کیا تھا۔ بلال حمید باہر سے بھی کافی چیزیں

لے آیا تھا۔ مولوی ابراہیم اور بے بے جی بار بار منع کرتے رہے کہ بیٹا اتنی تکلیف نہ کرو۔ ہم صرف اُم فروا سے ملنے آئے ہیں۔ بیٹیوں کے گھر کچھ نہیں کھانا چاہیے۔ ہم تمہاری محبت میں رُک گئے ہیں کہ کہیں تم محسوس نہ کرو۔"

"بے بے جی میں آپ کا داماد نہیں بیٹا ہوں اور بیٹوں کے گھر والدین خوشی خوشی کھاتے پیتے ہیں۔" تب وہ لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

شام کو وہ واپسی کے لیے تیار ہوئے تو بلال حمید نے اُم فروا سے کہا۔

"اُم زارا کو دو دن کے لیے روک لو۔ تم اکیلی بور ہوتی ہو تمہیں کمپنی مل جائے گی۔" اُم فروا بھی یہی چاہ رہی تھی کہ اُم زارا دو چار دن کے لیے رُک جائے وہ اُم زارا کے لیے خاصی اُداس تھی۔ لیکن وہ یہ سوچ کر نہ کہہ سکی کہ کہیں بلال حمید محسوس نہ کرے کہ اب سسرالی اس کے گھر رہنے بھی آ گئے ہیں۔ وہ بلال حمید کی طرف سے اجازت ملنے پر خوش ہو گئی تھی۔ وہ مولوی ابراہیم اور بے بے جی کی منتیں کرنے لگی۔

"دو دن کے لیے اُم زارا کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔ دو دن بعد ہم خود اُم زارا کو چھوڑ آئیں گے۔" مولوی ابراہیم اور بے بے جی کا دل نہیں مان رہا تھا۔ بلال حمید بہنوئی ضرور تھا لیکن اُم زارا کے لیے غیر محرم تھا۔ اُم فروا کا ملتجی لہجہ دیکھ کر وہ مان گئے تھے اور اُم زارا کو دو دن کے لیے چھوڑ کر خود چلے گئے۔

اُم فروا بہت خوش تھی۔ بلال حمید عشاء کی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا تھا۔ ان دونوں بہنوں نے عشاء کی نماز ساتھ پڑھی اور پھر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئیں۔ اتنے دنوں کی دوری کے بعد اب انہیں باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُم فروا بلال حمید کی تعریفیں کرتی نہیں تھک رہی تھی۔

"اُم زارا وہ بہت اچھے ہیں۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے ہیں۔ دیکھو گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

"آپی وہ سب تو ٹھیک ہے پر اتنی ٹھاٹ پیسے کے بغیر تو ممکن نہیں۔ کیا کوئی بڑی جاب وغیرہ ہے بلال بھائی کے پاس؟"

"اُم زارا تمہیں معلوم تو ہے انہوں نے اپنے دو پلاٹ بیچ کر یہ فلیٹ خریدا ہے۔ بینک میں بھی رقم ہے۔ فلور مل والی جاب تو انہوں نے چھوڑ دی ہے۔ اب کہہ رہے ہیں قریبی مارکیٹ میں سیمنٹ کی ایجنسی میں پیسا لگائیں گے۔ اس میں خاصا پرافٹ ہے۔" اُم فروا کے لہجے میں محبت سے بلال حمید کا نام گھل رہا تھا۔ بلال حمید کے ذکر سے اس کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو جاتیں۔

"اُم زارا ابھی سے ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کی ہر بات آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔" اُم فروا کی آنکھوں کی جوت روشن ہو رہی تھی۔

"آپی آپ تو چند ہی دنوں میں بلال بھائی کی دیوانی ہو گئی ہیں۔"

"ہوں۔ وہ بھی میرے دیوانے ہیں۔" اُم فروا نے شرما کر کہا۔ اُم زارا بہن کا اس طرح شرمانا دیکھ کر مسکرائی۔

بلال حمید نماز پڑھ کر مسجد سے آ چکا تھا۔ اُم فروا نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ دوپہر کا بہت کچھ بچا ہوا تھا وہی کھانا اُس نے مائیکرو ویو میں گرم کر لیا تھا۔

کھانے کے بعد اُم فروا برتن سمیٹ کر کچن میں لے آئی تھی۔ بلال حمید ایک اسلامی کتاب پڑھنے میں محو ہو گیا جبکہ اُم زارا ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اُم فروا کچن سمیٹ کر لاؤنج میں آئی تب بیٹھنے سے پہلے اُس نے بلال حمید

اور اُم زارا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"آپ لوگ چائے پئیں گے؟"
"رہنے دو اُم زارا آئی ہوئی ہے، اسے آئس کریم کھلانے لے جاتے ہیں۔ چلو گی اُم زارا؟"
"رہنے دیں بلال بھائی۔" اُس نے اخلاقاً منع کر دیا۔ وہ ان پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔
"بہنا تکلف نہ کرو، تمہاری وجہ سے ہم بھی کھالیں گے۔ کیوں اُم فروا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔"
"جی۔"
"لیکن کھلائے گا کون؟" اُم زارا مسکرا کر گویا ہوئی۔
"آج تمہاری آپی سے کھائیں گے۔"
"ہاں بلال بھائی یہ ٹھیک ہے کیوں آپی؟"
"بھئی میں ہی کھلا دوں گی۔ میرے پاس جو پیسے ہیں وہ انہی کے دیے ہوئے ہیں۔" اُم فروا نے بلال حمید کی طرف دیکھا۔ بلال اُس کے اس طرح کہنے پر خوش ہو گیا اور اُم زارا کی نظر بچا کر آہستگی سے اُم فروا کا ہاتھ دبا دیا۔

☆......☆......☆

آئس کریم کھانے کے بعد وہ تینوں قریبی مارکیٹ میں چلے آئے تھے۔ اُم زارا کو یوں گھومنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس طرح کبھی گھر سے نہ نکلی تھیں۔ مولوی ابراہیم اور بے بے جی کو یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔ وہ گندے نالے کی جس بستی میں رہتی تھیں، وہاں تفریح کا کوئی مقام نہیں تھا۔ نہ ہی انہیں بچپن سے ایسی کوئی فضول عادت ڈالی گئی تھی۔
واپسی پر اُم زارا خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ چہل قدمی کرتے ہوئے جب وہ واپس گھر آئے تو اُم زارا کہہ رہی تھی۔
"آپی آپ تو مزے میں ہیں۔"
"انشاء اللہ تمہاری شادی بھی بہت اچھی جگہ پر ہوگی۔ میں خدا سے دُعا کروں گی ان جیسا ہی ہو تمہارا دُولہا۔" جبھی فلیٹ کا لاک کھولتے ہوئے بلال حمید چونکا۔ اُس نے جھرجھری لے کر پلٹ کے اُم فروا کو دیکھا۔ وہ بہن کو کیسی دعا دے رہی تھی۔
دوسری شام بلال حمید اُن دونوں کو موٹر بائیک پر بٹھا کر۔ انارکلی کی فوڈ اسٹریٹ لے آیا۔ اُم زارا نے منع بھی کیا کہ بلال بھائی رہنے دیں آپ اتنا تکلف نہ کریں۔
"گڑیا تم نے روز روز ہمارے گھر تھوڑی آنا ہے۔ دو دن کے لیے آئی ہو تو تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے۔ تمہارے بہانے ہم دونوں بھی گھوم لیں گے۔ ہم ہنی مون کے لیے تو جا نہیں سکے۔ بھئی اُم فروا اسی گھومنے کو ہنی مون سمجھ لو۔"
"سرتاج سمجھ لیا اور کوئی حکم؟" اس وقت اُم فروا خاصی شوخ ہو رہی تھی۔
"بلال بھائی دیکھا میری آپی کتنی تابعدار بیوی ہیں۔"
"چندا تمہاری آپی کا یہ شوہر نامدار بھی ہمیشہ ان کا تابعدار رہے گا۔"

''واہ کیا خوب سچویشن ہے۔'' اُم زارا مسکرائی۔ انہوں نے وہاں مزے دار کھانا کھایا۔ واپسی پر بلال حمید انہیں انارکلی بازار لے آیا۔ بلال حمید نے پانچ ہزار اُمِ فروا کو پکڑا دیے۔

''اُم زارا کو شاپنگ کرا دو۔''

''بلال بھائی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ پہلے ہی آپ نے بہت کیا ہے۔ میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔ آپ آپی کو لے کر دیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، بہن کو نہ لے کر دوں اور بیوی کو لے دوں۔'' وہ دونوں ہنس پڑیں۔

رات وہ کافی دیر سے واپس آئے تھے۔

اُس سے اگلے دن وہ دونوں اُم زارا کو اُس کے گھر چھوڑنے چلے گئے۔

''اُمِ فروا اگر تم یہاں رکنا چاہتی ہو تو رُک جاؤ کل آ کر میں تمہیں لے جاؤں گا۔''

''آپ بھی رُک جائیں۔''

''میں رُک تو جاتا لیکن ایجنسی کے سلسلے میں مجھے کچھ کام ہے۔'' بلال حمید نے بہانا بنایا۔ ''کل شام میں تمہیں آ کر لے جاؤں گا۔ خوش رہنا میں فون بھی کرتا رہوں گا۔'' وہ بلال حمید کو دروازے تک چھوڑنے آئی تو بلال نے اُس کی مرمریں کلائی پکڑ لی۔

''چھوڑیں ناں کوئی دیکھ لے گا۔''

''بھئی اپنی بیوی کی کلائی پکڑی ہے کسی غیر کی تو نہیں۔'' بلال حمید نے اُس کے دہکتے گال پر سیاہ لٹکتی لٹ اپنی اُنگلی پر لپیٹی اور آہستگی سے اُسے جھٹکا دے کر اُم فروا کا چہرہ اپنے اور قریب کر لیا۔ بلال حمید کی تیز پُرتپش سانسیں۔ اُمِ فروا کے جذبات سے لدے عارضوں کو سلگا گئیں۔

''فروا میں تمہیں بہت مس کروں گا۔''

''تو پھر رُک جائیں۔'' اُمِ فروا کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ جائے۔

''مجبوری ہے رُک نہیں سکتا۔''

''پھر جائیں دیر ہو رہی ہے۔''

''اچھا خدا حافظ۔''

''فی امان اللہ۔''

تب وہ موٹر بائیک گھسیٹا دروازے سے باہر نکل گیا۔ جب تک اُمِ فروا کو بائیک کی آواز سنائی دیتی رہی وہ دروازے کے اندرونی طرف کھڑی رہی۔ پھر وہ کنڈی لگا کر اندر آ گئی۔

☆......☆......☆

دو دن سے بلال حمید کی بائیک خراب تھی اور وہ گھر پر ہی تھا۔ اُم فروا سے مختلف نعتوں کی فرمائش کرتا رہا۔ بلال حمید جس نعت کا ذکر کرتا اُم فروا وہی سنا دیتی۔ کیا خوبصورت و سریلی آواز خدا نے اُسے عطا کی تھی۔ عشقِ رسول ﷺ کی محبت سے چُور اس کی آواز سحر طاری کر دیتی۔ جب وہ آنکھیں بند کر کے پورے جی جان سے نعت پڑھتی تو وقت تھم جاتا، بہتا پانی ساکن ہو جاتا، کھنکتی آواز اس کے ریشمی گلے کی حدود پار کرتی پارا پارا ہو کر فضا کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی۔ یہی حال بلال حمید کا تھا۔ اُم فروا کا اپنے آپ سے غافل ہو کر نعت پڑھنا بلال حمید کی

روح کے تار جھنجوڑے جاتا۔ وہ محویت سے آواز کے سحر میں کھویا رہتا۔ بلال حمید نے اُم فروا کی آواز سی ڈی میں ریکارڈ کرلی تھی۔ یہ خیال اُسے دکھی کردیتا تھا کہ جب چند دن بعد اُم فروا یہاں سے چلی جائے گی۔ تب میں اس کی آواز سُنا کروں گا۔ اس کے دل میں گرہ سی پڑ جاتی۔ وہ نعت پڑھتی اُم فروا کو گھورنے لگتا۔ جب وہ آنکھیں کھولتی تو عقیدت کے آنسو اُس کی پلکوں کی منڈیر پر لرز رہے ہوتے۔

گھر کا کچھ سودا سلف لینا تھا اور پیسے بھی ختم ہورہے تھے۔ وہ فیری ماں سے مزید رقم نہیں لینا چاہتا تھا۔ بائیک ورک شاپ میں تھا۔ اسے بینک بھی ضرور جانا تھا۔ وہ اُم فروا کو بتا کر رکشہ میں بینک چلا آیا۔

وہ کیش نکلوا کر یونہی بینک سے باہر نکلا۔ پارکنگ ایریا میں گیٹ کے نزدیک، سفید شلوار قمیض میں ملبوس شخص پر اُس کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہ اپنی بلیک زیرو میٹر کرولا کے پچھلے ٹائر پر جھکا ہوا تھا۔ جھکے جھکے یک لخت جیسے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوا اور جیب سے ٹشو پیپر نکال کر پیشانی کا پسینہ صاف کرکے ٹشو کا گولا بنا کر پھینکا۔ وہ گولا قریب سے گزرتے بلال حمید کے پاؤں کے درمیان آ کر رُک گیا۔ شفاف پوشاک والے شخص نے طائرانہ نگاہ معمولی لباس میں ملبوس اس شخص پر ڈالی۔ بلال حمید اُس اجنبی کے قریب آ گیا۔

''سر میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں؟''

''شکریہ۔'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ شاید ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ وہ جھکا اُسے کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔

''ہٹیے جناب میں ٹائر بدل دیتا ہوں۔'' بلال حمید نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ وہ شخص کھڑا ہوگیا اور بلال حمید پر سرسری نگاہ ڈالے، بنا کچھ بولے پیچھے ہوگیا۔ بلال حمید نے نہایت مہارت سے فٹافٹ ٹائر تبدیل کردیا اور پنکچر شدہ ٹائر گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا۔

''شکریہ۔'' بلال حمید سے یہ اُس کی پہلی بات تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' بلال حمید نے مسکرا کر جواب دیا اور ہاتھ جھاڑتا روڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ بلال حمید کے قریب سے گاڑی گزارتے ہوئے وہ سفید پوشاک والا شخص رُک گیا۔

''آپ پیدل جارہے ہیں؟'' وہ بلال حمید سے مخاطب تھا۔

''قریب سے رکشہ مل جائے گا۔''

''آیئے میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔''

''شکریہ میں رکشے میں چلا جاؤں گا۔''

''آپ نے میری مدد کی ہے، اب مجھے بھی موقع دیں۔ آیئے پلیز۔'' اس ڈیشنگ پرسنالٹی والے شخص نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بلال حمید کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ بلال حمید نے ایک بھرپور نگاہ اُس پر ڈالی، خاندانی لگ رہا تھا۔ شکل وصورت بھی رئیسوں جیسی تھی۔ یقیناً کسی وڈیرے کی اولاد ہے۔ اُس کی ڈارک براؤنش آنکھیں اُس کی گوری رنگت والے کتابی چہرے پر بہت سج رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے اُس نے خاموشی کا پردہ سرکایا۔ ''کہاں جانا ہے آپ کو؟''

''فیصل ٹاؤن۔''

''مجھے بھی وہیں سے گزرنا ہے۔ نام جان سکتا ہوں آپ کا؟'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے اُس نے بلال حمید

سے پوچھا۔

''بلال حمید۔''

''بلال حمید کیا کرتے ہو تم۔'' وہ اچانک آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ بلال حمید اُس کے اچانک سوال پر گڑبڑا سا گیا تھا۔

''فی الحال تو فارغ ہوں۔ کوئی کاروبار کرنے کا سوچ رہا ہوں۔''

''سر آپ مجھے لاہوریے تو نہیں لگ رہے۔'' اُسے دیکھتے ہوئے بلال حمید بولا۔

''یقیناً تم نے میرے لباس سے اندازہ لگایا ہے؟''

''جی بالکل۔''

''میں ضلع خوشاب کا رہنے والا ہوں۔''

''اچھا اچھا نام تو اس ضلع کا سُنا ہوا ہے وہاں ایک مشہور دربار بھی ہے کسی اولیا اللہ کا۔''

''ہاں بادشاواں دا دربار کہتے ہیں اُسے۔''

''جی...... جی بالکل۔'' وہ مسکرایا۔

''آپ جس زرخیز علاقے کے رہنے والے ہیں وہاں کے لوگ آپ ہی کی طرح جاذب نظر ہوں گے۔'' وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''سر آپ نے جواب نہیں دیا۔''

''بھئی بلال یہ تمہارا حسن نظر ہے ورنہ پورے پاکستان کے لوگ خوبصورت ہیں۔''

''یہ بھی آپ نے خوب کہا سر۔''

''مجھے بار بار سر کیوں کہہ رہے ہو۔ میرا نام ملک مصطفیٰ علی ہے۔''

''بہت خوبصورت نام ہے آپ کا، بالکل آپ کی طرح۔'' بلال حمید پھر تعریف کر گیا۔

''تم کچھ زیادہ تعریف نہیں کر گئے ہو۔'' ملک مصطفیٰ علی محظوظ ہوئے۔

''جناب میں ایک غریب آدمی ہوں، بھلا آپ کا نام کیسے لے سکتا ہوں۔''

''مجھے سر، ور کہلوانا پسند نہیں ہے۔''

''بڑی بات ہے ملک صاحب، ورنہ دولت مندوں کو اپنی عزت کرانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔''

''بلال یہاں پر سب نو دولتیے ہیں۔ جدی پشتی رئیس تو کم ہی رہ گئے ہیں۔'' فیصل ٹاؤن میں داخل ہوتے ہوئے بلال حمید انہیں اپنے گھر کی طرف جانے والی روڈ کا بتا تا رہا تھا۔

''بس آپ مجھے اسی مین روڈ پر اُتار دیں۔ سامنے ہی میرا فلیٹ ہے۔''

''میں تمہیں تمہارے گھر کے سامنے اُتار دیتا ہوں، اسی راستے سے مجھے آگے جانا ہے۔'' وہ مین روڈ سے ٹرن لیتے سامنے بنے فلیٹس کی طرف گاڑی موڑ کر لے گئے۔

''بس یہیں پر روک دیں سامنے ہی میرا فلیٹ ہے۔''

''کیا نمبر ہے تمہارے فلیٹ کا؟''

''نائن سی۔'' ملک مصطفیٰ علی نے گاڑی روک دی۔

''آیئے ناں چائے پلاتے ہیں آپ کو۔''

''شکریہ اس وقت تو مجھے جلدی جانا ہے۔ پھر کبھی کسی دن تمہارے ہاں چائے ضرور پئیں گے۔ اپنا سیل نمبر مجھے دے دو۔ تمہارے لیے نوکری کی کوشش کروں گا۔ کتنے پڑھے ہوئے ہو؟''

''بی ایس سی کیا ہے۔'' بلال حمید نے اپنا نمبر انہیں نوٹ کرایا جسے انہوں نے اپنے موبائل میں Save کر لیا۔

''میں اب تمہارے نمبر پر بیل دیتا ہوں تا کہ میرا نمبر تمہارے پاس آ جائے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بیل دی۔

''ملک صاحب آ گیا آپ کا نمبر۔''

''اچھا بلال۔'' ملک مصطفیٰ علی نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔ بلال حمید تیز تیز اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا تھوڑی دیر تک مستری کو پیسے دے کر بائیک لے آؤں۔ شام کو اُم فروا کے ساتھ جا کر گھر کا راشن بھی لانا ہے۔ وہ اس گھر کو ایسے اپنا سمجھ رہا تھا جیسے اُس نے اُم فروا کے ساتھ ہمیشہ یہاں پر رہنا ہے۔ دیکھنے میں تو ملک مصطفیٰ علی اچھے آدمی لگتے ہیں۔ میں نے کہا بھی نہیں اور میری نوکری کی بات کر رہے تھے۔ میں تب تک نوکری نہیں کر سکتا جب تک اُم فروا محفوظ نہ ہو جائے۔ جانے کب فیری اُم فروا کی واپسی کا مطالبہ کر دے۔ وہ یقیناً کسی تگڑے گاہک کے لیے کوشش کر رہی ہوگی۔''

یہ خیال آتے ہی وہ پھر پریشان ہو گیا۔ جب اُم فروا کو سچائی کا پتا چلے گا تو میں کیسے اُس کا سامنا کروں گا؟ مولوی ابراہیم کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں جنہیں ہر صورت مجھے فیس کرنا ہوگا۔ اب مجھے جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔ بار بار بلال حمید کے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کی آنکھوں میں مجھے سچائی دکھائی دی ہے۔ چہرے سے وہ ایک اچھا انسان معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک مددگار انسان لگتا ہے مجھے۔ میں نے صرف اُس کی گاڑی کا ٹائر بدلا تو وہ مجھے گھر تک چھوڑ گیا۔ مجھے نوکری کے لیے بھی کہہ دیا۔ اُس کے اندر ایک اچھا انسان ضرور ہے۔ اگر میں اُس سے مدد چاہوں؟ لیکن میں کیسے کسی اجنبی پر اعتبار کر کے اتنی بڑی بات کے سلسلے میں اُسے اپنا مددگار بنا سکتا ہوں۔ کہیں اُس کی نیت اُم فروا پر خراب نہ ہو جائے۔ وہ اُم فروا سے نکاح تو ہرگز نہیں کرے گا۔ ممکن ہے وہ شادی شدہ ہو۔ یہ وڈیرے، رئیس باہر کی عورتوں سے نکاح نہیں کرتے بلکہ انہیں رکھیل بنا کر ضرور رکھ لیتے ہیں۔ یہ لوگ صرف اپنی برادری کی لڑکیوں ہی سے شادیاں کرتے ہیں۔ ان امیرزادوں کی خاندانی بیویاں صرف وارث پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ پھر کیا کروں مجھے کسی نہ کسی پر تو بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ اللہ پاک تُو مدد فرما۔ رحم کر دے۔ کوئی فرشتہ صفت انسان بھیج دے، جو فیری کے شر سے اُم فروا کو بچا لے اور اُم فروا سے نکاح کر لے۔ حقیقت جان لینے کے بعد اُم فروا مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے گی۔ وہ کبھی میرے پاس نہیں رہنا چاہے گی۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں خود اسے طلاق دے دوں گا۔ یہ تو صبح نور کی طرح پاک اور اُجلی ہے۔ اس کے لیے تو کوئی نیک شخص ہی ہونا چاہیے عدت بھی تو پوری کرنی ہوگی اسے۔ رب کوئی سبب بنا دے جب یہ محفوظ ہو جائے گی تبھی مجھے سکون ملے گا۔ ورنہ میں ہر پل ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہی رہوں گا۔''

وہ تمام رات سو نہ پاتا۔ جب دل حد سے زیادہ بے چین ہو جاتا تو وضو کر کے عبادت کے نوافل پڑھنے لگتا۔ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو کر اُسے گہری طمانیت میسر آ جاتی۔

اس شادی کو ایک ماہ ہو چکا تھا۔ بلال حمید کا سکھ چین لمحہ لمحہ غارت ہوا جاتا تھا۔ اُسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ بہت جلدی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ فون کی ہر بیل پر چونک جاتا۔ ممکن ہے فیری ماں کا فون ہو اور وہ اب یہ کہے۔ بہت ہو گئی اب اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔ اگر میں دو ٹوک فیری ماں سے بات کروں کہ تم اپنے پیسے لو، میں تمہیں اُم فروا نہیں دے سکتا۔"

وہ ایک دم کانپا۔" بلال حمید جلد بازی میں ایسی کوئی غلطی نہ کرنا۔ اُس عورت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ تمہیں جان سے مروا دے گی اور پھر جانے اُم فروا کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس کے گھر والوں تک پہنچ جائے گی اس کی ایک اور بھی بہن ہے۔ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔" بلال حمید جانتا تھا فیری ماں اُم فروا سے کبھی سبکدوش نہیں ہوگی۔ وہ اتنی جلدی میں اُم فروا جیسی خوبصورت کوئی اور لڑکی بھی تلاش نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے بدلے میں وہ دے کر شاید اُم فروا کی جان کی امان مل جائے۔ وہ فیری ماں کی نس نس سے واقف تھا۔ وہ اُم فروا کے حقوق کبھی کسی اور کو سونپنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔

☆......☆......☆

اس جمعے کو جب وہ دونوں میاں بیوی جمعۃ المبارک کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اُم فروا نے بلال حمید کا سفید شلوار کرتا استری کر کے باتھ روم میں لٹکا دیا تھا۔ اس وقت بلال اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔

"آپ ناخن کاٹ کر نیل کٹر مجھے دے دیجیے گا۔ جمعہ کے دن ناخن کاٹنے کا بہت ثواب ہے۔"

"ہوں۔" بلال حمید جانے کن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت بلال حمید نے سی ڈی پلیئر پر اُم فروا کی نعتیں لگا رکھی تھیں۔ اس کی آواز اس چھوٹے سے گھر کے در و دیوار سے لپٹی جا رہی تھی۔ بلال حمید غسل کرنے واش روم میں چلا گیا۔ اُم فروا اپنے کپڑے استری کرنے لگی۔ پھر وہ کچن میں چلی آئی دم پر رکھی بریانی کا ڈھکن اُتار کر چاولوں کو کھولا، فریزر میں رکھے شامی کباب نکال کر۔ باکس میں سے چار کباب نکال کر پلیٹ میں رکھے اور رائتہ تیار کرنے لگی۔ وہ فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھو کے باہر آ گئی۔ ابھی اُسے بھی غسل لینا تھا اور پھر جمعے کی نماز ادا کرنی تھی۔ بلال حمید گیلے بالوں میں برش کر کے بیڈ روم سے باہر لاؤنج میں آ گیا۔ اُم فروا نے سراہتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ جواباً وہ بھی اُم فروا کو دیکھتا مسکرایا۔

وہ بیڈ روم میں آ گئی، لمبے بالوں کی چوٹی کھول کر اُس میں برش کیا اور پھر واش روم میں چلی گئی۔ بلال حمید لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا اور تسبیح لیے درود شریف پڑھنے لگا۔ نعتیں ختم ہونے پر بلال حمید نے دوبارہ سی ڈی لگا دی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے تمام تر توجہ سے درود پاک پڑھتا رہا۔

بیل کی آواز پر وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ملک مصطفیٰ علی موجود تھے۔

"ملک صاحب، آپ...... آئیے آئیے۔" بلال حمید ایک دم خوش ہو گیا۔ وہ اسے جواب دیے بنا دوبارہ سے سیڑھیاں نیچے کی جانب اُترنے لگے۔

"بلال مجھے تم سے کچھ کام تھا، باہر کھڑے ہو کر بات کر لیتے ہیں۔"

"ملک صاحب یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ میرے گھر تک آئیں اور اندر نہ آئیں۔ آپ اندر تشریف لائیں۔"

اس وقت بلال حمید کچھ اور سوچ رہا تھا۔ سیڑھیوں میں آگے بڑھتے اُن کے قدم رُک گئے۔ بلال حمید نے انہیں اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

"بلال اچھا نہیں لگتا کسی کے گھر یوں چلے آنا۔ تم باہر میری بات سُن لو، صرف پانچ منٹ لوں گا تمہارے۔"
"ملک صاحب آپ شرمندہ نہ کریں۔ اندر تشریف لائیں۔ یہ گھر آپ کی شایانِ شان تو نہیں۔ اگر آپ شرفِ عزت بخشیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔" بلال حمید اس قدر محبت سے کہہ رہا تھا کہ اب کی بار وہ انکار نہ کر سکے اور وہ اوپر کی طرف سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

سامنے نہایت ہی صاف ستھرا لاؤنج تھا۔ گھر کا کونا کونا چمک رہا تھا۔ ایک غیر معمولی طمانیت وگلابوں کی بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک سے ملک مصطفیٰ علی کی روح سرشاری میں کھو گئی۔ روحانی سکون نے اُن کے اندر یک بارگی تازگی بھر دی تھی۔ آسودگی اُن کے روم روم میں اتر گئی تھی۔ براؤن ٹائلز کا چم چم کرتا فلور جس پر وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے لاؤنج کے وسط تک پہنچے۔

"تشریف رکھیے یہی ہمارا ڈرائنگ روم اور لاؤنج ہے۔"

"بہت اچھا ہے تمہارا یہ ڈرائنگ روم وِد لاؤنج۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر گہرا اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکان رقصاں تھی۔ اچانک سے وہ بے طرح سٹ پٹا کر چونکے۔ اُن کی سماعتوں میں ایک نسوانی آواز امرت گھولتی چلی گئی۔ وہ ٹھٹک کر آواز کے سحر میں کھو گئے۔ یہ آواز انہوں نے پہلے بھی کبھی سنی تھی۔ یہ آواز اُن کے لاشعور کے کسی کونے کھدرے میں یقیناً محفوظ تھی۔ سی ڈی پلیئر سے آتی یہ آواز اُن کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھی۔ انہیں یاد نہیں تھا یہ آواز انہوں نے کہاں سنی ہے۔ وہ صرف اسی آواز کی کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ اُن کے دماغ میں گڈمڈ مچی ہوئی تھی۔ بے قراری بھرا انتشار اُن کے اندر بڑھ رہا تھا۔ یہ آواز انہوں نے بہت قریب سے سنی تھی لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو کوئی ان چاہی، ان دیکھی اضطرابی کیفیت تھی جو اُن کے وجود سے لپٹی جا رہی تھی۔ اُن کی سمجھ میں وجہ نہیں آ رہی تھی، وہ بس آواز کے سحر میں گم تھے۔ بلال حمید جلدی سے کولڈ ڈرنک لے آیا تھا۔

"بلال کیوں تم نے تکلف کیا۔"
"ملک صاحب تکلف کیسا۔" بلال حمید اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔
"یہاں اکیلے رہتے ہو؟"
"میری بیوی بھی ہے۔"
"بچے نظر نہیں آ رہے۔"
"ایک ماہ ہوا ہے میری شادی کو۔"
"پھر تو بہت مبارک ہے۔"
"شکریہ۔"

"بلال ایک اچھی خبر میری طرف سے بھی۔" ملک مصطفیٰ علی ابھی تک آواز کے سحر میں تھے۔ بلال حمید نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔

"رائے ونڈ کی طرف ہماری ڈیری، جوسز اور جیم وغیرہ کی فیکٹری ہے۔ مجھے ایک ایماندار سیلز سپروائزر کی اشد ضرورت ہے۔ تم مجھے ایک ایماندار شخص لگے ہو۔ اگر تم ہمیں جوائن کر لو تو مجھے خوشی ہوگی۔ یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا تم سے بات کر لوں۔ تمہارا فون نمبر کہیں مس ہو گیا تھا مجھ سے۔" بلال حمید خاموش تھا۔ اُس کی پیشانی پر

سوچ کی لکیریں ضرور واضح ہوئی تھیں۔
''اچھی آفر ہے۔سیلری تسلی بخش ہوگی۔'' وہ اُسے خاموش دیکھ کر دوبارہ بولے۔
''میں آپ کو چند روز میں بتا دوں گا۔''
''کوئی اور جاب ہے تمہاری نظر میں؟''
''نہیں ملک صاحب ایسا کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم کیسے ہامی بھر سکتا تھا۔اُمِ فروا کو پہلے اُس نے محفوظ کرنا تھا۔ ورنہ وہ آنکھیں بند کر کے اس نوکری کے لیے ہامی بھر لیتا۔ بھلا اُسے اور کیا چاہیے تھا۔
سامنے کے کمرے کے بیچوں بیچ ملک مصطفیٰ علی کو ایک چاند سا چہرہ دکھائی دیا۔شاید چاند بھی اس صورت کو دیکھ کر ماند پڑ جاتا۔ملک مصطفیٰ علی کے ہاتھ میں پکڑا گلاس کپکپایا تو انہوں نے جلدی سے ٹیبل پر رکھ دیا۔اُن کا ذہن اس ماہتاب چہرے کو یاد کرنے کی سعی میں الجھا جا رہا تھا۔آنکھوں کی پھیلتی سکڑتی پتلیوں نے فوری طور پر اُن کی مشکل آسان کر دی ان پتلیوں میں یہ شبیہہ دو سال سے محفوظ تھی۔اکثر و بیشتر اس صورت کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح اُن کے سامنے سے گزر جاتا۔یہ وہی لڑکی تھی جسے آج سے دو سال پہلے انہوں نے اپنے گھر محفلِ میلاد میں نعت پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔جب وہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔یہی آواز اُن کی سماعتوں میں اُترتی چلی گئی تھی۔جبھی وہ مجبور ہو گئے تھے اس سریلی آواز والی کی صورت دیکھنے کو۔اُسی وقت ملک مصطفیٰ علی نے اپنے موبائل کیمرے میں اس صورت کو محفوظ کر لیا تھا۔اس وقت بھی ایک ہی لمحے کے لیے انہوں نے اس پری وش کو دیکھا تھا۔اس وقت بھی وہ اُن کے سامنے ایک لمحے کے لیے آ کر غائب ہو چکی تھی۔
''کیا سوچ رہے ہیں ملک صاحب۔'' اُن کا چہرہ بیڈ روم کے دروازے کے سامنے تھا جبکہ بلال حمید کی اُس طرف پیٹھ تھی۔اچانک مصطفیٰ علی اس کیفیت تک کیونکر پہنچے، بلال حمید یہ جاننے سے قاصر تھا۔اُس کی آواز کا امرت اب بھی ملک مصطفیٰ علی کے کانوں میں ٹپک رہا تھا۔ملک مصطفیٰ علی نے سوچا تھا وہ چند منٹ سے زیادہ یہاں نہیں بیٹھیں گے۔لیکن اب اُن کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔وہ جانے کہاں کھو گئی تھی لیکن وہ اُس کے خیالوں میں گم تھے۔وہ جیسے عالمِ بالا میں اُس کے سنگ محوِ سفر ہوتے ہوئے اُس سے ہمکلام تھے۔لیکن شاید اس کے حسن کی تابانی کے زیرِ اثر وہ لفظوں کا انتخاب نہ کر پا رہے تھے۔جو اُن کے دل کی حالتِ زار بیان کرتے۔اُس کے تراشے ہوئے ہاتھوں میں پاکیزہ گلاب تھماتے جو اُن کے دل کی ٹہنی پر کھل رہے تھے۔بلال حمید کس وقت اُن کے پاس سے اٹھ کر اندر جا چکا انہیں پتا نہ چل سکا۔
'میں نے کبھی خواب میں تو اس حور کو نہیں دیکھا۔' ملک مصطفیٰ علی نے ہاتھ کی پشت زور زور سے گال پر رگڑی۔اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ لمحہ منجمد ہو چکا تھا۔کیا میرے مزاج کا موسم اس لڑکی کے اطراف آ کر ٹھہر چکا ہے۔
اُمِ فروا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے لانبے بالوں میں برش کر رہی تھی۔بلال حمید اُس کے قریب آ گیا۔
(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

''اچھا سنو یہاں اسلام آباد میں رات ذرا جلدی ہو جاتی ہے، کراچی کی طرح راتیں یہاں جاگتی نہیں۔ یہ سوتا ہوا شہر ہے، اس لیے سردیوں میں تو مغرب کے بعد، آتش دان کے قریب بیٹھ کر اچھی موسیقی، کوئی عمدہ سی کتاب یا چلغوزے......

عید کے لیے، پردیس سے ایک سوغات

میں فیض کی مشہور نظم ''رنگ ہے دل کا مرے'' پڑھ رہا تھا اور دھیان کسی اور طرف تھا۔ دراصل امی زبردستی آج جہاں مجھے لے جانا چاہ رہی ہیں وہ میرے لیے بے سود ہے۔ کیونکہ میں ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا، مگر کیا کروں جب سے میری اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی ہے مجھ پر چاروں طرف سے یلغار ہوئی ہے۔ مجھے بس کہیں نہیں جانا نظریں پھر نظم کی طرف مرکوز ہو گئیں۔

رنگ ہے دل کا مرے خونِ جگر ہونے تک
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
زرد پتوں کا خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا، دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا، فاریہ دمکتے چہرے کے ساتھ داخل ہوئی۔

''بھائی یہ لیں۔ آپ کے کپڑے پریس کر دیے، دیکھیں۔'' وہ اپنے اوپر لباس لگا کر گھوم گھوم کر مجھے دکھانے لگی۔

''ہے نا۔'' میری چوائس کبھی خراب ہو ہی نہیں سکتی۔ برانڈیڈ ہے، مشہور بوتیک سے، آپ کے مزاج کے مطابق تیار کرایا ہے۔ بس وکٹ تیار ہے۔ اچھا سا باؤنس ماریں، اور وہ میچ آؤٹ ہو جائے۔''

اس کی گفتگو مسلسل اور رننگ کمنٹری کی طرح ہوتی ہے۔ میں نے ہاتھ سے عینک کا زاویہ درست کیا اور دوبارہ نگاہ کتاب پر ڈالنا چاہی کہ پھر کسی کی آمد ہوئی۔ اِس دفعہ امی اپنے ہدایت نامے کے ساتھ داخل ہوئیں۔

''ٹھیک پانچ بجے تیار ہو جانا اور ہاں اس سوٹ پر بلیک سینڈل ہے گا چپل پہن کر نہ کھڑے ہو جانا۔ خوشبو اچھی مگر مدھم ہونی چاہیے۔'' وہ جانے کے لیے واپس مڑیں، پھر اچانک رکیں اپنے گرتے آنچل کو کاندھے پر ڈالتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''شیو کر لینا، چھٹی پر ضرور ہو مگر کہیں جانے کے لیے شیو بھی ضروری ہے۔''

میں نے بے بسی سے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ

پھیرا۔
"مگر امی! یہ سب کیوں۔ کیا ہم کو ایوانِ صدر سے بلاوا آیا ہے۔"
مگر میری جھنجلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکراتی ہوئی دوسری طرف گھوم گئیں۔ ان کے چہرے پر ممتا بھری شرارت چمک رہی تھی مجھے آج احساس ہوا۔ ماں کی مسکراہٹ میں بھی کتنے دلکش

میں نے اُس کی گہری آنکھوں میں جھانکنے کی بہت کوشش کی اور کافی کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی سامنے رکھ دی۔ گلاب کے تازہ کِھلے پھولوں جیسی خوشبو اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی گو وہ مجھ سے قدرے فاصلے پر بہت لیے دیے بیٹھی تھی، میں نے اُس کی لمبی خمار پلکوں کو حیا سے لرزتا دیکھا۔ اس کی ننھی سی تیکھی ناک اور مسکراتے لب دیکھ کر مخمور ہو گیا

رنگ موجود ہوتے ہیں۔ یعنی میں آج بُری طرح جکڑا گیا ہوں اِدھر اُدھر ذرا ہل نہیں سکتا۔ جیسے میں ہلا تو سونامی آجائے گا۔

☆......☆......☆

اور امی کی پسند کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔
معارج کو امی نے کسی تقریب میں دیکھا۔ اور فتح کر لیا، معلومات حاصل ہوئیں تو صاحبزادی امی کی کوئی پسندیدہ رائٹر کی بیٹی نکلی۔ پھر تو یہ سلسلہ منگنی پر

ہی جا کر ٹھہرا۔ امی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ بیاہ کر اس رُخ روشن کو ابھی لے جائیں مگر معارج کا اکلوتا بھائی باہر تھا، سو شادی ایک سال پر ٹل گئی۔
میری چھوٹی چنچل اور شوخ بہن فاریہ نے فون پر بات بھی کرادی۔ موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہوگیا۔ گویا اب باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہو چلا۔

☆......☆......☆

میں فیضی، عمار حسین اپنے چار بھائی بہنوں کا لاڈلا بھائی کیونکہ بڑے بھائی لندن جا کر بس گئے ہیں۔ دوسری بہن بیاہ کر سعودیہ رخصت ہوگئیں اب میں اور فاریہ رہ گئے۔ یعنی راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ امی کا ادبی ذوق بڑے غضب کا ہے۔ ساتھ میں ابو کو بھی اسی راہ پر لگالیا ہے، رہ گیا میں غریب مجھے بڑی ترغیب دی گئی۔ اماں "ادبی" بچے سارے "بے ادب" بس پھر کیا تھا۔ طعنہ ایسا تھا کہ کر کے دل پر لگا۔ پچھلے سال جب میں فارغ تھا امی کی اکلوتی لائبریری کی زیادت نصیب ہوگئی۔ بس جب سے میں بھی اسیر ہو چلا۔ تو یوں اب میں ہی واحد گھر میں "با ادب" شمار کیا جاتا ہوں۔
ہاں جناب میری اسلام آباد روانگی سے پہلے رات میں اپنے ہونے والی سسرال میں مدعو تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج ہماری بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ میں جو ایک زاہد خشک مشہور تھا جانے کیوں اس ماہ جبین کے حسنِ فسوں کار کے سحر میں خراماں خراماں گرفتار ہوا۔ ذرا وقت سے پہلے ہی جا پہنچا۔ وہ آج میرے پہلو میں مگر قدرے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اس کے وجود سے کسی سینٹ کی دلفریب مہک میری سانسوں میں اُتر کر مجھے شرارت پر مجبور کر رہی تھی۔ میں تو اس کو دیکھ کر دنیا مافیہا بلکہ آس پاس سے بھی بے خبر ہوگیا۔ میں نے پُرشوق نگاہوں سے اُس کے دہکتے رخساروں کو دیکھا۔ اب خاموشی ماحول کو بوجھل کر رہی تھی۔ ظاہر ہے ابتدا مجھے ہی کرنا تھی (محبت کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جو مجھ جیسے مرد کے لیے بڑے دشوار طلب تھے)۔
"وہ...... آپ خوشبو کا انتخاب بہت پیارا کرتی ہیں۔ پورا ماحول مہک رہا ہے۔" بڑی مشکل سے الفاظ میری زبان تک پہنچے۔ اس نے بے اختیار دوسری طرف نگاہ اٹھائی اور میرے لائے گجے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ یعنی خوشبو اور مہک آپ کے لائے پھولوں کی مرہون منت ہے۔
پھر ہم دونوں آپس کی دلچسپیوں، شوق اور عادتوں پر بات کرتے رہے تھے۔ وہ تو انگلش ناولوں اور ایڈونچر کی دیوانی نکلی۔ اور میں ٹھہرا اُردو ادب کا رسیا بہرحال فرسٹ Appearance بڑی کاؤنٹ ہوتی ہے۔ اس میں وہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو چکی تھی۔ کیا ہوا وہ اگر "Sidney Scheldon" کو پسند کرتی ہے تو ادھر میں ممتاز مفتی اشفاق احمد۔ منٹو جیسے سارے جید ادیبوں کا گرویدہ ہوں، اپنی راہ پر لے آؤں گا، دو چار ملاقاتوں میں...... وہ اب بول بول کر شاید تھک چکی تھی۔ ادھر ہم شاید رعب حسن سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ جی...... جی کی گردان کے کافی لمبا گیپ آجاتا۔ شاید اسی وجہ سے اُس نے بے تکلفی سے کہا۔
"میرے خیال میں اب ڈنر کا آغاز ہو ہی جانا چاہیے۔ صبح سویرے آپ کی فلائٹ بھی ہے۔" پھر قریب آئی۔
"جی......؟" گویا بجلی گرا گئی۔
"جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہے۔" اور وہ اپنے گلابی ہونٹوں پر مسکان سجائے، ریشمی بالوں کو لہراتی کمرے سے چلی گئی میں تو سمجھا کہ شاید لائٹ چلی گئی

ہے۔

پھر امی ابا کی موجودگی میں بڑے تمیز سے وہ کھانا کھاتی رہی۔ کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی، زیرِ لب مسکراتی اور کوئی ڈش میرے سامنے پیش کر دیتی۔

"یہ لیجیے فرائی کڑاہی گوشت، امی کی خاص ڈش۔ اور یہ بریانی ابا کی پسند۔" نہ جانے بے اختیار میرے لبوں پر آ گیا۔

"اور آپ کی......؟" جواب آنٹی کی طرف سے آیا۔

"بیٹا یہ تو فاسٹ فوڈ اور نہ جانے کیا الٹ شلٹ پسند کرتی ہے۔" اور میں جواب میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

میں معارج سلطانہ ایک بھائی کی اکلوتی بہن، ہمارا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا ہے۔ امی ملک کی معروف ادیبہ ہیں۔ کئی ایوارڈ اپنے نام کر چکی ہیں۔ ٹی وی کی بلاک بسٹر سیریز امی کے نام سے مشہور ہوئیں یعنی یوں کہہ سکتے ہیں۔ امی کا ایک معتبر مقام ہے اور ان کے دونوں بچے بالکل نابلد۔ انگلش یا رومن سے کام چلتا ہے۔ میرے تو خیال میں فیضی کی ادب شناسی سے ہی امی متاثر ہو گئیں۔ ورنہ شہر میں ہمارے لیے جانے کتنے سرفروش ہاتھوں میں سر لیے پھرتے ہیں مگر امی ابو تو فیضی کے آگے کسی کو گردانتے ہی نہیں۔ ابھی ماسٹرز کا پہلا سال مکمل ہوا کہ یہ رسی گلے میں باندھ دی گئی۔ ذرا یونیورسٹی کی لائف تو انجوائے کرنے دیتے۔ میں نے تو بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ ابھی نہیں کرنی شادی۔ بھوک ہڑتال کی بھی دھمکی دی مگر جانے فیضی کے گھر والوں نے کیا جادو کیا کہ میرا سارا پلان دھرا ہی رہ گیا۔ بقول سائرہ کہ چلو کوئی بات نہیں، رقص تو زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔ اچھا گڈ لکنگ بندہ مل گیا ہے۔

تمہیں جی جان سے چاہے گا۔ ایک سال تک تو آزاد پنچھی ہو، فضاؤں میں اڑانیں بھرنے کا وقت ختم نہیں ہو گیا۔"

وہ بڑی چاہت بھرے لہجے میں مجھے اکسا رہی تھی۔ مگر میری پیشانی پر بے اعتنائی کی لکیریں اس کی گفتگو سن کر مزید گہری ہو گئیں۔

"نہیں سائرہ تمہیں تو معلوم ہے میری فطرت...... چھپنا، لپکنا اور اونچی فضاؤں میں اڑنا مگر وہ موصوف نرے بدھو! ادب کے شوقین۔ وہ جس نے بچپن سے ملز اینڈ بونز پڑا اور Saniel Steel، کالمہ شمسی، خالد حسینی کو پڑھتی ہو وہ عینی مفتی، آپا ان سب کو کیا جانے......" جب ہی موبائل وقفے وقفے سے وائبریٹ کرنے لگا، میں نے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا۔

"لیجیے موصوف ادیب صاحب محوِ گفتگو ہوں گے۔ تم سننا کہ صرف مجھے ہی بولنا ہے ادھر سے صرف جی جی ہوتا رہے گا۔" میں نے اُلجھ کر موبائل کان سے لگا لیا۔

"جی بات کر رہی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ جی یونیورسٹی میں ہوں شور ہے۔ کینٹین میں ہوں۔ کیا ہم پھر بات کریں۔ جی ضرور رات کے کسی پہر جب چاندنی چٹکی ہوگی۔ اللہ نگہبان۔" سائرہ نے اُس کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

"یار بورنگ اب کہتے ہیں آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا رات کو جب چاند نکلے گا تو آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔"

رات اُس کے کہنے کے مطابق میں ٹیرس میں بیٹھی اگاتھا کرسٹی کی ناول پڑھ رہی تھی تو موبائل کی لپک جھپک نے مجھے موبائل کان سے لگانے پر مجبور کر دیا۔

"کیسی ہو معارج! میں یہاں تم کو مس کر رہا

ہوں۔ کچھ پرانے گیت لگائے مگر ان میں بھی دل نہیں لگا۔ ایک ناول اٹھائی مگر اس میں بھی آنے لگی تصویر کسی کی۔"

"اچھا...... کیا رائٹر کی تصویر زیادہ صاف نہیں تھی۔" میں نے بھی ذرا چھیڑا۔

"اوہ آپ مذاق اچھا کرلیتی ہیں......اور کیا کیا کرلیتی ہیں۔" اُدھر اشتیاق سے پوچھا گیا۔

"لانگ ڈرائیو پر نکلنے والی ہوں مگر امی نے کہا کہ آج شہر میں حالات ٹھیک نہیں اس لیے ٹیرس میں آ کر ناول پڑھ رہی ہوں۔" میں نے بیزاری سے روزنامچہ سنایا۔

"اوہ نائس! گڈ! مگر تیز رفتاری حادثے کا سبب بھی بن سکتی ہے اس لیے اس سے تو آپ گریز کریں۔ اچھا یہ بتائیں، شاپنگ گھومنے پھرنے کے علاوہ بھی کیا شوق ہیں۔ آپ کا لان بہت خوبصورت ہے۔ باغبانی کرتی ہوں گی کبھی کبھی کوکنگ بھی کرلیتی ہیں؟" اُدھر سے سادہ سے لہجے میں گفتگو جاری تھی۔

ناچار مجھے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

"جی کبھی کبھار کرلیتی ہوں۔"

"اچھا سنو یہاں اسلام آباد میں رات ذرا جلدی ہوجاتی ہے، کراچی کی طرح راتیں یہاں جاگتی نہیں۔ یہ سوتا ہوا شہر ہے، اس لیے سردیوں میں تو مغرب کے بعد، آتش دان کے قریب بیٹھ کر اچھی موسیقی، کوئی عمدہ سی کتاب یا چلغوزے اور کوئی بہت میسی نیٹ کرتی ہے۔" بظاہر اس کا لہجہ بڑا نارمل تھا۔ اس لیے مجھے بھی ایساری ایکٹ کرنا پڑا۔ رات گہری ہورہی تھی محترم کی عالمانہ گفتگو ختم نہیں ہورہی تھی۔ آخر میں نے ہی ہتھیار ڈال دیے۔

"سنیں اب میں چلتی ہوں، رات زیادہ ہوگئی ہے۔ پھر بات کریں گے۔" لو کر لو گل...... موصوف تو بڑے بور شوہر ثابت ہونے والے ہیں۔ لونگ ڈرائیو سے وہ ڈرتے ہیں۔ تنہائی میں ناول پڑھنا اور وہ بھی آتش داں کے قریب پسند فرماتے ہیں۔

"یا الٰہی خیر! اور میں بغیر کسی جرم کے ہی ہار مانتی جارہی ہوں۔ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے۔

☆......☆......☆

گاڑی کے شیشے سے میں نے آسمان پر بکھرے تاروں کے جال کو تکا۔ پورا چاند اور اُس کی چاندنی اپنے جوبن پر تھی جیسے وہ بھی ہمارے ساتھ محوِ سفر ہے۔ عرشی خالہ کا فارم ہاؤس شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ چھٹیوں میں سارے کزنز مل کر ایک رات کا پروگرام ضرور بناتے۔ گاڑی حسام بھائی ڈرائیو کررہے تھے گلناز آپی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں (پھوپی کے بچے) عفت، زر، فری ہم سب پیچھے بیٹھے تھے گاڑی میں مکمل سکوت تھا۔ جاتے سمے جو جوش وخروش پایا جاتا ہے، وہ واپسی پر جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ جب ہی حسام بھائی بول پڑے۔

"اتنی عورتیں اور خاموشی......؟" سوال میں بڑا طنز تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔

"ہیلو مسٹر یہ آپ نے عورتیں کس کو کہا۔ گلناز آپی آپ نے ٹوکا بھی نہیں۔ بھئی ہم لوگ لڑکیاں بالیاں ہیں۔" میں نے تنک کر جملہ کسا۔ اپی نے جواز تراشا۔

"بھئی اُس کا یہ مطلب نہ تھا۔ بس ذرا چھیڑ رہا تھا۔ لڑکیوں کو چھیڑنا تو بری بات ہوتی ہے اس لیے 'عورتیں' کا لفظ استعمال کیا۔ ویسے بھی میں کہنے ہی والی تھی اگر اتنی خاموشی رہی تو کہیں ڈرائیور کو اونگھ نہ آجائے۔ سمجھ لو یہ سناٹا، ہائی وے اور اس پر ڈاکوؤں کا ڈر...... کافی چوکنا ہوکر گاری چلانی پڑتی ہے۔ گلناز آپی نے حالات کو بڑی خوبصورتی سے ہینڈل کیا۔ اب ہم سب بقول آپی چوکنا ہوگئے۔ میں نے تو حسام بھائی کو بولتے ہی نہیں سنا تھا۔ وہ تو

کم گو بردبار آدمی شمار ہوتے ہیں، ہاتھ میں انکل عرفی کی طرح ہر وقت سگار یا پائپ لیے اپنی سوچوں میں گم۔ ابھی بھی انہوں نے ایک پولیس چوکی دیکھ کر گاڑی آہستہ کی۔ سائیڈ میں لگالی۔ پہلے پائپ نکال کر تمباکو سے لبریز کیا۔ پھر جانے کیا ہوا۔ پائپ سے توجہ ہٹالی اور بغیر سلگائے گاڑی میں آبیٹھے آپی نے ٹوکا۔

"بھئی جب پائپ بھر ہی لیا تھا تو سلگا کر کش بھی لے ہی لیتے۔"

"اوہ...... تو گلناز! گاڑی میں اور بھی لوگ ہیں۔ کسی کو ناگوار بھی لگ سکتا ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں سفر اب تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔" وہ کچھ بات کو لپیٹ رہے تھے۔ ہم سب نے شیشوں سے باہر دیکھا تو واقعی شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

عفت نے پوچھا۔ "اور ہمارے سارے ساتھی بھی پیچھے آرہے ہیں۔" عفت جتنا اچھا بولتی ہے اتنی ہی فکر مند بھی رہتی ہے۔

"جی سب آگے پیچھے ہی ہیں۔" بڑے اطمینان سے جواب آیا۔ اتنے میں میرے موبائل کی ٹون نے مجھے اُدھر متوجہ کردیا۔ فون اسلام آباد سے فیضی کا تھا۔

"جی خیریت سے پہنچ گئے۔"

"میں نے میسج تو کردیا تھا۔ ابھی گھر پہنچ رہے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔" سارے کزن مذاق کرنے لگے بھئی ہم کان میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ تم بات کرلو، جب ہی حسام بھائی نے مجھے دیکھا اور بڑے مہذب لہجے میں بولے۔

"بھئی جس جس کو اپنے فیانسی سے بات کرنی ہے اس کو چاہیے کہ وہ سائلنس پر فون رکھے یا پھر جب زیادہ لوگ ساتھ ہوں تو موبائل بند رکھیں۔ کیونکہ یہ عرشی خالہ کا فارم ہاؤس تو ہے نہیں جہاں Botanica گارڈن میں ٹہل ٹہل کر دل حال زار کہا اور سنا جا رہا ہو۔ بھئی یہ تو چلتی کا نام گاڑی ہے۔ مسافر منزل بہ منزل اُترتے جائیں گے اور......"

ساتھ ہی انہوں نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ گلناز آپی نے حیرت سے ان کا چہرہ تکا۔ ہم لڑکیاں بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ اللہ اس بندے کے منہ میں زبان بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ماحول پر گہری نظر بھی رکھتا ہے کہ کون کس کام میں مصروف ہے۔ ہم نے اپنے کندھے اُچکائے کہ گھر جا کر اس موضوع پر بات کریں گے۔ یہ ڈائریکٹ مجھ پر چوٹ تھی، میں ہی وہاں فیضی کو سارا پروگرام بتا رہی تھی۔

☆......☆......☆

"موسم بہار کی ایک شام تھی۔ سُنہری دھوپ دور دور تک سایہ فگن تھی، جب ہی سندیسہ آیا کہ تمہارے شہر کا موسم سہانہ لگے۔ اس لیے ہم آگئے ہیں۔ رات کو تمہاری طرف آتا ہوں۔" میری طرف خاموشی......

"وہ ایسا ہے بھئی حراساں نہ ہو، قاری کو ساتھ بٹھالوں گا۔ اکیلے لینے نہیں آؤں گا۔ آنٹی کو انفارم کردو۔ صبح ایک میٹنگ ہے دوسرے دن صبح واپسی ہے۔" اور اُس نے فون بند کردیا۔ میں اس سے کہہ ہی نہیں پائی کہ رات گلناز آپی، پھوپی امی سب لوگ کھانے پر مدعو ہیں۔ آپی کی شادی طے ہوگئی ہے تو امی نے سب کو گھر پر بلایا ہے۔ مگر جب میں نے امی سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی رسانیت سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور چلی جانا۔" لیجیے ہم تو سمجھے تھے بڑی جھاڑ پڑے گی کہ اُسی وقت منع کیوں نہیں کیا۔ بتا دیتیں کہ رات ڈنر پر کچھ لوگ آرہے ہیں۔ مگر یہاں تو اُلٹا کہا جا رہا ہے کہ اب منع کرتے کوئی اچھا تھوڑی لگے گا آخر ہونے والی سُسرال ہے۔"

میں تو حیرت سے امی کو تکنے لگی۔ امی کتنی بدل گئی ہیں۔ یہ نہ کرو۔ اس وقت کوئی جانے کا تُک ہے۔ مگر منگنی کے بعد تو جیسے کھلی چھٹی مل گئی۔

گلناز آپی اور حسام بھائی، پھوپھو وغیرہ سرِ شام ہی آ گئیں۔ گلناز آپی تو سن کر خوش ہو گئیں اور مجھے ہدایات دیتی رہیں۔ یہ پہنو، یہ کرو۔"

حسام بھائی چھیڑ خانی کے موڈ میں تھے۔ میں تو اتنی ساری تبدیلیاں دیکھ کر اُلجھی سی گئی۔ عفت اور زر بھی اُدھم مچانے میں شامل ہو گئیں۔

فیضی کی گاڑی کا ہارن بجا میں گیٹ کی طرف لپکی۔

☆......☆......☆

آج ساحل پر بڑی گہما گہمی تھی۔ ویک اینڈ نہ ہونے کے باوجود اتنا رش...... اوں شاید موسم کی ادا دیکھ کر لوگ گھروں سے نکل آئے ہیں۔ فیضی بہت آہستہ گفتگو کرتے ہیں جو لہروں کے شور میں گم ہو جاتیں اور ہم جی...... ہاں ہی کہہ پاتے۔ وہ اپنے یونیورسٹی کے قصے سُنا رہے تھے۔ سامنے ایک بھٹے والا گزرا۔ ایک جوڑا گرم گرم بھٹے خرید رہا تھا۔ فیضی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "یہ چلے گا۔" اس سے پہلے قاری بھاگ کر بھٹے والے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس کے پیچھے فیضی بھی لپکے اور میں سیڑھیوں پر بیٹھی دونوں بھائی بہنوں کی دلچسپیاں دیکھتی رہی۔

میرے قریب بھاپ اڑاتی چائے انگیٹھی پر لیے چائے والا گزرا۔ اب فیضی میرے قریب آ چکے تھے۔

"بھٹہ یا چائے۔" انہوں نے ہاتھ میں لیے بھٹے کو میری طرف بڑھایا۔ دوسرے ہاتھ سے میرے ماتھے پر آنے والے بال سنوارے ہوا بھی کچھ سرد تھی۔ چاند کی مدھم روشنی میں اُن کا چہرہ مجھے لگا دھند اور غبار میں بھی مسکرا رہا تھا۔ پھر مجھ سے گویا ہوئے۔

"یہ عارضِ گل پر شبنمی قطرے...... کیوں؟"

"جیسے یہ سب ان گستاخ لہروں کا قصور ہے......" میں نے جھاگ اُٹھتی لہروں کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

"سنو اچھی لڑکی! اب ہمارا تمہارا رشتہ بہت گہرا اور مضبوط ہو چکا ہے۔ اس لیے......" اتنے میں قاری اچھلتی، کودتی، دو دو بھٹے لیے آ کھڑی ہوئی۔ میں جلدی سے سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلیں بھائی......" وہ اٹھلاتی ہوئی بھائی کی جانب بڑھی۔

☆......☆......☆

چھوٹا سا گھر بہت نفاست سے آراستہ سجا تھا۔ قاری پیار سے ہاتھ تھام کر فیضی کے کمرے میں لے گئی۔ ہلکے نیلگوں پردے، بک شیلف رائٹنگ ٹیبل پر دھرا آبنوسی لیمپ پاس ایک لیپ ٹاپ، ہاں اور ایک بیڈ، بس کل کائنات اتنی...... لیکن زندگی سے بھرپور سائیڈ ٹیبل پر کینڈل لال ٹین بجی تھیں۔ میں نے نوٹ کیا گھر میں جگہ جگہ کینڈل اسٹینڈ، آرٹی فیشل لال ٹین آراستہ تھیں۔ سامنے آئینے کے قریب ایک موم بتی فروزاں بھی تھی۔ گھر کیا تھا کوئی مقدس معبد یا گرجا گھر...... مجھ سے رہا نہ گیا۔

"آپ کو ننھے ننھے روشن قمقمے کا کیا بہت پسند ہیں۔ جگہ جگہ ایستادگی سے جلتی بھڑکتی روشنی کو دیکھتے ہوئے میں نے اشارہ کیا۔ میرے لہجے میں شاید حیرت اور تجسس کا ملا جلا اظہار تھا۔

"اچھا...... آپ نے یہ بات نوٹ کر لی۔ وری نائس! دراصل مجھے بچپن میں پڑھی ایک نظم بہت پسند تھی "مٹی کا دیا" ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کر روشن کر دیا کہ کوئی راہ گیر راستہ نہ بھول جائے۔ بس جب سے دیے جلائے رکھتا ہوں کم سے کم اپنے حصے کا دیا

فٹ بال کا عالمی کپ

اولمپک کے بعد دنیا میں کھیلوں کا سب سے بڑا ٹورنامنٹ فٹ بال کے عالمی کپ کا ہوتا ہے جو ہر چار سال بعد منعقد ہوتا ہے۔ اس ٹورنامنٹ کا آغاز 13 جولائی 1930ء کو یوراگوئے کے شہر مونٹی ویڈیو میں ہوا جس میں 13 ممالک نے حصہ لیا۔ اس ٹورنامنٹ کے فائنل کو 90 ہزار شائقین نے دیکھا اور یہ فائنل میچ ایک سخت مقابلے کے بعد یوراگوئے نے ارجنٹائن کو شکست دے کر جیت لیا۔

تو روشن رکھوں تا کہ لوگ بھٹک کر ٹھوکر نہ کھائیں۔ اور آپ بھی اب تو اس روشنی کے سفر میں شریک ہوں گی۔'' وہ بڑی طمانیت بھری سوچ کے ساتھ فلسفہ بگھار رہا تھا اور میں ذرہ بھر متاثر نہ ہو سکی۔

''کیا مطلب گھر کو آتش کدہ بنالیں...... اوں بھئی ہمیں کیا، اپنی اپنی سوچ ہے۔

☆......☆......☆

پھر بہت سے دن گزر گئے۔ آغاز سرما تھا۔ ڈھلتی دھوپ میں سائے جلدی لمبے ہو جاتے ہیں۔ فیضی کا مہینے میں ایک بار ضرور کراچی کا چکر لگ جاتا ہے۔ تو بقول ہمارے فلسفی صاحب در حُسن پر حاضری کے بغیر واپسی ممکن ہی نہیں۔ میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں، جب وہ میرے سامنے آ کر ادبی گفتگو شروع کرتا اور اشعار کے حوالے دیتا تو میری چلتی زبان کو بریک لگ جاتے اور دل یہ چاہتا کہ مجنوں جلد سے جلد گریباں چاک دور دور چلا جائے۔ مگر جب وہ رخصت ہوتا تو بہت یاد آتا۔ مجھے تو لگتا کہ وہ ایک سب میرین آب دوز ہے جتنا اوپر ہے اتنا ہی گہرا بھی ہے۔

☆......☆......☆

رات میں ٹیرس میں آ کر کھڑی ہو گئی سامنے بہت گھنے پیڑوں میں جیسے جگنو دمک رہے ہیں۔ میرے لیے یہ نظارہ بڑا اچھنبے کا تھا۔ میں تو گنگ سی رہ گئی۔ منظر کی دلکشی نے میری دھڑکنیں تیز کر دی تھیں کہ موبائل کی آنکھیں جھپکنے پر مجھے ادھر متوجہ ہونا پڑا۔ وہی مخصوص دھیمی سی آواز۔

''اداس ہو میرے بغیر ہوں!'' بڑا عام سا سوال ہوا۔

''شاید ہاں...... یا شاید نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی، لمحۂ موجود میں یا تو کچھ ہوتا ہے یا پھر کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں اپنا تو حال ہے۔ کسی کتاب کو کھولتا ہوں تو الفاظ کے بجائے تمہارا دلنشیں سراپا لہرا جاتا ہے۔'' شاید وہ بڑے وجد کے عالم میں تھے۔ ''بولو...... کچھ تو بولو!''

''کیا کہوں؟'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ دل نے سوچا جانے صدیوں پرانی کسی روح کا بسیرا ہے اس کے اندر۔ وہی گھسے پٹے رومانی جملے بولے جاتا ہے، بور بھی نہیں ہوتا۔

"اچھا سنو تم نے کبھی قراۃ العین (عینی) کو پڑھا۔" پھر خود ہی جواب دیا۔

"نہیں پڑھا۔ ویسے ان کو پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر تم پڑھتیں تو تمہیں پتا چلتا کہ ان کا چہیتا پیانو جس کو آرگن کہتی ہیں، اس پر وہ جان دیتی ہیں۔ اکثر ناولوں میں بڑے پیار سے تذکرہ کرتی ہیں۔ وہ دیکھ کر تمہاری حیرت سے چیخ نکل جاتی۔ پھر خود ہلکا سا مترنم قہقہہ لگایا۔ اُف خدا اس ماحول کو اس نے کتنا بوجھل کر دیا۔ سارا رومان دھرا رہ گیا۔ مگر میں نے بھی بڑی بے دردی سے ایک سوال دے مارا۔

"مگر آپ نے کہاں دیکھ لیا۔ یا صرف تخیل کی زباں میں بات کر رہے ہیں۔"

"ایک دفعہ کسی کے یہاں "شامِ افسانہ" میں امی انوائٹ تھیں میں ان کو ڈراپ کرنے گیا تو میزبانوں نے مجھے بھی اندر بلوالیا۔ جب ہی سادہ سے سجے ڈرائنگ روم میں ایک کونے پر دھرا تنہا تنہا آنسو بہا رہا تھا۔"

اُس کی اس بے پیندے کی گفتگو پر میں جواب دینے کے بجائے بے اختیار ہنس پڑی۔

"یعنی آپ اتنے عمر رسیدہ ہیں۔" میں نے ناک آؤٹ کر دیا۔

"نہیں یہ مذاق کر رہا تھا، وہاں کسی نے قصہ سنایا تھا۔ آپ ہنستی ہیں تو کانوں میں گھنٹیاں سی بج اُٹھتی ہیں۔" میری خاموشی کی زبان شاید وہ ادب شناس سمجھ ہی گیا۔

"اچھا سنو تم یوں کرو۔ دو تین کتابیں کسی اچھے رائٹر کی اور پرانے گیتوں کی سی ڈی بھیج دینا۔ میں ڈرائیور کو بتا دوں گا وہ لے لے گا۔" وہ اپنے شوق کی تکمیل کے حصول میں کافی پُرجوش لگ رہا تھا۔

"اچھا جاؤ ہمیں یادوں میں بسا کر سو جاؤ اور اگر نیند نہ آئے تو ہماری یاد سے جنگ شروع نہ کر دینا بلکہ دھیمے سروں میں کوئی پرانا گیت لگا لینا مثلاً چاندی راتیں...... اب اجازت۔"

اور میں نے جلدی سے کان سے موبائل ہٹالیا۔ پرانے سدا بہار گیت سنے گا۔ عینی کو پڑھے گا یا رب یہ بندہ کیا کیا کرے گا۔ سو بورنگ! اس میں تو کوئی آج کل کے زمانے والی بات ہی نہیں۔ یہ تو پی ٹی وی لگا کر رات گئے، راگ راگنی کا پروگرام بھی دیکھتا ہوگا۔ بقول کسی کے سب سوئیں میں جاگوں...... چاندنی راتیں اب آپ ہی فیصلہ کریں گھمانے کے ساتھ چھوٹی بہن لے آئے گا۔ ساحلِ سمندر پر تو مجھے نظر انداز کر کے بہن کو بھٹے کھلا رہا ہے اور میں سیڑھیوں پر بیٹھی لہریں گن رہی ہوں۔ اس طرح تو ترقی کے زینے طے نہیں ہوتے (معارج کے معنی ترقی کے زینے) پہلی دفعہ مجھے اندازہ نہ تھا اور خیال تھا امی ابو ناراض ہوں گے، اکیلے، ہوٹنگ سے انکار کر دیا۔ وہ دن آج کا دن موصوف کبھی بھولے سے بھی کہیں جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ میرا دماغ تو جیسے تھر کا ریگستان بنتا جا رہا ہے۔ بے گیاہ اور بنجر...... میں نے امی کے سامنے لحاظ کرتے ہوئے کچھ اردو رائٹر کے نام گیا لے لیے کہ کتابوں کا تقاضہ شروع کر دیا۔ اب مجھے پہلے صبح عفت سے سی ڈی منگوانا ہوگی وہ ہی ہے گیتوں کی رسیا...... ذرا دیکھ عصمت چغتائی، منٹو کو پڑھتا ہے اور امی نے ہم کو ان کو پڑھنے پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ خود دیکھو سارے بے ہودہ رائٹر کو پڑھتا ہے۔ اور بنتا ہے 'مولوی ذکا اللہ خاں نیازی' آخر خاندان میں اتنے جولی زندگی سے بھرپور لڑکے ہمارے امیدوار تھے۔ قطاریں لگی تھیں۔ جانے امی ابو کو فیضی میں ایسا کیا جو ہر قابلِ نظر آیا۔ میرے لیے یہ انمول رتن چن لیا اور سارا جہاں رہنے دیا۔ آخر حماد میں کیا خرابی تھی۔ کیا اس کا سٹائل تھا۔ فر فر انگلش بولتا۔ شیلے، براؤن، کیٹس پر گھنٹوں گفتگو کرتا۔ ہاں

یہ حسام بھائی انگلش کے فقرے بولتے ہیں جبکہ وہ اُردو ناولوں کے بھی رسیا ہیں اظہر تھا...... اب کس کو یاد رکھوں، کس کو بھول جاؤں ہماری قسمت میں تو آتش دان کے پاس بیٹھ کر شاعری پڑھنا اور سنتا ہے، اُف خدا شادی میں کم دن رہ گئے ہیں اور میں بے ربط اور فضول سوچوں میں گھری ہوئی ہوں۔

آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا سا آ گیا۔ جہاں طغیانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں اپنے بیڈ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی سامنے نظر گئی گھر کی مصنوعی جھیل بڑی پُرسکون انداز میں بہہ رہی تھی۔ سامنے سرخ بجرے پر رسے بندھی بوٹ کسی انجانے مسافر کی تلاش میں ساکن تھی۔ میرا چہرہ اور نقوش بھی اسی تاریکی کا حصہ بن گئے تھے۔ آسمان پر گھرے بادل بھی میری طرح سارا ماحول بھی اداس تھا۔ میں گھبرا کر بستر پر جا گری۔

جب آنکھ کھلی تو بارش کے قطرے شیشے پر لڑھک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ ٹپ ٹپ میں نے اٹھ کر پردے کی دوڑی کھینچ دی ابھی بھی گھرے سیاہ بادل سے آسمان ڈھکا ہوا تھا شاید ابھی اور برسے گا ٹائم دیکھا دوپہر ہو چلی تھی۔ ہارن کی آواز پر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا فیضی کی گاڑی تھی۔ بابا جی نے دروازہ ناک کیا۔

''بی بی! فیضی صاحب آئے ہیں۔ کہتے ہیں بی بی سے کہو سامان دے دیں۔''

میں نے جلدی سے گیتوں کی سی ڈی اٹھائی اُس دن گلناز آپی نے کچھ کتابیں بھی دی تھیں کہ اب تو تمہیں بھی شوق ہو چکا ہوگا پہلے خود پڑھ لینا پھر فیضی کو دینا۔ وہ پیکٹ ایسے ہی پڑا تھا۔ سب کو بیگ میں ڈالا اور نیچے دوڑ لگائی۔ سامنے میرے مقابل فیضی کھڑے تھے۔ Feather Less گلاسز سے جھلملاتی آنکھیں، اونچا دراز قد، ہنستا مسکراتا چہرہ اور لباس پہننے کا ڈھنگ، رات کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے غور سے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور پھر عینک انگشت اور انگوٹھے کی مدد سے درست کی۔

''کیا ہوا کیا چشم ناز کو نظر لگانے کا ارادہ ہے۔''

''اوہ! وہ کیا ہے کہ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ امی تو گھر میں ہیں نہیں۔''

''اچھا......'' اس نے ایک دم قدم واپس موڑا۔

''لیکن کوئی بات نہیں، آپ آجائیں۔ شاید قریبی مارکیٹ تک گئی ہیں گروسری کے لیے۔ ابھی آجائیں گی۔'' میں کچھ گڑبڑا گئی۔

''اوہ کوئی بات نہیں ویسے آپ شب خوابی کے لباس میں بھی کسی شبتاں کی پری وش لگ رہی ہیں۔ اچھا چلتے ہیں۔''

جائیں ہماری یاد سے دل بہلائیں۔ آپ کی ''دید'' ہوئی مانو ہماری ''عید'' ہوئی۔'' اس کی آنکھوں میں کسی داستان گو جیسی چمک تھی۔

''ارے ایسے آپ خالی خولی واپس چلے گئے تو امی ناراض ہوں گی کہ میں نے آپ کی کوئی خاطر مدارت نہیں کی۔'' میں نے اپنے نزدیک بڑے کانفیڈینس سے معاملہ سنبھالنا چاہا۔

''ارے نہیں...... خالی خولی کہاں، شربتِ دیدار تو نوشِ جاں کر لیا۔''

اس لمحے میں نے اپنی نگاہیں چرالیں۔

☆......☆......☆

''یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔'' میں فون پر عفت کو سارا حال بتا رہی تھی کہ کیسے موصوف مجھے تنہا پا کر بھاگ لیے جیسے میں کوئی جادوگرنی ہوں جو پھونک مار کر طوطا بنا دوں گی اور کوئی ہوتا تو موقع غنیمت جان کر آرام سے رومانس کرتا۔ میں نے دل کا غبار عفت کے گوش گزار کر دیا جواب میں عفت نے بڑا

کھنکتا قہقہہ اچھالا۔

''بھئی تمہاری تھیوری ہے کمال کی۔ اس پر تم آسکر ایوارڈ کی حقدار ٹھہریں۔'' اس نے میرا تمسخر اڑایا۔

''تم اس شریف النفس انسان کا تنہائی میں امتحان لینا چاہتی تھیں اور رومانس...... وہ تو اس نے گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی فرمالیا۔ یار تم بھی بڑی بے ایمان ہو بلکہ کسی دھرے پن کا شکار ہو۔ کبھی کہتی ہو خاموش طبع ہے۔ پرانی گھسی پٹی چیزوں کی طرف لپکتا ہے۔ اب اس نے حسن کے قصیدے پڑھ دیے تو طبع نازک پر گراں گزرے۔ کبھی اصرار کرتی ہو کہ وہ ''ہیجاک'' کا پُر اسرار کردار لگتا ہے۔'' عفت بڑی گہری اور بامعنی گفتگو کرتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے وہ مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ میں جھنجلائی۔

''یار عفت یہ بندہ تمہیں ہی سوٹ کرتا ہے۔ اس کی ہر بے وقوفی ایک ادا لگتی ہے کیٹس شیلے یعنی اختر شیرانی، مجاز کا عکس جھلکتا ہے تو سنو میں کہتی ہوں تم کرلو اس سے شادی۔ مزے سے تکیوں پر ڈریم سوئیٹ کاڑھنا، رومالوں کے کونے پر ریشمی دھاگوں سے اس کا نام لکھنا۔'' میں نہایت بے پروائی سے بے تکان بول رہی تھی۔

''بس بس ای نف، ازامی نف جانے کیا اول فول بک رہی ہے۔ ارے پاگل لڑکی جن باتوں کو تم ایشو بنا رہی ہو انہی کے لیے تو لڑکیاں ترستی ہیں اور تم بے وقوف اس کو مسئلہ بنا رہی ہو۔ کوئی اتنی چھوٹی اور معمولی باتوں پر اپنی زندگی، محبت اور چاہت داؤ پر لگاتا ہے۔ جن باتوں پر تم کڑھ رہی ہو اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں اہمیت ہے اگر تو یہ ہے وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ بس اب تمہیں اس نکتے پر ارتکاز رکھنا ہے۔ خدا حافظ۔''

اُف کوئی سمجھتا کیوں نہیں۔ یعنی میں...... یعنی میں معارج...... ایسے بور بندے کے ساتھ شاہراہ زندگی میں آنکھیں موندے چل پڑوں اور غزل کی کچی کتاب بن کر رہ جاؤں۔ میں نے بے دلی سے پاس پڑا ناول اٹھالیا۔ جب ہی تھوڑی دیر کے بعد ہی موبائل بج اٹھا۔

''اُف توبہ یہ ایجاد ایک وبال جان بن گئی ہے۔ کسی پل چین ہی نہیں لینے دیتی۔ اونہہ وہ ہی دشمنِ جان ہے۔ اب سنو شاعری۔''

''بھئی آپ کا ادبی ذوق تو بہت اعلیٰ ہے۔ کیا سدا بہار گیت ہیں۔ ہم کھو گئے تیرے پیار میں۔ (کس کمبخت نے سُن کر بھیجے تھے)'' ابھی ناولیں نہیں پڑھیں وہ بھی یقیناً ان سے بھی اچھی ہوں گی۔ ویسے مجھے شاید جلدی کراچی کا چکر لگانا پڑے گا۔ امی کا اصرار ہے شادی کی تیاری کرنا ہے، تم جلد آجاؤ۔ اچھا میں پھر بات کرتا ہوں آفس سے کال آرہی ہے۔''

میں ڈبل مائنڈڈ کیوں ہوگئی ہوں۔ امی تو ایسا خوش ہیں جب فیضی آتے ہیں تو ہمارے گھر میں 'گنجِ ادب' کھل جاتا ہے۔ بیت بازی شروع ہوجاتی ہے۔ میں کچھ الجھ سی گئی ہوں۔ جانے کس دھاگے میں اُلجھ بیٹھی ہوں کہ سرا ملتا ہی نہیں۔

☆......☆......☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ فیضی اب بہت مختصر گفتگو کرتے تھے۔ شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ اُس دن فرما رہے تھے۔

تیری یاد شاخِ گلاب ہے
جو ہوا چلی تو لچک گئی

اب اس مصرعے پر میں کیا کہتی، خاموش رہ گئی جو کہ میری فطرت میں نہیں۔ ویسے بھی رمضان شروع ہوچکے۔ امی جلدی جلدی کام نمٹا لیتیں ار بازار کا رُخ کرتیں۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ چلی جاتی

اور بے دلی سے شاپنگ کر کے لوٹ آتی۔
فیضی کے فون آنا بند ہو گئے۔شاید رمضان کی وجہ سے مصروف ہوں۔لیکن اب مجھے یہ چین کیوں نہیں پڑتا۔ پھر میں نے خود ہی فون کرلیا اور پوچھا کہ کیسے ہیں کیا حال ہے۔"تو فرمایا۔
"حال میں فی الحال میرا حال نہ پوچھو۔ بے حال ہوں۔"میں تو دل مسوس کر رہ گئی۔اب تین دن کے بعد فون پھر میں نے ہی ملایا تو دوسری طرف سے کوئی ریسپانس نہیں آ رہا تھا۔گھبرا کر عفت سے رابطہ کیا۔
"یار!وہ تو مجھے اگنور کر رہا ہے۔اس نے تو فون بند ہی کر دیا ہے۔"
"تو اب تم کیا چاہ رہی ہو۔چلو شکر کرو رمضان ہے شیطان بند ہے۔بے فکر ہو جاؤ۔"عفت کا مذاق میرے کچھ کام نہیں آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

کل چاند رات متوقع ہے۔شہر بازار گلیوں میں رونق ہے رات گئے تک گہما گہمی۔آتی جاتی گاڑیاں ،ہارن اور موٹر بائیک سائلنسر کے بغیر شور مچاتے گزر رہے تھے۔گھروں میں بچوں کی خوشی سے بھرپور آوازیں ہیں۔مگر مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے دل کا دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا ہے۔امی ابو میری بے چینی کو میکے سے جدائی سمجھ رہے ہیں۔مجھے دلاسے دے رہے ہیں۔آنے والے سنہرے دنوں کی تصویر کشی کر رہے ہیں اور میں بے زاری کمرے میں بند ہوں۔
اب تو وہ ظالم کراچی آ گیا ہے مگر کوئی رابطہ ہی نہیں۔
"قاری سے بات کرتی ہوں۔"میں نے ہمت پکڑی۔فون قاری نے ہی اٹھایا۔کوئی کیسٹ چل رہا تھا۔بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔
"کیا تم فیضی کے کمرے سے بات کر رہی ہو۔"
"ہاں!!آپ کو کیسے پتا؟اوہ ہاں گانا جو چل رہا ہے۔بھائی تو اس وقت بزی ہیں۔چچا کی فیملی آئی ہوئی ہے۔سارے کزن جمع ہیں۔"
پھر کسی نے قاری قاری آواز دی۔
"اچھا چلتی ہوں۔"اور اس نے فون بند کر دیا۔

بھری بہار میں اب کہ عجیب پھول کھلے
نہ اپنے زخم ہی کھلے نہ دل کے چاک سلے

آئے......آئے......اے کاش وہ آئے۔ابر برسے یا آندھی،وہ آئے تو سہی۔
اب دیکھیں امی ابو نے بھی کمال کر دیا۔مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ فیضی کے گھر والے عیدی لانے کے لیے کہہ رہے تھے۔میں نے تو سختی سے منع کر دیا۔اب شادی کے چند دن باقی ہیں اس فارملیٹی کی کیا ضرورت ہے۔عید ملنے آپ سب آ جائیے گا۔رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔"امی کا یہ فرمان سن کر اُدھر سے کوئی اصرار بھی نہیں ہوا۔اور فوراً سر تسلیم خم کر دیا۔
لیجیے یہ بھی خوب ہی رہی۔دونوں خاندان جانے کس زمانے میں رہ رہے ہیں۔نہ کسی کے جذبات کا خیال......لڑکیوں کی یہی تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں۔اب کی تو یہ "ہلال عید"مجھے نڈھال کر گیا۔دل میں چاند رات کی امنگ کہیں دور جا پڑی۔وہ بور شخص گھر میں دیے روشن کیے کسی مسافر کی تلاش میں ہو۔"اُفوہ......مجھے کیا ہو گیا ہے......

☆......☆......☆

صبح عید عجیب سوگواری لے کر آئی۔میں کمرے میں بے دلی سے آنکھیں موندے پڑی تھی کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔بابا ہاتھ میں ایک پیکٹ لیے کھڑے تھے۔
"فیضی صاحب کا ڈرائیور تھا کہہ رہے تھے بی بی اپنی کتابیں چیک کر لیں۔"
میں نے جلدی سے کمرہ لاک کیا کہ بھئی شاعر آدمی ہے کوئی پیغام یا سندیسہ کتابوں میں رکھا نہ ہو۔جلدی جلدی

صفحے پلٹے۔ اچانک ایک تحریر پر نظر پڑی تھی۔
اب اپنی یاد کی خوشبو بھی ہم سے چھینوں گے
کتابِ دل میں یہ سوکھا گلاب رہنے دو
حسام
میری آنکھوں میں تو تارے ناچ اٹھے۔
جانے کیوں تیرے لیے دھڑکتا ہے دل
اے جانِ حیات!
اف خدایا یہ گلاب تو میں نے فارم ہاؤس میں توڑ کر گلناز آپی کو دیا تھا کہ وہ پاس کھڑی تھیں۔ انہوں نے شاید حسام بھائی کو پکڑا دیا...... ہاں...... ہاں بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔ مگر حسام بھائی آپ...... ایسا ظلم کیسے کر سکتے ہیں آپ کو معلوم تھا کہ میں فیضی سے منسوب ہوں۔
حسام کی تحریر کے نیچے فیضی نے لکھا
یہ کہنا تھا کہ مجھے محبت ہے تم سے
یہ کہنے میں مجھ کو زمانے لگے
"اب میں نے اپنا دیا بجھا کر تمہارا دیا روشن کر دیا۔ تمہیں تمہاری روشن منزل مبارک۔"
"اب تم سمجھ گئی ہو گی میں دیے کیوں جلاتا ہوں۔ تم کو تحفۂ عید مبارک۔"
میں جتنا پڑھتی جاتی دماغ میں آندھیوں کے بگولے اٹھتے جاتے۔ میں تیزی سے بند دروازے کی طرف دوڑی کہ اس قیامت کو جو مجھ پر گزر رہی ہے امی سے شیئر کروں ...... پھر جانے کیوں دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود فیضی سے بات کر کے اصل صورت حال سے آگاہ کروں۔ اس وقت جانے کیسے مجھ میں ایک بجلی سی بھر گئی تھی۔ میری زندگی مجھے ایسا لگا کہ بھونچال میں گھر گئی ہے۔ موبائل بند آ رہا تھا۔ گھر پر ملایا (جانے اس وقت کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی) شکر ہے فون فاری نے اٹھایا۔
نہ سلام نہ پیام ہوا۔ "فیضی کہاں ہیں؟ اُن کا موبائل بند آ رہا ہے۔"
"اچھا میں ان کو بیڈ روم میں کورڈلیس دیتی ہوں۔" اس نے کچھ بجھے بجھے انداز میں کہا۔
"ہیلو...... فیضی! پلیز فون بند نہ کریں قسم لے لیں...... کتابیں میری نہیں تھیں اور میں نے یہ بھی غلط کہا تھا مجھے تو اردو ادب کی ذرا بھی سمجھ نہیں۔ اور یہ کتابیں گلناز آپی نے مجھے دیں کہ اب تو فیضی کی بدولت تم بھی ادب پڑھنے لگی ہو گی۔ اسے پڑھ کر فیضی کو بھیج دینا۔ تمہارے ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہے گا۔ میں نے تو اس پیکٹ کو کھولا تک نہیں۔ آپ نے کتابوں کا تقاضا کیا اور میں نے جوں کا توں آپ کو دے دیا۔ اس کاغذ کے پُرزے کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں...... پلیز آپ......"
میری آواز رندھ گئی۔
"بس آپ رات ہماری طرف آ رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے آپ مجھ پر اعتبار کریں گے ہمیشہ۔"
اور میں نے اپنی جھلملاتی آنکھوں میں طغیانی دیکھ کر فون بند کر دیا۔ مگر مجھے ایسا لگا کہ طوفان آ چکا ہے اور بند توڑ کر دل کی بستی مسمار کر گیا ہے۔ میں بستر پر جا گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

مگر رات کو جب گاڑی کا ہارن بجا تو میں جو دردِ دل کو دردِ سر کا بہانہ بناتے پڑی تھی اچھل پڑی۔ پردے اٹھائے تو آنکھوں سے بھی سارے پردے چھٹ گئے۔ ڈرائیور پھلوں، مٹھائیوں اور پھولوں کے ٹوکرے ڈگی سے نکال رہا تھا۔ فیضی اپنی ماما کے ساتھ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس سج دھج سے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں اپنی پھولی ہوئی سانسوں سمیت عید کا جوڑا لے کر واش روم بھاگی۔
دلوں میں خوشیوں کے دیپ جل اٹھے۔
ڈرائنگ روم میں قہقہے کھنک رہے تھے۔ جب

میں دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں داخل ہوئی تو امی بڑے اہتمام سے عیدی فیضی کو دے رہی تھیں اور وہ بڑے مسکین سے سر جھکائے آداب بجالانے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے۔ ماما نے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر مجھے پھولوں اور خوشبوؤں سے لاد دیا۔ ڈھیروں عیدی، پھول میری گود میں دھرے تھے۔ عفت بھی اپنی فیملی کے ساتھ داخل ہوئی اور تصویر کشی شروع ہوگئی۔

اب کتاب میں رکھا سوکھا پھول، جیسے ہولے ہولے مسکرار ہا تھا۔ فیضی میرے پہلو میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مترنم سا قہقہہ لگایا جو سامنے رکھے بوکے کے ڈھیر سے ٹکرا گیا۔

راحتِ دیدار کا رنگ دمک رہا تھا۔ جب ہی فیض نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''دیکھا آپ نے، عزم کی قندیل جلانے سے منزل بہت قریب...... بہت قریب آجاتی ہے۔'' اور کسی کا خیال کیے بغیر میں بول پڑی۔

''میرے اعتبار کو قبول کرنے کا شکریہ۔''

اب سب لوگ کھانے کی میز پر پہنچ چکے تھے۔ جب ہی ان کی آواز ٹکرائی۔

''اسی لیے ہم نے کتابیں بھجوانے میں جلدی کی، ورنہ عید کا یہ دن میرے لیے اُلیے میں تبدیل ہوسکتا تھا۔ میں آپ کے اعتبار کا احترام تاحیات کروں گا۔'' اور اس نے بڑھ کر میری کلائی جو گجروں، پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ تھام لی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑالیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ جو گلنار بن چکا ہوگا چھپالیا۔

''عید کے چاند نے انداز تمہارے سیکھے۔'' انہوں نے سرگوشی کی۔

جب ہی اچانک کمرے میں شور سا ہوا، دیکھا تو پھوپی جان کی فیملی عید مبارک کے نعرے لگاتی داخل ہوئی۔ سب ہم سے پیار سے ملے۔ پیچھے اوٹ میں حسام بھائی کچھ جھینپے سے کھڑے تھے پھر آگے بڑھے اور فیضی کو مبارکباد دی تھی۔

''بھئی یہاں تو پروانے جمع ہیں۔'' مجھے دیکھ کر طنز کا تیر پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ فیضی تو مسکرا کر رہ گئے میں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو رہا نہ گیا۔

''مگر آپ کو دیکھ کر حسام بھائی اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی اور اس میں دخل گھر کے دیے کے ہنر کا ہے۔ ورنہ آپ نے چراغوں کو بجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' اور میں نے فیضی کی جانب محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

''مگر جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے۔'' حسام تیزی سے پلٹے اور امی سے عید ملنے لگے۔ میں نے ان کو کلین بولڈ جو کردیا تھا۔ فیضی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

"سائیں، بکری بیمار ہے، پیر سائیں کو دکھانا ہے، ان کی نظر ہوگی تو بچی کا بخار اتر جائے گا۔" گلاب دین نے ہمت کرتے ہوئے جملہ مکمل کیا، جو اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ "درگاہ کا خرچہ پانی لائے ہو؟" "سائیں جیسا آپ حکم......

عقیدے، خیال اور سوچ کو بدلتا، ایک خاص ناولٹ

"جان دیئو اُستاجی، ڈبل اے"

سر پر ڈبے دار مفلر لپیٹے، تہبند پوش کنڈکٹر سالخوردہ، ہلتی اور بجتی لاری کی سائیڈ پر زور سے ہاتھ مار کر چلایا اور ڈرائیونگ سیٹ کے کنارے پر پائلٹ کی طرح براجمان لاری کے ہم عمر ڈرائیور نے لاری رکنے سے پہلے آگے بڑھا دی، سلیم الزماں چنگیزی جس کے دونوں پاؤں تا حال ہوا میں تھے، اس اچانک افتاد سے مٹی سے بھری کچی سڑک سے بغل گیر ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا بیگ کاندھے سے نکل کر لڑھکنیاں کھاتا جانے کہاں غائب ہو گیا، جاتی لاری کے تہبند پوش کنڈکٹر نے دانت نکالتے ہوئے نخ سی قلقاری ماری اور جاتے جاتے اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور سلیم الزماں چنگیزی سوائے دانت پیسنے کے کچھ بھی نہ کر سکا۔ لاری کے عقب میں لکھے "پھر ملیں گے" کے الفاظ اس کے طیش اور فکرمندی میں اضافہ کر رہے تھے۔ لاری گرد و غبار کے مرغولے اڑاتی غائب ہو چکی تھی۔

یہ کچی سڑک پر ایک چھوٹا سا اسٹاپ تھا، دور دور تک فقط سناٹا بول رہا تھا۔ ایک طرف دو بند دکانیں اور شیشم کے درخت کے نیچے لگا نلکا، نلکے کے پانی کی نمی میں ہانپتے دو مریل سے کتے، ماحول کی کل کائنات تھا۔ نلکے کے ساتھ دھات کا ایک سیاہی مائل گلاس رسی سے بندھا لٹک رہا تھا، گلاس کی اصل رنگت امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مدت پہلے کہیں گم ہو چکی تھی، چنگیزی نے دھول مٹی نتھنوں میں جاتی محسوس کی تو ایک زوردار چھینک نے تنفس کی آمد و رفت بحال کی۔

"بچارا لوکی لگتا ہے مینوں تے"

چنگیزی نے لیٹے لیٹے گردن اٹھائی تو یہ دو راہگیر تھے جو اسے تاسف اور ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"بھائی فقیراں والی کدھر ہے"

چنگیزی نے کہنی کے بل ذرا بلند ہو کر ایسے پوچھا جیسے اس کچی سڑک پر عمر بھر استراحت کا منصوبہ ہے۔

دیہاتی یوں اچھلے جیسے ان کے پاؤں تلے بم کا دھما کہ ہوا ہے، شاید انہیں یا تو اس کے بولنے کی ہی توقع نہ تھی یا پھر اس کے منہ سے گونگوں والی کسی لایعنی بات کی توقع تھی کیونکہ ذرا دیر پہلے ہی وہ اسے اتفاقِ رائے ملنگ قرار دے چکے تھے جو دیہاتوں میں ایک وسیع المعانی اصطلاح تھی۔

''او کاکے تُو نے کیا کرنا ہے فقیر آلی جا کے، اوئے کس سے ملنا ہے تینوں؟''

ذرا معمر دکھائی دینے والے دیہاتی نے اردو اور پنجابی کا گھوٹا لگاتے ہوئے مشکوک انداز میں پوچھا، اس میں اس دیہاتی کا بھی قصور نہ تھا، چنگیزی اس وقت سر سے پاؤں مٹی مٹی ہوا کسی بھبھوت ملے بھوت کی مانند نظر آ رہا تھا۔

''بھائی میں نیا ڈاکٹر ہوں ہاسپٹل کا، سلیم الزماں چنگیزی''

چنگیزی نے ذرا کراہتے ہوئے متانت آمیز لہجے میں کہا، یہ اور بات ہے کہ یہ متانت اس کے حلیے سے قطعی میل نہ کھا رہی تھی جو تہبند پوش کنڈکٹر اور پائلٹ نما ڈرائیور کی مشترکہ شرانگیزی کا نتیجہ تھا۔

''ڈاکڈر صاب، مافی چاہندے آ''

ادھیڑ عمر دیہاتی ایک دم بوکھلا سا گیا، اس کی کیفیت اس سادہ غریب جیسی ہو رہی تھی جس کے سامنے مداری ایک دم سے خالی ٹوپی سے کبوتر نکال لے۔

''کوئی بات نہیں، میرا بیگ جانے کہاں گیا''

چنگیزی نے عزتِ نفس کو تھپکاتے ہوئے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی، اتنے میں دوسرا دیہاتی کچی سڑک کے دوسری طرف سے چرمی بیگ اٹھا لایا اور اسے جھاڑ پونچھ کر اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔

''ڈاکڈر صاب، اسی چھوڑ آتے ہیں توانوں اسپتال پاسے۔''

ادھیڑ عمر دیہاتی نے پیشکش کی اور ڈاکٹر کا جواب سنے بغیر ایک پگڈنڈی پر آگے آگے ہو لیا جو شاید فقیراں والی کا شارٹ کٹ تھا۔

''میں غفورا ہوں جی اور یہ میرا بھانجا ہے جی ،شیدا، مگر سب اسے رنارنا کہتے ہیں''

ادھیڑ عمر دیہاتی نے بیگ اٹھائے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔

''تم سے مل کے خوشی ہوئی غفور صاحب''

چنگیزی نے لنگڑاتے ہوئے، دل ہی دل میں اس لاری کے عملے کے شجرہ نسب میں آمیزش کی جس کی ہارن کے علاوہ ہر چیز بجتی تھی۔

چنگیزی کے تپاک کے جواب میں غفورا اسے ہونق پن سے دیکھنے لگا اور پھر دائیں بائیں نگاہیں دوڑائیں جیسے اسے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ اس عجیب و غریب حلیے والے شخص کو، جو ڈاکڈر ہونے کا دعویٰ دار تھا، اس سے مل کے خوشی کیوں ہوئی ہے اور وہ صاب کسے کہہ رہا ہے، چاروں طرف تو کوئی صاب نہیں ہے۔

''مجھے ہاسپٹل پہنچا دو خدا کے لیے'' چنگیزی نے زچ ہو کر کہا۔ ''تجھ سے خدا نمٹے صدیقی''

چنگیزی دل ہی دل میں کراہا۔

☆......☆......☆

''چنگیزی، شمشیر و سناں، تیر و تفنگ تیرے اجداد کا سرمایہ تھا۔ تُو نالائق نکلا جو آج اس تجزیاتی آلے موسوم بہ سٹیتھو سکوپ کو گلے میں راشن ڈپو کے کارڈ کے طرح لٹکائے اکڑا پھر رہا ہے، تجھے احساس ہی نہیں کہ یہ تیرا شعبہ نہیں ہے۔''

خلیق احمد صدیقی نے سنجیدہ لہجے میں سلیم الزماں چنگیزی پر چوٹ کی۔

''ابے بھوتنی کے صدیقی، تیری آنکھوں میں اس جانور کا بال ہے جس کا نام لینا مجھے زیبا نہیں، یہ

جو تیرے لہجے میں کڑواہٹ ہے، نا یہ مطلب کے لمحے شیرینی میں ڈھلتی دیکھی ہے میں نے۔ ٹونسل درنسل تاجر کی اولاد، تجھے کیا پتا کہ ڈاکٹری خدمت ہے، گنے کے پھوک سے رس نچوڑ کر گلاس بھرنے والے منحوس......" چنگیزی نے جوابی وار کیا۔

"اچھا یار سیز فائر کرتے ہیں، مجھے پتا ہے تو نکل میں سو سال بعد بھی سیدھا نہ ہونے والی شے ہے" صدیقی نے صلح جو انداز میں بات کرتے کرتے ایک بار پھر پٹڑی بدلی۔

سلیم اور خلیق نے کنگ ایڈورڈ سے ایک ساتھ ایم بی بی ایس کیا تھا۔ ڈاکٹر سلیم ایک وجیہہ اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ دونوں ہی طالب علمی کے دور سے سوشل ورک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، فری میڈیکل کیمپس کا انعقاد، خون کے عطیات جمع کرنا، قدرتی آفات کے دوران امدادی مہم چلانا ان کی زندگی کا معمول رہا تھا، اپنی اسی سرشت کے باعث دونوں نے میڈیکل کی تعلیم کا درست استعمال کرنے کے لیے ایک ایسی این جی او جوائن کر لی جو رفاہی کاموں کے لیے ملک گیر شہرت رکھتی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی کی وجہ سے ان کی نوک جھوک اسی طرح چلتی رہتی تھی، گرچہ ان کے اصل نام سلیم اور خلیق ہی تھے مگر وہ ایک دوسرے کو چھیڑنے کی خاطر ایک دوسرے کو سلیم الزماں چنگیزی اور خلیق احمد صدیقی کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ نام اب ان کے اصل نام کا لازمی جزو بن چکے تھے۔

"اچھا یار سیریس ہو جا۔ ایک ٹاسک ہے جو صرف تو کر سکتا ہے۔" صدیقی نے سنجیدگی سے کہا۔

"بول، کیا مسئلہ ہے؟ تورا بورا کے پہاڑوں سے ملا عمر کو لانا ہے یا پھر ناسا کے سٹلائٹ کے ساتھ خلا میں گردش کرنی ہے۔ میں تمہارے لیے سب کر سکتا ہوں یار، سوائے میرا سے شادی کے؟" چنگیزی نے سنجیدہ انداز میں پھر بے پر کی اڑائی۔

"یار کل وزیرِ صحت کے ساتھ میٹنگ میں یہ طے ہوا ہے کہ جن پسماندہ دیہاتوں میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے اور ڈسپنسری یا مرکزِ صحت کی عمارت موجود ہے، وہاں ہم اپنے ڈاکٹر تعینات کریں، سامان اور ادویات کی کمی دور کریں، فنڈز اور تنخواہ حکومت دے گی۔ متعلقہ ڈی سی او بھی بھرپور تعاون کرنے کا پابند ہوگا۔ یار باقی تو سب جگہیں ہم نے کور کر لی ہیں، صرف ایک جگہ رہ گئی ہے، تجھے جانا ہوگا وہاں، صرف تو کر سکتا ہے یہ مسئلہ حل......" صدیقی نے درد بھرے لہجے میں دوٹوک انداز میں کہا۔

"چنگیزی ایک بات اور یاد رکھنا دوست، ہم اس نبی کی امت ہیں جن کا سب سے بڑا کارنامہ علاقے فتح کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے ذہن بدلے، سوچ بدلی، راسخ عقیدے بدلے، پتھروں کو موم کیا...... یار چنگیزی بس اسی سنت کو پیشِ نظر رکھنا......" ڈاکٹر سلیم اپنے دوست کو دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

یہ فقیراں والی تھا، دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر واقع پنجاب کا ایک چھوٹا سا گاؤں۔ دریا کے دوسری طرف ڈیرہ اسماعیل خان تھا، جو خیبر پختونخوا میں واقع تھا۔ فقیراں والی آج بھی باقی دنیا سے سو سال پیچھے تھا۔ سیاسی وڈیروں کی ملی بھگت سے یہ نا صرف علم کی روشنی سے محروم تھا بلکہ ڈسپنسری کی عمارت بھی مویشیوں کے باڑے کے طور پر استعمال ہوتی تھی، جواں سالہ سلیم الزماں چنگیزی خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ایک چھوٹے سے بیگ میں رختِ سفر باندھ کر فقیراں والی کو روانہ ہو چلا، انجان منزل، انجان راستے مگر ہمالیہ کو چھوتا عزم ہی زادِ راہ تھا۔

☆......☆......☆

ڈسپنسری کی خالی عمارت میں قدم رکھتے ہی چنگیزی کو لگا جیسے وہ گوبر اور اپلوں کی آماجگاہ میں داخل ہوگیا ہے۔اس نے بے اختیار ناک پر رومال رکھا،غفورا اور اس کا بھانجا اسے ڈسپنسری کے باہر ہی چھوڑ کر بھاگ چکے تھے،ان کے پیچھے پیچھے گاؤں کے لوگ ایک ہجوم کی صورت ڈسپنسری تک آئے،ہجوم کے پیچھے گاؤں کے کتے تھے جنہیں کوئی اجنبی صورت دیکھے ایک زمانہ بیت چلا تھا،انہوں نے باہمی رابطے کے مربوط نظام کے ذریعے کھیت کھلیانوں میں سوئی ہوئی برادری کو بھی سٹرائک پر مدعو کرلیا تھا اور اب انہوں نے مل کر آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔درختوں سے بندھے مویشی رسے تڑوا کر کہیں بھاگ جانے کو زور آزمائی کررہے تھے کیونکہ وہ ہجوم دیکھنے کے عادی نہیں تھے۔چنگیزی ڈسپنسری میں داخل ہوا تو ہر طرف سکوت چھا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، دروازوں کے کنڈے ٹوٹے ہوئے تھے،کھڑکیوں کے شیشے جانے کب کے کرچی ہو کر زمیں برد ہوچکے تھے۔چار کمروں پر مشتمل عمارت سائیں سائیں کررہی تھی،دیواروں پر جانوروں کے بول و براز کے نشانات کراہیت پیدا کررہے تھے،ٹوائلٹس کے اندر جھانکنا محال تھا،واضح طور پر انہیں پورا گاؤں مال مفت سمجھ کر استعمال کررہا تھا،ڈسپنسری کے احاطے میں ایک بڑا سا گوندنی کا درخت تھا جو سرخ میٹھی گوندنیوں سے لدا پھندا تھا،یہ واحد زندگی کی علامت تھا جو اس ماحول میں دکھائی دے رہا تھا۔ڈسپنسری کے ساتھ ہی ڈاکٹر کی رہائش گاہ کا حال اس سے بھی برا تھا۔یہ عمارت کبھی بھلے وقتوں میں مقامی سیاستدان یا زمیندار نے ذاتی استعمال کے لیے حکومت کے پیسے سے بنوائی تھی،چنگیزی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”کیا خبر کیڑے مکوڑے سمجھے جانے والی دو ٹانگوں والی مخلوق کو انسان کب سمجھا جائے گا۔“چنگیزی نے تاسف سے سوچا۔

کرنے کو بہت سا کام تھا،سب سے پہلے تو ڈسپنسری کی حالت کا درست کروانا،اس کی صفائی اور دھلوائی،عمارت کے لیے فرنیچر اور ادویات کی فراہمی سر دست اولین ترجیح کے کام تھے،اس کے لیے چنگیزی کو کوئی فکر نہ تھی،اس کی این جی او اسے تمام فنڈز کی فراہمی کا وعدہ کرچکی تھی۔

گاؤں والوں کے لیے چنگیزی کوئی مافوق الفطرت ہستی جیسا تھا۔جب بھی وہ ڈسپنسری سے باہر جھانکتا،بچوں اور بڑوں کا ایک غول داخلی دروازے کے باہر جمع نظر آتا۔چنگیزی نے باہر جا کر تعلقات عامہ کی مہم کے تحت گاؤں والوں کی جھجک اور خوف دور کیا،چند گھنٹوں بعد چنگیزی ان کے گھر کا فرد بن چکا تھا،اگلے دو دن عمارت کی اجڑی حالت کو سنوارنے میں گزر گئے،چنگیزی کی توقع کے بر خلاف یہ کام کافی آسانی سے ہوگیا۔گاؤں سے کئی نوجوان بلائے بنا ہی چلے آئے اور کام میں جُت گئے۔دو دن بعد عمارت دھل کر اور قلعی ہو کر نیا پیرہن زیب تن کر چکی تھی۔ڈاکٹر کی رہائش گاہ کو قابل استعمال بنا دیا گیا تھا،بند ٹوائلٹس میں خشک چونا ڈال کر بند ڈرین کھولے گئے،کملے موچی نے کونے میں لگے نلکے میں پانی ڈال کر ہتھی کو اتنا چلایا کہ یقیناً ہتھی کا میٹر گھوم گیا ہوگا،آدھے گھنٹے بعد پانی کی دھار اور ننگ دھڑنگ بچوں کی خوشی سے چہکتی آواز سے فضا لبریز ہوگئی۔

ڈسپنسری میں چنگیزی ہی چوکیدار اور وہی ڈاکٹر اور ڈسپنسر تھا،این جی او کی طرف فرنیچر اور ادویات کی آمد اگلے چند روز میں متوقع تھی،گھر گھر نئے ڈاکڈر کی ذات زیر بحث تھی۔

فقیراں والی میں آمد کے بعد پہلی مرتبہ ڈاکٹر چنگیزی نے سکون کا سانس لیا۔

☆......☆......☆

فقیراں والی سے ذرا باہر ایک تالاب نما جوہڑ تھا جس میں میلوں دور واقع پہاڑوں سے برسات کے دنوں میں آنے والا پانی جمع ہو جاتا تھا، اس پانی میں بارش اور دریائے سندھ کے کٹاؤ سے بھی پانی آتا رہتا تھا، اس وجہ سے اس میں پانی کبھی کم نہ ہوا تھا، یہ جگہ قدرتی طور پر چاروں طرف سے ٹاہلی کے درختوں میں گھری ہوئی تھی، فقیراں والی کی عورتیں یہاں کپڑے دھوتیں، بچے نہاتے اور بھینسیں نہلاتے تھے، کچھ بچے ٹاہلی کے بلند و بالا درختوں پر چڑھ کر تالاب میں چھلانگ لگاتے، انہی ٹاہلیوں اور کیکروں کے تنوں میں بنے کھڈوں سے توتے کے بچے پکڑنا بھی گاؤں کے لڑکوں کا من پسند مشغلہ تھا، غرضیکہ یہ جگہ عورتوں اور بچوں کا پکنک پوائنٹ تھا، اس کے علاوہ یہ خواتین کا 'مرکزِ افواہ سازی و باہمی مشاورت' بھی تھا، کس کی لڑکی بھاگ گئی، کس کی بھاگنے والی ہے، کس کا کس کے ساتھ آنکھ مٹکا چل رہا ہے، کس کے گھر مہمان آیا ہے، کس کی بھینس سُوئی ہے وغیرہ جیسے تمام معاملات یہاں پر زیرِ بحث لائے جاتے تھے، اس وقت بھی وہاں کافی عورتیں، بچیاں بچے جمع تھے اور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے

''ماسی بھاگاں، سنا ہے گاؤں کے اسپتال میں نوا ڈاکٹر آیا ہے، سیانا تے چنگا بندہ ہے۔''

گوری نے بھینسوں کے بدن مسلتے ہوئے کہا، گوری کا اصل نام وقت کی دبیز تہہ میں کہیں گم ہو چکا تھا، وہ شیدے کمہار کی اکلوتی بیٹی تھی، سولہ سال کی الہڑ شوخ و شنگ کسے بدن کی لڑکی، جو بات بے بات نچلا ہونٹ ہلکے سے دانتوں میں دباتی تو سامنے والے کا دل ڈوبنے لگتا تھا، گاؤں کے لڑکے بہانے بہانے سے اس کے راستے میں آتے تھے مگر وہ کسی سے سیدھی طرح بات نہ کرتی، سب اس سے ڈرتے تھے۔

''گوری بیٹی، اسپتال سے ذرا سی دور تو تیرا گھر ہے اور تُو مجھ سے پوچھتی ہے۔''

ماسی بھاگاں نے سوکھی گھاس پر راکھ لگا کر برتن رگڑتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''ماسی میں کون سا اسپتال میں جھانکتی رہتی ہوں، میں نے بھی اڑوس پڑوس سے گل سنی ہے۔'' گوری نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ماسی بھاگاں، ڈاکڈر اچھا ہو یا بُرا مگر پیر صاب جیسا دم درود اس کے پاس کہاں، ایک پھونک سے بندہ پاؤں پہ چل کے واپس آئے۔'' یہ صدیقن تھی، فقیراں والی کے لاؤڈ سپیکر کے نام سے مشہور تھی۔

''صدیقن خالہ، پیر صاب کے بھروسے پہ پچھلے سال شبراتن کی چھوٹی بیٹی تڑپ تڑپ کے مر گئی تھی، بھول گئیں تم۔'' گوری نے ناگواری سے صدیقن خالہ کی بات کی نفی کی۔

''ارے تو تیرا کیا خیال ہے یہ ڈاکڈر ہمیں ٹھیک کردے گا، جس کا اپنا نام چنگیری ہو اس کا تو ڈاکڈر ہونا بھی شک میں ہے۔'' صدیقن خالہ تپ کر رہ گئی، وہ پیر صاب کی پکی مریدنی تھی اور ایک لفظ ان کے خلاف نہیں سن سکتی تھی۔

''چنگیری نہیں خالہ، چنگیزی...... چنگیزی ہے اس کا نام۔'' گوری نے دانت پیس کر کہا۔

''خالہ، گوری سے کیوں مغز مارتی ہو، سنا نہیں تم نے، ابھی کل وہ آیا ہے اور آج گوری کی نظر میں سیانا اور چنگا بھی ہو گیا، اور نام بھی یاد ہو گیا اس کا، بڑی سائیڈ لے رہی ہے گوری ڈاکڈر کی۔''

گوری کی گہری سہیلی جمیلہ نے پہلو پر ایک ہاتھ ٹکا کر دوسرا ہاتھ اور آنکھیں نچا کر شرارتی انداز میں کہا۔

''رک تو، بتاتی ہو تجھے تو میں۔'' گوری نے غصے اور شرم سے لال ہوتے چہرے کے ساتھ چُلو میں پانی بھر کر جمیلہ پر پھینکا اور پانی سے نکل کر جمیلہ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

تبھی عورتیں ہنسنے لگیں اور کھیلتے بچے اپنا کام چھوڑ کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

چوہدری نور محمد فقیراں والی میں ان داتا کی حیثیت رکھتا تھا، سیکڑوں ایکڑ زمین کا مالک ہونے کی وجہ سے اس کا اثر و رسوخ گاؤں سے باہر انتظامیہ میں بھی تھا۔ اسی کی ضد کی وجہ سے آج تک فقیراں والی میں علم کی شمع نہ جل سکی، ایک اکلوتی ڈسپنسری بھی اس نے اپنے ذاتی ڈیرے کے طور پر بنوائی تھی۔ سرکاری افسروں کی دعوتیں کرنا، ان کو شکار پر لے جانا، ان کی جیب گرم رکھنا اس کا معمول تھا جس کی وجہ سے وہ علاقے پر اپنا سکہ جمائے ہوئے تھا، ویسے بھی علم نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے گونگے بہروں جیسی زندگی گزار رہے تھے، جن کو نہ اپنے حقوق کا پتا تھا اور نہ باہر کی دنیا کی خبر تھی۔

چوہدری کی حویلی کے احاطے میں مغرب کے بعد ہی محفل لگ جایا کرتی تھی جس میں اس کے کارندے دن بھر کی خبریں اس تک پہنچایا کرتے تھے، اور ان کی روشنی میں فیصلے کیے جاتے تھے۔ اس وقت بھی ایسی ہی ایک محفل لگی ہوئی تھی، جب سے چوہدری کو ڈاکٹر چنگیزی کی آمد کا پتا چلا تھا، اس کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اس نے حکام بالا سے مل ملا کر یہاں ڈاکٹر کی تعیناتی روکی ہوئی تھی مگر شاید ڈور کہیں اوپر سے ہلی تھی جو ضلعی انتظامیہ بھی بے بس ہو گئی تھی۔

''اوئے غفورے، کیا حال ہے تیرے نوے ڈاکڈر کا؟''

چوہدری نور محمد نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''چوہدری صاب، ساتوں کی خبر، اساں تو اس کو اسپتال دی عمارت دے اگوں چھوڑ کے نس آئے تھے۔'' غفورا سراپا ادب بنا ہوا تھا۔

''اوئے جھلا ہو گیا ہے یہ ڈاکڈر، لوڑ کیا ہے ایتھے انگریزی اور کافر دوائیاں دی۔ ہمارے پاس تو ایک سے ایک بڑا حکیم موجود ہے، خیر مکھیاں مار کے خود ٹر جائے گا۔'' چوہدری نے استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاب، ڈاکڈر نے ابھی تک حویلی بھی حاضری نہیں دی۔'' یہ منشی برکت تھا، چوہدری کا خاص بندہ، جو چوہدری کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آ جائے گا منشی، جلدی کیا ہے، نہ بھی آئے، بس ادھروں ٹر جائے، آج یہ آیا ہے، کل دو چار اور آئیں گے...... نہیں منشی اس ڈاکڈر کو بھگانا پڑے گا۔'' چوہدری نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''حکم کریں مائی باپ، اس کی کھال کے جوتے بنوا دوں کیا؟'' منشی برکت نے کھسیائے لہجے میں کہا۔

''کچھ تو کرنا پڑے گا منشی، میں درگاہ سے مشورہ کر لوں ذرا۔'' چوہدری نے ہنکارا بھرا

☆......☆......☆

سردیوں کی پورے چاند کی رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ چنگیزی ڈسپنسری کی چھت پر کرسی رکھے سوچوں میں غلطاں تھا، ڈسپنسری سیٹ کرنا، اور عوام کا دل جیتنا، ان کو مائل کرنا بہت کٹھن ٹارگٹ تھے۔ اس نے تھک کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا، کھیتوں میں کوئی کسان پانی لگاتے ہوئے بلند آواز سے ٹپے گا رہا تھا۔

کوٹھے تے کھلوہ ماہیا
کوٹھے تے کھلوہ ماہیا

چن پویں چڑھے نہ چڑھے
وے مینوں تیری لو ماہیا
(میرے محبوب تم چھت پر آجاؤ، چاند چاہے نمودار ہو یا نہ ہو، مجھے تمہاری روشنی کافی ہے)

بے اختیار چنگیزی کی نظریں چاند پر گئیں اور ایک انجانا، ان دیکھا چاند جیسا چہرہ اس کے خیالوں میں در آیا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، وہ سونے کے لیے نیچے چلا آیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا، ہر طرف ہُو کا عالم تھا، اچانک چنگیزی کو لگا کہ جیسے کوئی کھٹکا ہوا ہے، وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا، نیند سے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل نہیں رہی تھیں، سولر لیمپ کی روشنی میں اسے وہ چاروں اپنے بستر کے گرد کھڑے نظر آئے، سیاہ پوش اور ڈھاٹے لگائے ہوئے، جانے انہوں نے دروازہ کیسے کھولا تھا۔ چنگیزی نے لاپروائی سے انہیں دیکھا اور کروٹ بدل کر کہا۔

''سونے دو یار کل ملیں گے۔'' اس نے پھر سے نیند کی آغوش میں جانا چاہا۔

نقاب پوشوں میں سے ایک نے اس کے تلووں پر ڈنڈے کی زوردار ضرب لگائی، وہ تڑپ کر بستر پر بیٹھ گیا

''اوئے تیرے مامے کی حویلی نہیں یہ، چل کھڑا ہوشاوا۔'' طویل القامت نقاب پوش نے غرا کر کہا۔

''کیا بات ہے بھراوا؟ میں نے کیا خطا کی ہے؟'' چنگیزی نے سہم جانے کی اداکاری کی، اسے یقین تھا کہ یہ تو وارداسے کم از کم جان سے نہیں مارنا چاہ رہے، اسی وجہ سے وہ جرأت سے بات کر رہا تھا۔

''ڈاکٹدر، تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ تو فقیراں آلی سے ٹُر جا نہیں تو تیرے لیے بہت برا بھی ہوسکتا ہے۔''

''کیوں بھائی صاحب، میں نے کیا کسی کی بھینس کھول لی ہے یا پھر تھانے میں بستہ الف کے بدمعاشوں میں میرا نام درج ہے؟ کیا کیا ہے میں نے آخر؟'' چنگیزی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تُو نے تو کچھ نہیں کیا مگر ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ تیرے ساتھ حرام دے پلے، فقیراں آلی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا تُو نے'' ایک نقاب پوش نے بھڑک کر گالی دی۔

چنگیزی کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر یہ جوش کا وقت نہیں تھا بلکہ ہوش میں رہنے کا تھا۔

''آرام تاں بھئی...... صبر نال گل کر، اج صرف سمجھانا ہے اس کو۔'' طویل القامت سیاہ پوش نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھی کو روکا۔

''دیکھ ڈاکٹدر، ہم تجھے کہہ رہے ہیں کہ تُو پنڈ سے ٹُر جا ورنہ تجھے گم کر دیں گے ہم۔ آج صرف سمجھانے آئے ہیں تجھے، جے فیر آئے تو کچھ کر کے جائیں گے۔'' نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ڈسپنسری سے نکل گئے۔

چنگیزی کی آنکھوں میں تشویش کے گہرے سائے تھے۔

☆......☆......☆

''ہیلو، ابے بھوتنی کے صدیقی، افغانی تاجر کی ناقص کوالٹی فوٹو اسٹیٹ......ہیلو'' چنگیزی نے ہانپتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کی طرح کوئی بیسویں مرتبہ چیخ کر کہا۔

وہ اس وقت بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار تھا۔ فقیراں والی میں موبائل سگنلز آتے نہیں تھے، گاؤں سے دو کلومیٹر باہر ایک بلند قامت ٹاہلی کے درخت کی آخری شاخ کے بارے میں پتا چلا کہ وہاں شاید سگنل آجائیں، اس وقت چنگیزی اسی شاخ پر چمگادڑ کی طرح لٹکا ہیلو ہیلو کی گردان کیے جا رہا تھا۔ پسینہ اس کی گدی سے چلتا، سارے زیادہ نازیبا راستوں سے ہوتا، ٹخنوں تک پہنچ گیا تھا۔

''ہاں بتا کیا بات ہے چنگیزی، کیوں جاڑا لگی بکری کی طرح ممیائے جا رہا ہے۔'' چنگیزی مایوس ہو کر سیل بند کرنے لگا تھا کہ اچانک صدیقی کی آواز سنائی دی۔

چنگیزی نے فی البدیہہ نا قابلِ اشاعت گالیوں سے صدیقی کا استقبال کیا۔

''میں ایک منٹ نہیں رک سکتا اس جنجال پورے میں۔ مجھے پھنسا دیا تُو نے، اب کس جنم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے ٹٹ پونجیے۔ اس سے بہتر تھا مجھ سے بغیر لائسنس کا پستول برآمد کروا کے امریکیوں کو بیچ دیتا، بھیج دیا یہاں مریخ پر مجھے۔ آدھی رات کو سر پر جیل کے داروغہ کی طرح آ کر بن بلائے تیرے سسرالی کھڑے ہو جاتے ہیں، کسی دن میرے قلوں کا اعلان سن رہا ہو گا تُو، بتا رہا ہوں تجھے صدیقی، اپنے والدین کی ناخلف اولاد۔'' چنگیزی نے چگاوڑ پوز میں ہی پہلو بدل کر کہا۔

''مجھے پتا ہے چنگیزی کہ تُو اب وہاں سے کام مکمل کر کے ہی آئے گا، تو ڈرتا نہیں کسی سے، اب تو اصل مسئلہ بیان کر، کیوں مروڑ لگے ہوئے ہیں تجھے؟'' صدیقی نے سلطان راہی سٹائل کا قہقہہ لگایا۔

''صدیقی تو کسی بلیے کی اولاد ہے، چل جلدی سے یہ سامان روانہ کر، نوٹ کر جلدی، ویسے تو میں نے میسج بھی کیا تھا مگر اس کا اعتبار نہیں تھا۔'' چنگیزی نے دانت پیس کر مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا کیونکہ اب ایک ہاتھ سے ٹاہلی کی مضبوط شاخ تھامے تھامے اس کا ہاتھ سُن ہو رہا تھا۔

لسٹ مکمل کروانے کے بعد چنگیزی نے ایک زوردار چھینک کے ساتھ فون بند کیا، چھینک اس چیونٹے کی کارستانی کا نتیجہ تھی جو اس نے چنگیزی کی ناک میں گھسنے کی کوشش میں کی تھی۔ چنگیزی گرتے گرتے بچا اور جواباً غزل کے طور پر اس نے چیونٹے کی سات نسلوں کو مغلظات سے نوازا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر چنگیزی نے ڈسپنسری کو مکمل طور پر سیٹ کر لیا، ایمرجنسی اور روزمرہ ضرورت کی دوائیں بھی پہنچ گئیں، سولر انرجی کے آلات بھی ہمراہ تھے کیونکہ فقیراں والی بجلی کی نعمت سے محروم تھا۔ یہ چنگیزی کے خواب کی تکمیل تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ فقیراں والی کے لوگ ہر بنیادی سہولت سے محروم ہیں مگر سب سے بڑا ظلم تعلیم اور صحت سے محرومی تھا۔ چنگیزی نے یہ بھی نوٹ کیا کہ لوگ ڈسپنسری کے باہر کھڑے تو تجسس نظر آتے تھے مگر وہ اندر نہیں آتے تھے۔

ڈسپنسری چالو ہوئے بھی تین دن ہونے کو آئے تھے مگر ایک مریض نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ چنگیزی کو اس کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔ جب وہ مین گیٹ کی طرف جاتا تو لوگ تتر بتر ہو جاتے، کوئی بھی چنگیزی کے قریب نہیں آنا چاہتا تھا، ہاں چھوٹے چھوٹے بچے کھیلنے کے لیے شام میں ڈسپنسری میں آ جایا کرتے تھے۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ گوندنیاں جمع کرنا اور کھانا تھا۔ جب وہ گوندنی منہ میں رکھتے تو گوندنی کی منہ میں گھل آنے والی مٹھاس سے ان کی آنکھیں پھیل جاتیں اور وہ لذت بھری چیخ مارتے...... چنگیزی نے ان کا شوق دیکھا تو گوندنی کے ایک مضبوط ٹہنے میں رسہ ڈال کر پینگ بھی لٹکا دی، بچوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ عصر کے بعد ڈسپنسری ان کی شرارتوں اور آوازوں سے چہک اٹھتی، فضا میں زندگی کا احساس جاگ جاتا۔ ابابیلوں بھرا آسمان، دور کہیں چکی کی چک چک اور کھیتوں سے بیلوں کے ساتھ لوٹتے دہقان اسے زندگی کا وہ چہرہ دکھاتے تھے جو کہیں کھو چکا تھا، اس وقت چنگیزی بھی کرسی ڈال کر احاطے میں آ بیٹھتا اور بچوں کو اٹکھیلیاں کرتا دیکھتا رہتا۔

مریضوں کی آمد ابھی تک منقطع تھی، اس وجہ سے چنگیزی اسی ایک منظر کے لیے شام کا انتظار کرتا تھا، ننگ دھڑنگ بچے، پژمردہ چہروں اور ویران آنکھوں والے بچے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ سب غذا کی کمی کا شکار تھے، کھیت سونا اگل رہے تھے مگر یہ زندگی کے مارے لوگ زندگی کی تلاش میں صبح سے شام کر رہے تھے، ان کی مثال ایسے تھی کہ

ہم گندم آپ اگاتے ہیں
اور فاقوں سے مرجاتے ہیں

چنگیزی سوچتا تو کرب سے اس کا دماغ پھٹنے کو ہو جاتا تھا، وہ ایسا ہی تھا، دوسروں کے دکھ پر رونے والا، دوسروں کے لیے خوشیاں تلاشنے والا، بچپن میں اپنے کھلونے دوسروں کو دے دینے والا......

شام کو جب چنگیزی کرسی پر بیٹھا بچوں کو جھولے لیتا دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک چھ سات سالہ، گلاب جیسی بچی پینگ سے اترتے ہوئے توازن کھو بیٹھی اور زمین پر اس کا چہرہ لگا، ہونٹ زخمی ہوئے، دانت بھی اپنی جگہ سے ہل گئے، خون بہنے اور درد کی وجہ سے بچی زور زور سے رونے لگی۔ چنگیزی نے فوراً بچی کو اٹھایا اور ڈسپنسری کے اندر کی طرف دوڑا، اگلے دس منٹ میں وہ بچی کا منہ دھو کر، اسے کلی کروا کر مرہم لگا چکا تھا اور چپ کرانے کے لیے ایک ٹافی اسے تھما چکا تھا، دانت زیادہ نہیں ہلے تھے، گرچہ زخم گہرا تھا مگر وہ ٹانکے لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ دیہات میں لوگ ویسے ہی ڈاکٹری طریقہ علاج سے متنفر تھے۔ اسے اعتماد تھا کہ زخم جلد ہی بھر جائے گا، بچی مسکرا رہی تھی اور چنگیزی کا دل ساتھ مسکرا رہا تھا۔ بچوں کا گروہ اس کی کرسی کے گرد ڈسپنسری کے اندر جمع تھا، یہ بچوں کی پہلی آمد تھی جو ڈسپنسری کے اندر ممکن ہوئی تھی اور وہ چھوٹی بچی اس کی پہلی پیشنٹ تھی۔ اسی ڈھلتی شام میں چنگیزی نے اسے پہلی دفعہ دیکھا جب وہ حواس باختہ، ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی اندر آئی، ڈھلتے سورج کی سنہری شعاعیں اس پر ترچھی پڑ رہی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے ان شعاعوں کا سنہرا پن اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کے رُخ روشن سے چھن کر آ رہی ہیں۔ اس کا پسینہ پسینہ چہرہ، تیز چلتا سانس، کمان کی طرح کھنچا اور کسا ہوا بدن اسے ایک الوہی اور ملکوتی سندرتا دے رہا تھا، وہ لڑکی جو خاص نہیں تھی مگر اس ٹھہرے سے چنگیزی کو انتہائی خاص لگی، وہ اس زخمی بچی کی بڑی بہن تھی، چنگیزی کے تسلی دینے کے باوجود وہ ہرنی کی طرح ہراساں نظر آتی تھی، وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رہی تھی!!!

☆......☆......☆

''ڈاکڈر صاب، گڈی ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟''

گوری نے کوئی بیسویں مرتبہ ایک ہی سوال، ایک ہی لہجے میں پوچھا۔

وہ گڈی کا زخم چیک کروانے ہر تیسرے دن ڈسپنسری آ رہی تھی۔

''گوری تم فکر کیوں کرتی ہو، میں تو تمہاری بھینس کا علاج بھی کر سکتا ہوں، گوری تو پھر بھی پھول سی بچی ہے۔'' چنگیزی نے گڈی کے زخم صاف کرتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا اور گوری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہائے وے ربا، تُسی ڈنگر ڈاکڈر بھی ہو گیا؟''

چنگیزی کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا، گوری کھسیا سی گئی، اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ خوش شکل ڈاکڈر اس سے مذاق کر رہا تھا، اس کی سوچوں کی رو بھٹک گئی اور اس کا چہرہ گلنار سا ہو گیا۔

''اچھا گوری یہ بتاؤ کہ تمہارے گاؤں کے لوگ مریضوں کو ڈسپنسری کیوں نہیں لاتے؟''

''وہ تو جی درگاہ والے پیر صاب کے پکے مرید

ہیں، پیر صاب کہتے ہیں کہ انگریزی دوائیاں استعمال کرنا حرام ہے، دوزخ خریدنا ہے جی، اب گاؤں والے پیر صاب کو تو ناراض نہیں کر سکتے جی۔" گوری نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا، گڈی اس کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

"اور تمہیں دوزخ سے ڈر نہیں لگتا گوری؟" چنگیزی نے گوری کو نظر بھر کر دیکھا۔

گوری جیسے گم صم سی ہو گئی۔

"نہیں جی، جب زمین پر ہی جینا دوزخ جیسا ہو جائے تو پھر دوزخ کی ساڑ سے ڈر نہیں لگتا ڈاکٹر صاب۔" چنگیزی حیران رہ گیا، فقیراں والی کی ایک چٹی ان پڑھ لڑکی سے وہ اتنے گہرے جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تمہیں یقین نہیں ہے کیا درگاہ والوں پر؟"

"صاب جی، کیا شیطانوں پر بھی کسی کا ایمان رکھنا بنتا ہے؟ عزت کے لٹیروں کو بھگوان کیسے مانیں صاب جی۔" گوری نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"گوری تم نے تھوڑا بہت پڑھا ہے کیا؟"

"ویسے تو نہیں پڑھا ڈاکٹر صاب جیسے آپ بڑے لوگ پڑھتے ہیں مگر سب سے بڑا سکول تو بھوک اور غربت ہے جی۔ اس سکول میں خوب پڑھا ہے ہم سب نے۔ پیدا ہونے سے لے کر آج تک سبق پڑھ رہے ہیں۔" گوری نے ایک بار پھر حیران کیا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چنگیزی کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہے، اس کا جی چاہا کہ اس سادہ سی لڑکی کے پاؤں کے سارے کانٹے چن لے مگر چنگیزی کو شاید معلوم نہیں تھا کہ پاؤں کے کانٹے تو نکل سکتے ہیں مگر روح میں گڑی سوئیاں ویسی کی ویسی گڑی رہ جاتی ہیں جو صرف وقت ہی نکال سکتا ہے۔

پھر وہ اٹھی اور نچلا ہونٹ دانتوں میں کچلتی، گڈی کا ہاتھ پکڑ کر خاموشی سے چلی گئی۔ گڈی بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی، چنگیزی کا دل لہو سے بھر گیا۔

☆......☆......☆

پیر مستان علی شاہ فقیراں والی سے باہر قبرستان کے ساتھ درگاہ بابا حضوری کے گدی نشین تھے۔ بابا حضوری اللہ کے صاحب کشف انسان تھے، جنہوں نے اس علاقے میں ڈیرے ڈالے تو یہیں کے ہو رہے، ان کے پردہ فرمانے کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کو گاؤں کے ملحقہ قبرستان میں دفن کیا گیا اور ان کی قبر کچی رکھی گئی جو ان کی وصیت بھی تھی، ایک صبح گاؤں والے جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ بابا حضوری کی قبر کے چاروں طرف ایک رسی کے ذریعے حد بندی کر دی گئی ہے، قبر کے پاس سبز رنگ کا بڑا سا جھنڈا گڑا ہوا ہے اور لمبے لمبے چغے پہنے، گلے میں رنگ برنگے منکوں کی مالا ڈالے وحشت زدہ چہروں والے کئی ملنگ دکھنے والے تومند اشخاص وہاں ڈیرہ ڈال چکے تھے۔ ان کے چغے رنگ برنگے کپڑوں کی ٹاکیوں سے بنے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چمٹے بھی تھے جنہیں وقفے وقفے سے بجا کر وہ گلے سے ایک لمبی سی ہُو نکالتے جو سننے والوں کو دہلا دیتی تھی۔ ان کے درمیان ایک سفید لبادے اور سفید پگڑی میں ملبوس شخصیت بھی براجمان تھی، یہ پیر مستان علی شاہ تھے جنہوں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ وہ تو پہاڑوں میں چلہ کشی میں مصروف تھے کہ خواب میں بابا حضوری تشریف لائے، اس جگہ کا پتا سمجھایا اور حکم دیا کہ اس کی قبر کو مرجع خلائق بنایا جائے، وہاں فیضِ عام کا اہتمام کیا جائے اور یہ کام صرف پیر مستان علی شاہ کر سکتا ہے، اس لیے وہ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر اپنے مریدوں کے ساتھ یہاں چلا آیا تاکہ فقیراں والی کو فیض بخشا جائے۔

ہیبت اور مرعوبیت کی ایک لہر فقیراں والی میں دوڑ گئی، چند ہی دنوں میں بابا حضوری کا شاندار مزار اور اس سے ملحقہ درگاہ اور پیر صاحب کے حجرے کی تعمیر کی گئی، ساتھ ہی مریدوں کا کمرے بن گئے، مزار رنگ برنگے جھنڈوں سے سج گیا، بڑی بڑی پتھر کی کونڈیوں میں بھاری بھرکم لکڑی کے گھنگھرو لگے سوٹے خشخاش گھوٹنے لگے، گھنگھروؤں کی چھن چھن سے فضا ہر وقت گونجتی رہتی، چند مرید چمٹا بجاتے جذب اور مستی کی کیفیت میں چلے جاتے، زور زور سے سر مارتے اور اپنے جھاڑ جھنکار بال ہوا میں لہراتے ہوئے بے ہنگم رقص میں مشغول رہتے، ان کی آنکھوں کی سرخی سردائی کے گلاس چڑھا کر اور بھی گہری ہو جاتی۔

مزار پر پیر اور جمعرات کا دن عورتوں کی حاضری کے لیے مخصوص تھا جو مزار پر چڑھاوے چڑھاتیں، چراغ روشن کرتیں اور ساتھ رکھے چوبی بکسے میں حسب استطاعت نقدی بھی ڈالتی جاتیں۔ درگاہ پر پیر صاب کی نگرانی میں ہر مرض کا شافی علاج بھی کیا جاتا تھا۔ باغی اور سرکش جنوں کو بھسم کیا جاتا اور چڑیلوں کو ان کے بالوں سے باندھ کر ٹھٹھہ کے قبرستان میں قید کرنے کے دعوے کیے جاتے تھے۔ غرضیکہ درگاہ بابا حضوری علاقے کا ہسپتال اور روحانی مرکز بن چکی تھی۔ فقیراں والی کے باشندوں کے لیے تو پیر صاحب دنیا کے سب سے قابل عزت انسان تھے۔ ان کے عقیدت مند گلی گلی اور گھر گھر موجود تھے جو ان کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتے تھے، پیر صاحب سے منسوب نت نئے عقل حیران کرتے واقعات لوگوں میں گردش کرتے رہتے تھے۔ پیر صاحب کے مریدوں میں چوہدری نور محمد بھی شامل تھا جو بابا جی کے عرس کا اہتمام کرتا تھا اور اس کا سارا خرچہ خود اٹھاتا تھا۔ درگاہ سے وابستگی ایمان کا حصہ بن چکی تھی اور پیر صاحب کا فرمایا ہی دین تھا۔

☆......☆......☆

''حق ہُو......حق ہُو''

نیم کے درخت تلے بیٹھے ملنگ نے لکڑی کے بھاری بھرکم سوٹے کو پتھر کی کنڈی میں چلاتے ہوئے سر کو جھٹک کر صدا بلند کی، ساتھ ہی تین گدڑی پوش بیٹھے سر دھن رہے تھے۔

بازوؤں میں اپنی بیٹی نگو کو اٹھائے گلاب دین ذرا سا جھجکا۔

''سائیں......''

گلاب دین ڈرتے ڈرتے منمنایا۔

''حق ہُو......حق ہُو''

قوی الجثہ ملنگ نے سر کی مٹی بھری جٹاؤں کو جھٹکا دیا۔

''بول بچہ، کس لیے آئے ہو فقیروں کے ڈیرے پر'' ملنگ کی آنکھیں سرخ لال بوٹی جیسی ہو رہی تھیں۔

''سائیں، بکڑی بیمار ہے، پیر سائیں کو دکھانا ہے، ان کی نظر ہو گی تو بچی کا بخار اتر جائے گا۔'' گلاب دین نے ہمت کرتے ہوئے جملہ مکمل کیا، نگو اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

''درگاہ کا خرچہ پانی لائے ہو؟''

''سائیں جیسا آپ حکم کرو گے، میں تو پرانا مرید ہوں پیر سائیں کا''

''ٹھیک ہے، اندر چلا جا بچے، مولا بھلا کرے تیرا، جا بچے اندر لے جا مہمانوں کو۔ حق ہو، حق ہو۔'' پہلے ملنگ نے دوسرے ملنگ کو حکم دیتے ہوئے وجد سے سر کو جھٹکا۔ گلاب دین ایک ملنگ کے پیچھے چلتا ہوا درگاہ میں داخل ہو گیا۔

یہ مٹی کی موٹی دیواروں والا نیچی چھت کا ہال نما کمرہ تھا، دیواروں پر گارے اور توڑی کے آمیزے

کی لپائی کمرے میں ٹھنڈک جگا رہی تھی۔ گلاب دین کو انتظار کرتے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک کوئی بلاوا نہیں آیا تھا۔ کم وبیش ایک گھنٹے بعد اندر سے ایک دوسرا ملنگ مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا آتا دکھائی دیا۔ گلاب دین بے چینی سے کھڑا ہوگیا۔

"بچے گھر لے جا نکی کو فی الحال، پیر سائیں نے کہا ہے کہ سالانہ عرس نزدیک ہے، اس پر ہی علاج ہوگا اور سر عام ہوگا، خلقت کے سامنے، جا بچے چلا جا۔" ملنگ نے گلاب دین کو گھورا اور گلاب دین الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

"چاچا گلاب دین، کدھر چلے سویرے سویرے" دودھ کی بالٹی ہاتھ میں لٹکائے گھر سے نکلتی گوری نے چاچا گلاب دین کو تیزی سے گھر سے نکلتے دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"کیا بتاؤں دھیے، تین دن سے نکی بیمار ہے، کالا کلوٹا لے کے جا رہا تھا درگاہ پہ منت مانگنے۔ تمہیں پتا تو ہے کہ درگاہ کے مجاور خالی ہاتھ پھٹکنے بھی نہیں دیتے اس طرف، نکی کو لے کے گیا تھا مگر انہوں نے کہا ہے کہ علاج عرس مبارک کے موقع پر ہوگا، اگلے ہفتے عرس ہے دھیے" گلاب دین نے پریشانی سے کہا۔ گلاب دین ایک ریڑھی بان تھا، دن رات اپنی بیل گاڑی پر وزن ڈھوتا، کسی نے مٹی منگوانی ہے تو کسی نے بھٹے سے اینٹیں، کسی نے کھیت سے بن چھٹیاں یا جنگل سے لکڑیاں اٹھوانی ہیں تو کسی نے کوئی سامان منگوانا یا بھیجنا ہے، گلاب دین کے بغیر کسی کا بھی کام نہ چلتا، اس کی چھوٹی بیٹی نکو رات سے بیمار تھی۔ اسی پریشانی میں وہ چڑھاوے کا مرغا اٹھائے درگاہ کی طرف جا رہا تھا۔

"اوہو چاچا جی، نکو بیمار ہے۔ کیا ہوا اسے؟"

"پنڈا تپ رہا ہے اس کا دھیے، لسی پلا لی، مرچیں پانی میں گھول کے دے لیں مگر کوئی فیدہ نہیں ہوا۔ اس کی ماں بتا رہی تھی کہ شام کو نہا کر کیکر تھلے بیٹھ گئی تھی، پچھی عقل جو ٹھہری، لگ گئی ہوگی کوئی ہوائی چیز ساتھ، اس لیے میں درگاہ پہلے گیا تھا۔"

"او چاچا جی، گل تا تواڈی ٹھیک ہے پر میری مانوں تو نکو کو میرے ساتھ نوے ڈاکڈر کے پاس بھیج دو، وہ جو شہروں آیا ہے۔ دیکھنا چنگی بھلی ہو جائے گی نکی۔" گوری نے گلاب دین کو سمجھایا۔

گلاب دین ایسے اچھلا جیسے اسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

"دھیے، تُو کیسی گلاں کر رہی ہے، اوئے میں نے کیا اپنی عاقبت خراب کرنی ہے، کیوں میری مٹی رلوا رہی ہو دھیے۔ کسی نے سن لیا تو ہم دونوں کو فقیراں والی میں تھاں نہیں ملنی، میرے بھرا شیدے کا بڑھاپا نہ رول دھیے۔"

"چاچا گلاب دین، ہر سال ہمارے کتنے بچے ان درگاہ والوں کے علاج سے مر جاتے ہیں، فیر وی آپ لوگ سمجھتے نہیں ہو، گڈی نوں چوٹ لگی، ڈاکڈر کی دوائی نال ہی ٹھیک ہو رہی ہے وہ......"

"او عقل نوں ہتھ مار دھیے، مافی منگ رب سوہنے کول، وہ اللہ دے نیک بندے ہیں، ان دا ہتھ لگنا ہی ہماری نجات ہے پتر۔ زندگی موت تاں رب سوہنے دا کم ہے۔" گلاب دین نے تڑپ کر گوری کی بات کاٹی۔

"اچھا چاچا تُو جا، فیر کراں گے گل اس موضوع تے، میں نکی کا پتا کرلوں۔"

گوری نے گلاب دین کے گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ گلاب دین تفکر سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

درگاہ کے اندرونی حجرے میں پیر مستان علی شاہ

بے چینی سے ٹہل رہا تھا، وہ عام طور پر سفید لبادے اور سفید پگڑی میں ملبوس رہتا تھا، اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی جلالی آنکھیں تھی جن میں نگاہ ڈالنا مشکل تھا۔ حجرے میں اس وقت تین مجاور بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''اس ڈاکٹر کے پر پرزے نکلتے جا رہے ہیں۔ وہ ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا، بہت گڑ بڑ ہو جائے گی، سب کچھ بکھر جائے گا۔'' پیر صاحب نے جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم لوگ کیا منہ میں گنگنیاں ڈال کے مٹھو گھوڑے بنے بیٹھے ہو۔ کچھ مشورہ دو، کچھ بولو۔'' مستان علی شاہ نے غصے سے اپنے مصاحبوں کو جھڑکا۔

''سرکار، معاملہ تو واقعی تشویش ناک ہے، ایسا نہ ہو کہ لوگ آہستہ آہستہ اس کی طرف مائل ہو جائیں، ہم نے تو کافی ٹارگٹ حاصل کرنے ہیں ابھی۔'' ایک مجاور نے ادب سے کہا۔

''اس کو الجھانا پڑے گا کسی اور معاملے میں، چوہدری کے بھیجے کارندوں سے بھی وہ نہیں ڈرا اور ڈٹا ہوا ہے۔'' دوسرے مجاور نے لب کشائی کی۔

پیر مستان علی شاہ کے ماتھے پر تفکرات کی پرچھائیاں گہری سے گہری ہو رہی تھیں۔

''حضور سب سے زیادہ اس کی حمایت شیدے کمہار کی بیٹی کر رہی ہے، گوری۔ ڈاکٹر نے اس کی چھوٹی بہن کا زخم ٹھیک کیا تو وہ جگہ جگہ اس کی تعریفیں کر رہی ہے۔ اس طرح کے دو چار واقعات اور ہوئے تو لوگ اس طریقہ علاج کے قائل ہو جائیں گے۔'' پہلے مجاور نے پھر اپنا حصہ ڈالا۔

''اوہو، گوری...... یہ وہی ہے نا......'' پیر مستان علی شاہ نے ہوسناک لہجے میں کہا۔

''جی سرکار، وہی ہے جسے پچھلی بار آپ نے عرس پر دیکھا تھا اور جو کئی بار آپ کا جال توڑ کر بھاگ چکی ہے۔'' خاموش بیٹھے مجاور نے ہرزہ سرائی کی۔

''آ جائے گی بلبل جال میں، کب تک اڑے گی، اڑیل گھوڑی پر سواری میں زیادہ مزا آتا ہے ہمیں۔'' مستان علی نے شیطانی مسکراہٹ سے کہا۔

''سرکار ایک تجویز ہے اگر آپ مانیں تو......'' ایک مجاور نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''بول شریفے، کھل کے کہہ، گھمن گھیریاں مت ڈال۔'' پیر صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

''سرکار اس مرتبہ ہم عرس کے موقع پر کوئی ایسا شعبدہ دکھائیں کہ لوگ مرعوب ہو جائیں، ڈر جائیں......اس بار کوئی علاج بھی لوگوں کے سامنے کریں۔'' شریف نامی مجاور نے بات مکمل کی۔

''دیکھ لو شریفے، تجویز تو بہت عمدہ ہے مگر آج تک علاج درگاہ کے اندر ہوتا رہا ہے، لوگ بپھر نہ جائیں، قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔'' مستان علی شاہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''حضور کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا، ویسے عوام میں اتنا حوصلہ ہے نہیں، یہ پسے ہوئے اور دبے ہوئے کیڑے مکوڑے ہیں اور حضور میں گلاب دین کو عرس کے موقع پر علاج کا کہہ بھی چکا ہوں۔'' شریف نے نفرت سے کہا۔

''سرکار میرا بھی ایک مشورہ ہے جو میں اکیلے میں آپ کو دوں گا۔'' پہلے والے مجاور نے عیارانہ انداز میں کہا اور پیر مستان علی شاہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

اچانک عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے، شیدے کمہار کی دو بھینسیں رات کو بھلی چنگی کھرلی پر موجود تھیں جو صبح مردہ پائی گئیں۔ ایک گدھے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، گڈی کے ہونٹ پر آیا زخم بگڑنے لگا، سب حیران تھے کیونکہ زخم تو بھر چکا تھا

اور اب محض کھرنڈ ہی باقی تھا، کھرنڈ خود بخود جھڑ گیا، نیچے سے زخم پھر تازہ ہو چکا تھا، زخم کی جگہ سرخی مائل ہو رہی تھی اور اس میں درد اور کھجلی بھی محسوس ہوتی تھی، گڈی رات سے ہی رو رہی تھی۔

''تُو ہمیں نہ جینے دے گی نہ مرنے، تیرے کہنے پر میری مت ماری گئی تھی، مینوں مافی دے دے پیر صاب، ہائے اوے گوری تیرا ککھ نہ رہے۔''

شیدا کمہار کی بیوی پچھلے ایک گھنٹے سے گوری کو کوسنے دے رہی تھی اور اپنے گال پیٹ رہی تھی، کبھی رانوں پر ہاتھ مارنے لگتی، اسے گڈی کی کوئی فکر نہ تھی بلکہ وہ درگاہ والوں کی ناراضگی اور غضب سے لرز رہی تھی۔

''اماں، اللہ کولوں مافی منگ، کیوں اللہ کو ناراض کر رہی ہے اماں، میں جاتی ہوں ڈاکٹر صاب کول، اپنی گڈی بھلی چنگی ہو جائے گی۔'' گوری نے ماں کو حوصلہ دینا چاہا۔

''خبردار، نام نہ لینا میرے گھر میں ڈاکٹر کا۔ تُو نے تباہ کرا دیا ہمیں گوری، ابھی تُو جانے اور کتنی مصیبتیں باقی ہیں، ہائے پیر صاب، سانوں مافی دے دیو، چل گڈی چل درگاہ......''

گوری کی ماں نے تڑپ کر گڈی کو کھینچا۔

شیدا کمہار ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے ساکت، گم صم بیٹھا تھا۔

''ابا ابا، میری گل سن، اماں نوں سمجھا ابا، گڈی ٹھیک ہو جائے گی ابا، میں جاتی ہوں اسے لے کے اسپتال......''

''بس کر، چپ، اب آواز نکلی تو ٹوٹے کر دوں گا گوری۔ درگاہ والے اسی دن سے ہم سے ناراض ہیں جس دن تُو لے گئی تھی اس کو اسپتال، وڈی آئی تو ڈاکٹر دی حمایتی، بوت ہو گیا گوری اب تُو نہ بول بیچ وچ، نہیں اٹھا سکتے ہم کوئی نیا نقصان، کمہار ہیں ہم ذات کے دھیے، نہ ڈال اتنا وزن ہم پہ، نہ ڈال پُتر.....'' غضبناک آواز میں بولتے بولتے شیدے کمہار کی آواز بھرا گئی اور وہ زمین پر گر سا گیا۔

گوری کی آنکھوں میں جیسے کسی نے کڑوا دھواں بھر دیا۔

یہ کیسا جیون تھا کہ جس میں پیشے ذات بن کر ہمارے گرد اگرد آکاس بیل کی طرح لپٹے ہیں اور غربت ہمارے تن پر کالک کی طرح مل دی جاتی ہے۔ ایسی کالک جو اندھیرے سے بھی نہیں چھپتی، غربت سے بڑا اندھیرا کچھ بھی نہیں ہوتا، ہم پیلے پڑتے جاتے ہیں، مرجھا کر سوکھ کر ڈھے جاتے ہیں، مٹی مٹی ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ آکاس بیل اور کالک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

شیدے کمہار کے آنگن میں سسکیاں گونج رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''گوری، بات سنو، ایک منٹ گوری، پلیز''

چنگیزی نے ڈسپنسری کے سامنے سے سر جھکائے گزرتی گوری کو آواز دی، آج اس کے ساتھ تین کی بجائے صرف ایک بھینس تھی، دکھ کے گھنے سائے گوری کی پلکوں پر رقصاں تھے۔ گوری کے قدم کچھ دھیمے ہوئے۔

''گوری مجھے افسوس ہوا سن کر، تم لوگوں کا بڑا نقصان ہوا ہے، اللہ کی یہی مرضی تھی گوری۔'' چنگیزی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے گوری کو تسلی دے۔

گوری نے کوئی جواب نہ دیا بس اس کی میں نما سسکی سارا ماجرا سمجھا گئی۔

''گوری وہ...... میں نے گڈی کا بھی سنا تھا تم اسے میرے پاس لے آؤ پلیز گوری۔'' چنگیزی نے لجاجت سے کہا۔ جس دن سے اس نے گڈی کے زخم کے بگڑنے کا سنا تھا اسے چین نہیں تھا، میڈیکل لحاظ

سے بھی یہ عجیب سی بات تھی، دوسرے اسے گڈی سے انس بھی تھا
"ابا نہیں مانتا ڈاکڈر صاب، گڈی کے چہرے پر سوجن آگئی ہے، منہ کے اندر بھی چھالے ہیں، کچھ بھی نہیں کھایا جا رہا اس سے۔ ابا اسے درگاہ لے گیا تھا، انہوں نے دھکے دے کر بھگا دیا، ابا تو وہیں پر لیٹ گیا بڑے مجاور کے قدموں میں، بڑی مشکل سے مانی دی ہے پیر صاب نے۔ اب گڈی کا علاج پیر صاب کر رہے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، گڈی مر جائے گی ڈاکڈر صاب، جیسے ہر سال کتنے بچے درگاہ والے کھا جاتے ہیں، میری گڈی بھی مر جائے گی....." گوری نے سسکیوں میں مشکل سے بات مکمل کی اور پھر دوپٹے میں چہرہ چھپائے تیز تیز قدموں سے لڑکھڑاتی آگے بڑھ گئی۔
چنگیزی سُن ہو کر رہ گیا، زخم کی نوعیت سے اسے ایک شک یہ بھی ہو رہا تھا کہ اس کی شہرت خراب کرنے کے لیے اور گاؤں والوں کا راستہ روکنے کے لیے گڈی کے زخم پر کوئی زہر لگایا گیا ہے جسے سادہ لوح لوگ درگاہ کا عتاب قرار دے رہے ہیں مگر معاملہ جو بھی تھا، فی الحال تو گڈی کی جان کا سوال تھا۔ اگر گڈی کسی طرح اس تک آجاتی تو وہ اس کا علاج کر سکتا تھا۔ ابھی انفیکشن زیادہ نہیں بڑھا تھا۔
چنگیزی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے گڈی کو بچائے۔ اسی کشمکش میں سارا دن گزر گیا، آخر کار اس نے شام میں ایک فیصلہ کر ہی لیا، عشاء کے بعد فقیراں والی کی گلیوں میں سناٹا بول رہا تھا، سردیوں کی اترتی رات تھی، گھروں میں لالٹین کی مٹیالی روشنی اور گلیوں میں اندھیرا تھا۔ چنگیزی نے اچھی طرح گرم چادر کی بُکل ماری ہوئی تھی، اس کے قدم شیدے کمہار کے دروازے پر جا کر رکے اور اس نے ہولے سے لکڑی کے کواڑ کو تھپتھپایا۔

"کون ہے جوان اس ویلے؟" اندر سے شیدے کمہار نے کھانستے ہوئے پوچھا۔
تھوڑی دیر بعد شیدے کمہار نے ایک پٹ ذرا سا نیم وا کیا اور لالٹین اونچی کر کے چنگیزی کو پہچاننے کی کوشش کی۔
"کون ہے تُو کاکا؟" شیدے نے آنکھیں سکیڑیں۔
"میں ہوں جی، ڈاکٹر....." چنگیزی نے چہرے سے چادر کا پلو ہٹایا۔
شیدا کمہار ایسے گھبرایا جیسے اس نے کوئی بلا دیکھ لی ہو، اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا مگر چنگیزی نے دروازہ پکڑ لیا۔
"چاچا میری بات سن لیں پلیز، آپ کو اللہ کا واسطہ....." چنگیزی نے التجائیہ انداز میں کہا۔
"ڈاکڈر پتر ویکھ مینوں مانی دے دے، پہلے ہی وڈی مشکل مانی ملی ہے درگاہ توں۔" شیدے کمہار نے گلوگیر لہجے سے کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔
"چاچا وہ مر جائے گی، مجھے اندر آنے دو چاچا۔" چنگیزی نے شیدے کمہار کے دونوں ہاتھ تھام کے منت کی۔ اس کے لہجے میں نمی تھی۔
ایسا لگا جیسے ایک لمحے کو شیدا کمہار نرم پڑا ہے مگر وہ بولا تو اس کا لہجہ اٹل تھا۔
"دھی مر جائے تو اللہ کی مرضی مگر آخرت کا پلو تو ہاتھوں نہ چھوٹے پتر، نہ گناہ گار کر سانوں" شیدے کمہار نے حتمی لہجے میں کہہ کر دروازے کو دھکا دیا، دروازے کا پٹ چنگیزی کے کندھے پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گرا
"آنے دے ڈاکڈر پتر کو گوری کے ابا....."
پیچھے سے ایک تھکی آواز نے چنگیزی کو جیسے زندگی کی نوید سنا دی۔

☆......☆......☆

لالٹین کی پیلی روشنی میں کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی، چنگیزی بستر پر نیم مردہ گڈی پر جھکا ہوا تھا، کبھی کبھی گوری کی سسکی کیس کی طرح ہونٹوں سے بلند ہوتی اور کمرے میں درد پھیل جاتا، گڈی کی حالت اس کی توقع سے زیادہ خراب تھی، معاملہ زخم سے آگے کا تھا، گڈی کو مستقل زہر دیا جا رہا تھا۔ گلاب مرجھا رہا تھا، تیزی سے مر رہا تھا، اس کے گالوں کی شفق کی جگہ ایک پیلاہٹ نے لے لی تھی، تتلی کی طرح تھرکتی، گوندنیاں چنتی گڈی اس وقت ایک لاش کی طرح بستر پر موجود تھی، بہت کچھ غلط ہو رہا تھا اس خاندان کے ساتھ۔

"گوری یہ بتاؤ کہ جس دن سے زخم خراب ہونا شروع ہوا تھا، اس سے پچھلے دن کون ایسا بندہ گھر میں آیا تھا جو عام طور پر نہیں آتا اور وہ گڈی کے پاس رہا ہو؟" چنگیزی نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

گوری اور اس کی ماں سوچ میں پڑ گئیں، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سرگوشی برآمد ہوئی۔

"صدیقن خالہ......"

"اوہ یس...... میں سمجھ گیا" چنگیزی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ وہی خاتون ہے نا جو درگاہ والوں کی خاص الخاص مرید ہے بلکہ یوں کہو کہ ان کی پروپیگنڈہ سیکرٹری ہے۔"

چنگیزی کے الفاظ تو کسی کے سمجھ نہیں آئے مگر مفہوم سمجھ آ گیا۔

"صدیقن نے گڈی کے چہرے پر اپنا ہاتھ بھی پھیرا تھا......" گوری کی ماں نے خود کلامی کے انداز میں کہا، شیدا کمہار بھی اب ان کی طرف متوجہ تھا۔

"اور ماں یاد کرو، اسی شام گڈی نے زخم میں جلن کی شکایت کی تھی، میں کہتی تھی نہ اماں کہ درگاہ کا کوئی عذاب نہیں اور نہ وہ کسی کو عذاب دے سکتے، اماں یہ تو ان لوگوں کی سازش ہے، ہم میں جانے کتنے لوگ ان سے پیسہ لیتے ہیں، اماں گڈی کے زخم پر زہر ملا گیا تھا۔" گوری کا لہجہ پرجوش ہو چکا تھا۔

"پتر، اگر یہ سچ بھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں ہم کسی کا۔ ہمیں تو اپنی گڈی بچانی ہے کسی طرح۔" شیدے کمہار نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پتر، بچا لے نا میری گڈی کو، بچا لے پتر" شیدے کمہار نے ایسے کرب آمیز لہجے میں کہا کہ چنگیزی کا دل پگھل کے آنکھوں میں چھلک آیا۔

"بچاؤں گا میں چاچا، اپنے رب کے حکم سے ضرور بچاؤں گا گڈی کو" چنگیزی نے آہنی یقین کے ساتھ کہا اور گڈی کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد ہی فقیراں والی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ شیدے کمہار کا گھر ڈسپنسری گیا ہے گڈی کا علاج کروانے، فقیراں والی میں رات جاگ گئی، لوگ وحشت کے مارے چوپال میں جمع ہونے لگے جیسے گاؤں پر کوئی عذاب آیا کہ آیا، ایک بھونچال تھا جو گلیوں میں اتر آیا تھا۔ سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کی فصل گھر گھر اگ رہی تھی۔ اتنی بڑی گستاخی، اتنی بڑی دیدہ دلیری، ایسی بغاوت......شیدا کمہار اپنی بیمار گڈی کو درگاہ سے ہٹا کر ڈسپنسری لے جا چکا تھا۔

"جہنم خرید رہا ہے شیدا" ایک نے حقہ کی نے منہ سے لگاتے ہوئے گڑگڑ کی۔

"عذاب پڑے گا اس پر، دیکھ لینا تڑپ تڑپ کے مرنا ہے اس گستاخ نے" دوسرے نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"کل رات ہی میں نے اس کے گھر پر کالی

ہانڈیاں گھومتی دیکھی ہیں، شرارے نکل رہے تھے ان سے" درگاہ کے نمک خوار نے دونوں کانوں کو پکڑ کر جھرجھری لی۔

"اوئے آخرت بھی یاد نہ رہی شیدے کو، پیر صاب کی داڑھی میں مٹی ڈال رہا ہے۔ ہائے او مالکا سانوں بخش دیویں۔" چوہدری کی حویلی میں حاضری دینے والے مولوی صاب نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے لرز کر کہا۔

"اوے لگتا ہے آخری ویلا آگیا ہے اس ڈاکڈر کا، کرنا پڑے گا کچھ اس کا۔" چوہدری نور محمد نے شملہ سر پر رکھتے ہوئے رعونت سے کہا۔

"کوڑھ پڑے گا شیدے کے گھر پر، اس نے نوری گھرانے کو چپیڑ ماری ہے۔ میرے سوہنے ربا، ہم اس کے ساتھ نہیں ہیں، تو گواہ ہے میرے ربا۔" صدیقن خالہ نے عورتوں میں بین کرتے ہوئے کہا۔

"کیا سمجھتا ہے ڈاکڈر کہ بچالے گا اس گھر کو جس پر پیر صاب کا عذاب پڑا ہو، بھول ہے اس کی۔" چوپال سے صدا اٹھی۔

صداؤں کا ایک جنگل چاروں طرف اگ آیا تھا جس پر اندیشوں اور ڈر کے ناگ پھنکار رہے تھے!!

☆......☆......☆

چوپال پر ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا، بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں، کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، زیادہ تر لوگ شیدے کمہار کو لعن طعن کر رہے تھے اور اس پر عذاب کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ کچھ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جانے کی تجویز دے رہے تھے تاکہ متوقع عذاب سے بچا جاسکے!!

ماسی بھاگاں نے چپکے سے ہجوم سے نکلنا چاہا، وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ آوازوں کا ایک سیلاب اس کے پیچھے لپکا۔

"ماسی بھاگاں، کہاں جارہی ہو تم، ادھر ہی کھلو جا۔" پیرن دتہ گڈریا اس کے پیچھے لپکا۔

"میں ہسپتال جارہی ہوں۔" ماسی بھاگاں نے گویا چوراہے میں بم پھوڑ دیا۔

"کیا کہا، ہسپتال......موت کو آواز مت دو ماسی!!" ہجوم ایک ساتھ چیخا۔

"ہاں، ہسپتال......میں تو یہ جانتی ہوں کہ وہ اکیلے ہیں، میری دھی، میری نکی موت کے منہ میں ہے، ان کو ہماری لوڑ ہے اس ویلے۔ میں جاؤں گی، میرا کون ہے، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، میں مر بھی جاؤں پھر بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" ماسی بھاگاں نے قدم آگے بڑھائے۔

"جھلی ہو گئی ہے، مت ماری گئی ہے شودی کی، جانے دو اسے۔" ہجوم چیخا، ہجوم بڑا ضرور ہوتا ہے مگر اس میں حوصلہ نہیں ہوتا!!

پھر ایک سکوت چھا گیا، باہر سکوت مگر اندر شوریدہ سر آندھیاں چیخ رہی تھیں۔

"وہ اکیلی ہے، وہ فقیراں والی کی دھی ہے، وہ مر رہی ہے، شیدا کمہار اکیلا ہے، گوری رورہی ہے......"

ہجوم نے سر جھٹکا، ہجوم کو ایک لیڈر درکار ہوتا ہے، یہاں لیڈر تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا!!

"وہ مرجائے گی، وہ مرجائے گی، وہ مرجائے گی......"

طوفانی ہوا دیوار بدن سے ٹکرائی اور جسم و جاں کی بنیادیں ہلادیں۔

ہجوم نے گھبرا کر سر پکڑا، ہجوم کی ازلی کم ہمتی اس وقت عروج پر تھی۔ ہجوم میں ضروری نہیں ہوتا کہ ہونٹوں کی بات ہی اصل بات ہو، بلکہ ہجوم کا ہر فرد ایک دوسرے سے ڈر رہا ہوتا ہے کہ ساتھ والے کو دل کے اندر رکھی بات کی بھنک نہ پڑ جائے۔ اس وقت بھی لیڈر تو تھا مگر اسے لیڈر کون مانتا!

ماسی بھاگاں سسکتی جا رہی تھی، اس کی چادر سر سے اتر کر زمین پر گھسٹ رہی تھی، بجلی کی کڑک ماحول کو لرزا رہی تھی، ماسی بھاگاں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دبیز دھند تھی، اس کا پاؤں کسی چیز میں الجھا اور وہ زمین کی طرف گری، اچانک اسے کسی نے تھام لیا، اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔۔۔ایک نہیں ان گنت ہاتھ تھے!!

ہجوم اس کے پیچھے پیچھے چلتا، اس کے ساتھ کھڑا تھا، ہجوم کو لیڈر مل چکا تھا!!

☆......☆......☆

وہ ایک طوفانی رات تھی بجلی کی کڑک اور دھاڑتے بادل تیز ہوا کے ہمراہ بارش کی بوچھاڑ لاتے اور ماحول لرز کر رہ جاتا۔ فقیراں والی پر ہوا اور پانی کا سیلاب اتر آیا تھا، ایک بھونچال ڈسپنسری کے اندر بھی اترا ہوا تھا، شیدا کمہار کا سارا گھرانہ ڈسپنسری کے برآمدے میں دیواروں سے لگا بیٹھا تھا اور اندر ڈاکٹر چنگیزی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا گلاب کی مردہ ہوتی پتیوں میں زندگی پھونکنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا، زہر خون میں سرائیت کر چکا تھا، سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ کوما، موت، دماغ کو نقصان کچھ بھی ہو سکتا تھا، یہ بھی غنیمت رہا تھا کہ اس نے اپنی این جی او کی مدد سے اس ڈسپنسری میں ہر قسم کی مشینری اور ادویات کا پہلے سے انتظام کروا لیا تھا جو اس وقت اس کے کام آ رہی تھیں۔ گڈی بار بار ابکائیاں لے رہی تھی، سانس مشکل سے لینے کی وجہ سے اس کے جسم کو ہر سانس پر جھٹکے لگ رہے تھے، سب سے پہلا اور مشکل کام سانس کی بحالی تھا، اس کے بعد ہی کچھ اور ممکن تھا، چنگیزی مسلسل مصنوعی تنفس کی بحالی (CPR) کے تحت اس کا دوران خون اور سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا، سینے پر پمپنگ کے علاوہ اس کی ناک چٹکی میں دبا کر اپنے منہ سے سانسیں اس کے منہ میں داخل کرنے کی کوشش بار آور ہوتی نظر آ رہی تھی، تنفس کچھ کچھ رواں ہو رہا تھا۔ چنگیزی کے ہونٹ مسلسل دعا میں ہل رہے تھے، کوئی مددگار نہ تھا سوائے اس ہستی کے جو انسان کی بے بسی میں اس کے سر پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ سانس بہتر ہونے کے بعد چنگیزی نے آکسیجن کا سلنڈر لگا کر سانس میں مدد دینا شروع کی، زخم پر زہر لگا کر خراب کرنے کے علاوہ گڈی کو زہر کھلایا بھی گیا تھا اور ایسا یقیناً اس دوران ہوا تھا جب گڈی کو درگاہ لے جایا گیا تھا۔ چنگیزی نے گیسٹرک سکشن (Gastric Suction) کے لیے گڈی کے منہ کے راستے سے ٹیوب اس کے معدے تک پہنچائی اور الیکٹرک پمپ کے ذریعے اس کے معدے میں موجود مواد کو کھینچنا شروع کر دیا، ذرا سی دیر میں گڈی کا معدہ واش ہو چکا تھا، ایمرجنسی کے لیے کچھ انجکشن موجود تھے جو خون میں زہر کے پھیلاؤ کو روکنے میں مدد دیتے تھے، ان کو لگانے کے بعد چنگیزی محض دعا کر سکتا تھا، وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا جو یہاں پر ممکن تھی، آدھے گھنٹے بعد گڈی کی حالت میں بہتری آنا شروع ہو گئی۔ چنگیزی نے دو انجکشن مزید لگانے کے بعد توانائی کی بحالی کے لیے گلوکوز ڈرپ لگا دی، گڈی کے چہرے کا رنگ اور سانس کی آمد و رفت بحال ہو رہی تھی، اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹ سرخی میں بدل رہی تھی۔ چنگیزی کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوا اور وہ وہیں سجدے میں گر گیا۔

گلاب بکھرنے سے بچ گیا تھا!!

ڈسپنسری کے باہر ایک خاموش ہجوم کھڑا تھا، جس کی آنکھوں میں تشکر تھا مگر زبانیں چپ تھیں!!

☆......☆......☆

گڈی کی صحت یابی نے فقیراں والی کو دو حصوں میں بانٹ دیا، یہ تقسیم تاحال دلوں کے اندر تھی، لوگ بظاہر اس موضوع پر بات نہیں کرتے تھے مگر رائے عامہ پر ڈاکٹر چنگیزی کی قابلیت کا اثر ضرور پڑا تھا۔ انگریزی طریقہ علاج سے نفرت میں کمی آئی تھی اور لوگوں کے شکوک و شبہات خاطر خواہ کم ہوئے تھے۔ شیدا کمہار کا گھر چنگیزی کا بے دام مرید ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ہر محفل میں ڈاکٹر چنگیزی کے گن گاتے تھے۔ اس طوفانی رات چنگیزی نے زبان سے دعوؤں کی بجائے عملی طور پر کر کے دکھایا اور وہ فقیراں والی کے لوگوں کے دلوں میں نقب لگانے میں کامیاب رہا۔

چنگیزی کو ہر وقت اپنے دوست صدیقی کی بات یاد آتی تھی کہ دنیا کا سب سے مشکل کام ذہنوں کو بدلنا ہے اور اس کا مشن سوچیں بدلنا تھا، یہی وہ دائمی تبدیلی تھی جو مستقبل سنوار سکتی تھی ورنہ نہ تو یہاں چنگیزی ساری عمر رہ سکتا تھا اور نہ کوئی اور ڈاکٹر......

ذہنوں میں نقب آہستہ آہستہ لگتی ہے، قطرہ قطرہ بوند کی مانند جو پتھر کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔ چنگیزی جنگ جیتنے کی طرف جا رہا تھا۔

فقیراں والی میں گڈی کو زہر دیے جانے بات عام ہو چلی تھی۔ اس سے اس شک کو بھی تقویت مل رہی تھی کہ شیدے کمہار کی بھینسوں کو بھی زہر دیا گیا تھا۔ اب لوگ چنگیزی سے گپیں لگانے کی حد تک ڈسپنسری کے اندر آنے لگ گئے تھے، گوری گڈی کے ساتھ باقاعدگی سے ڈسپنسری آتی تھی۔ گڈی گوندنیاں کھاتی اور پینگ جھولتی، گوری اس کے پاس کھڑی اس کا خیال رکھتی اور کن انکھیوں سے ڈاکٹر چنگیزی کو دیکھتی جاتی اور نچلا ہونٹ ہلکا سا دانتوں میں دبا کر مسکرائے جاتی۔ اس لمحے اس کے چہرے پر شرمگیں سا اجالا ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

حضوری بابا کا سالانہ عرس بھی پیر مستان علی شاہ اور اس کے حواریوں نے شروع کیا تھا جو رمضان مبارک کی ستائیس تاریخ کو مزار پر منعقد کیا جاتا تھا، مزار کو غسل دیا جاتا، لنگر عام چلتا، قوالی کی محفلیں ہوتیں، مزار پر چادریں اور چڑھاوے چڑھائے جاتے، نت نئے شعبدے دکھائے جاتے، شاید اس کا مقصد سادہ لوح لوگوں کو مرعوب کرنا ہوتا تھا۔ عرس کے موقع پر چوہدری نور محمد مہمانِ خاص کے طور پر موجود ہوتا تھا۔ چندے کے نام پر ایک خطیر رقم مزار کے بکسوں میں پہنچ جاتی تھی۔

رمضان کا مقدس مہینہ اختتام پذیر تھا۔ آج ستائیس رمضان ہونے کی وجہ سے مزار اور درگاہ کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ فقیراں والی اور ارد گرد کے دیہاتوں سے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ پیدل، بیل گاڑیوں اور دوسری سواریوں پر امڈے چلے آرہے تھے، سبھی کے ہاتھوں میں سبز چادریں اور میٹھی چیزوں کے شاپرز تھے۔ ان کی نگاہیں ادب اور احترام سے جھکی جا رہی تھیں۔ مزار کے سامنے دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ ایک طرف دیگیں کھڑک رہی تھیں، مزار کے پہلو میں ایک سٹیج بنا ہوا تھا جس پر چند زرق برق منقش کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر چوہدری نور محمد اور پیر مستان علی شاہ کے ساتھی براجمان تھے، ایک کرسی پر ڈاکٹر چنگیزی بھی بیٹھا تھا، اسے خاص طور پر بلاوا آیا تھا، اس نے بھی بائیکاٹ کرنے کی بجائے جانا بہتر سمجھا تھا، ویسے بھی فقیراں والی کے بچے بچے کے لیے اس تقریب میں شرکت لازم تھی۔ لوگ ڈاکٹر چنگیزی کو بھی تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اکثر نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اس کا تذکرہ گھر گھر ہوتا رہتا تھا۔

پیر مستان علی ابھی اپنے حجرے کے اندر ہی تھا، اسی کا

انتظار کیا جا رہا تھا۔ عقیدت مند سب سے پہلے مزار پر حاضری دیتے، قبر کو چومتے، ادب سے آنکھیں بند کر کے دعا مانگتے، چادر ساتھ کھڑے مجاور کے حوالے کرتے، صندوقچی میں نقدی ڈالتے اور باہر دریوں پر آ کر بیٹھ جاتے۔

کرسیوں کی ایک سائیڈ پر آگ کا الاؤ روشن تھا، شعلے اپنی زبان لپلپا کر ہر شے کو نگلنا چاہ رہے تھے۔ کالے چولے میں ملبوس ایک ملنگ آگ کو روشن رکھنے کے کام پر لگا ہوا تھا جبکہ دوسرا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھ کو آگ کی طرف جھٹکتا تو شعلوں کا رنگ بدل جاتا، کبھی سبز اور کبھی نیلے شعلے بھڑکنے لگتے، سبز اور نیلی آگ سادہ لوح لوگوں میں خوف پیدا کر رہی تھی۔ وہ ڈرے ہوئے اور مرعوب نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر چنگیزی درگاہ والوں کی حرکتوں سے اب محظوظ ہو رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ آگ کے پاس کھڑا ملنگ محض شعبدے بازی کر رہا ہے جو سادہ لوح لوگوں کے لیے کرشمے کی حیثیت رکھتی ہے، کاپر سلفیٹ، کھانے کا نمک اور اس جیسے دوسرے کیمیکلز آگ پر چھڑک کر آگ کا رنگ بدلنا ایک معمولی سی بات تھی، یقیناً ملنگ کی مٹھی میں بھی کچھ ایسے ہی کیمیکلز تھے جن سے ان کی دکانداری چل رہی تھی۔

پیر مستان علی شاہ کو ڈاکٹر چنگیزی نے پہلی بار دیکھا، اپنی چنڈال چوکڑی کے ہمراہ وہ حجرے سے برآمد ہوا، اس کے ایک حواری کے ہاتھ میں پانی کا بھرا جگ تھا، مستان علی شاہ پانی کی طرف ہاتھ کو جھٹکتا تو پانی میں آگ لگ جاتی، اس کے مریدین سجدے میں گر گئے اور اس سے معافی کی بھیک مانگنے لگے، انہیں لگ رہا تھا کہ آج پیر جی غیض و غضب سے لبریز ہیں۔ پیر صاحب کے حامیوں نے نعرے لگا کر اس کا استقبال کیا، چنگیزی سائنس سے شد بد رکھنے کی وجہ سے بخوبی جانتا تھا کہ سوڈیم دھات کو پانی میں ڈالا جائے تو پانی میں آگ لگ جاتی ہے، یہ ایک عام سی بات تھی جس کو یہ بہروپیے ان پڑھ لوگوں کی برین واشنگ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ چنگیزی حیران تھا کہ لوگ اس کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے، اس کے پاؤں چوم رہے تھے، اس کے رستے کی مٹی سر پر ڈال رہے تھے، پاؤں کی خاک کپڑے میں باندھ کر محفوظ کر رہے، پیر مستان علی شاہ ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ملنگوں کی لمبی ہُو فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی، کچھ مجاور وجد اور مستی میں چمٹے کی تال پر سر مار رہے تھے، ان کے لمبے رسیوں کی صورت بڑے بال ناگوں کی طرح لہرا رہے تھے، مجموعی طور پر یہ ایک ہیبت طاری کر دینے والا اور سحر انگیز منظر تھا۔

پیر مستان علی درمیان کی بڑے والی منقش کرسی پر آ کر بیٹھ گیا، اس نے سفید جبہ اور سفید پگڑی پہنی ہوئی تھی، ہاتھ میں ایک لمبی سی تسبیح تھی جس کے دانے وہ ہونٹ بدبداتے ہوئے تیزی سے گرائے جا رہا تھا۔ چوہدری نے اٹھ کر گھٹنے چھو کر اس کا استقبال کیا، ڈاکٹر چنگیزی سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا، چوہدری اور پیر مستان علی شاہ نے خون آشام نگاہوں سے چنگیزی کو گھورا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، پیر صاحب کے حواریوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی تکہ بوٹی کر دیں، مجمع پر ایک سکوت مرگ طاری تھا۔

''گلاب دین کی بچی کو لاؤ۔''

پیر مستان علی شاہ کی پاٹ دار آواز نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔

دو مجاور نگو کا ہاتھ تھامے الاؤ کے پاس لے آئے، نگو کے چہرے پر نقاہت تھی، اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ ایک ہفتے کے مسلسل بخار نے اسے نچوڑ لیا

تھا،اس کا چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر ڈاکٹر چنگیزی کو شبہ ہوا کہ بچی کو ملیریا ہے مگر یہ لوگ جانے کس ڈگر پر چل رہے تھے، علاج لیٹ ہونے کی وجہ سے بچی کی جان بھی جا سکتی تھی مگر اسے معلوم تھا کہ دنیا کا سب سے مشکل کام عقیدہ، خیال اور سوچ بدلنا ہے۔

☆......☆......☆

نگو کا لاغر جسم درخت سے بندھا فضا میں لٹکا ہوا تھا۔

''چلا جا، چلا جا، ورنہ بھسم کر دیں گے ہم تمہیں۔'' مستان شاہ بانس کی لچکدار چھڑی نگو کی نازک پھول جیسی کمر پر برساتے ہوئے دھاڑا، نگو کا کمزور جسم ہر ضرب پر ایک زوردار جھٹکا لیتا، اب تو اس میں چیخنے کی سکت بھی نہیں بچی تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی بخار کی نقاہت، چھ سات سال کی عمر اور تنومند پیر کی بانس کی ضربیں اسے موت کی طرف دھکیل رہی تھیں، اس کی کمر پر خونی لکیریں ابھر آئی تھیں، لوگوں کے ہجوم پر سکتہ طاری تھا، عورتوں کی طرف سے دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

گلاب دین اور اس کی بیوی ایک طرف بیٹھے کانپ رہے تھے، ہر ضرب پر ان کا دل پھٹ سا جاتا، وہ مر جاتے اور پھر دوبارہ جی اٹھتے ایک بار پھر مرنے کے لیے۔

''بڑا ہٹ دھرم اور خبیث جن ہے، یہ ایسے نہیں مانے گا، اس کو آگ سے داغنا پڑے گا''

مستان علی شاہ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''ماف کر دیں پیر صاب، میری نگو مر جائے گی۔ یہ مر رہی ہے پیر صاب، مافی پیر صاب، بخش دیں ہمیں پیر صاب۔'' گلاب دین کی بیوی بلکتی ہوئی پیر صاحب کے قدموں سے لپٹ گئی۔

مستان علی شاہ نے اسے زور سے ٹھوکر ماری اور وہ لڑھکتی ہوئی ایک طرف جا گری۔

''مخول کرتے ہو مستان علی شاہ سے، شک کرتے ہو مجھ پر، آج سب کی آنکھیں کھول دوں گا، گرم سلاخ لاؤ۔'' مستان علی شاہ اتنی زور سے دھاڑا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

چنگیزی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان سب کو قتل کر دے، اتنی جہالت، اتنا ظلم اور اتنی ضعیف الاعتقادی اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نگو موت کی طرف بڑھ رہی تھی اور کسی کو اس کا احساس نہیں تھا، کوئی اپنی عقیدتوں کی دیوار کے پرلی طرف جھانکنے کو تیار نہیں تھا۔

مستان علی شاہ کے ہاتھ میں دہکتی ہوئی گرم لوہے کی سلاخ تھی اور وہ نگو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں درندگی تھی، وہ انسان کی آنکھیں نہیں ہو سکتی تھیں، آنچ دیتی آنکھیں!

ایک آگ چنگیزی کو لپیٹ میں لے رہی تھی، اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے اندر کیسا آتش فشاں پھٹا، وہ کون سی طاقت تھی، وہ کون سا لاوا تھا جو اس کی کھوپڑی سے ٹکرایا تھا۔ وہ جنون تھا یا پاگل پن، اسے کچھ نہیں پتا تھا کہ کیسے وہ اپنی کرسی سے بجلی کی طرح لپکا اور گرجتا ہوا پیر مستان علی شاہ پر جا پڑا، اگلے لمحے مستان علی شاہ کی گردن اس کے بازو میں جکڑی ہوئی تھی اور دہکتی سلاخ چنگیزی کے ہاتھ میں تھی۔

مستان علی شاہ خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ سانس لے رہا تھا، اس کی آنکھیں باہر ابل رہی تھیں، دہکتی سلاخ اس کی آنکھوں کے قریب تھی۔

''گردن توڑ دوں گا میں اس کی۔ جلا دوں گا اسے، رک جاؤ اپنی اپنی جگہ پر سب۔'' چنگیزی پیر مستان علی شاہ کے حواریوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر للکارا، وہ سب ایسے رک گئے جیسے کھلونے سے چابی ختم ہو جائے۔

''کیا آج بھی نہیں جاگو گے تم لوگ۔ کیا ابھی

مزید بچے مروانے ہیں تم لوگوں نے۔ کیا جنازے اٹھا اٹھا کر تھکتے نہیں ہو تم لوگ۔ کیا یہ جگر کے ٹکڑے پیارے نہیں تم لوگوں کو۔ شرم کرو، غیرت کھاؤ فقیراں والی کے باسیو، یا آج اٹھ جاؤ یا پھر اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے جا کر مار دو اور آنے والی عید اپنے پیاروں کی لاشوں کے ساتھ منانا۔"

ہجوم بے حس، ساکت، بے تاثر تھا۔

"اگر آج تم لوگ نہیں جاگے تو یہ درندے تمہاری نسلوں، تمہاری عزتوں کو چیر پھاڑ دیں گے۔ اس بچی کو صرف بخار ہے، میں ٹھیک کروں گا اسے۔ دیکھو یہ مر رہی ہے، یہ مر جائے گی۔"

چنگیزی نے تڑپ کر کہا، جانے کب آنسو اس کے گالوں سے لکیریں بناتے شجر کے سوکھے پتوں کی مانند گرنے لگے۔ آج وہ اپنے آپ میں کب تھا۔

ہجوم میں مکھیاں سی بھنبھنانی شروع ہوئیں۔ ایک تذبذب تھا جس میں ہجوم مبتلا تھا۔ شاید یہ پہل کرنے کا تذبذب تھا، کون پہلے آگے بڑھے، کون پہلا پتھر مارے......

ہجوم کو ہمیشہ ایک لیڈر درکار ہوتا ہے، پھر یہ وحشی ہجوم محلات کو تنکوں کی طرح اڑا دیا کرتا ہے، ظلم کی زنجیریں توڑ دیا کرتا ہے، مگر یہاں کوئی پہل نہیں کر رہا تھا، چنگاری بھڑک چکی تھی جسے اب الاؤ بننا تھا۔

مزار کے مجاور پہلو بدل رہے تھے، دانت کچکچا رہے تھے، وہ چنگیزی کے گرد گھیرا ڈالنے کی فکر میں تھے مگر ان کا ان داتا بری طرح شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

اچانک ہجوم میں حرکت ہوئی...... مبہم سی حرکت، کوئی اٹھا، لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا...... گرتا پڑتا اٹھا۔ ایک ناتواں وجود، ایک کمزور نازک بدن، روتا بلکتا، سسکیاں بھرتا پیکر......

یہ گوری تھی، شیدے کمہار کی بیٹی، ایک غریب اور کمی کہلانے والے شخص کی دھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ بلکتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہجوم چپ تھا، لوگوں کی آنکھوں میں حیرت ثبت تھی، وہ پیر مستان علی شاہ کے قریب آئی اور اپنے ناتواں ہاتھ میں پورے بدن کا غضب سمو کر ایک زوردار تھپڑ مستان علی شاہ کے چہرے پر مارا، پیر مستان علی کا چہرہ ایک طرف گھوم گیا، ایک تھپڑ، دوسرا تھپڑ، تیسرا تھپڑ۔ ہجوم حیران تھا۔

"بہت قتل کر لیے ہمارے بچوں کے تو نے،
بہت پھول نوچ لیے ہمارے تو نے، کلیجے خالی کر دیے تو نے ظالم درندے۔ خون پی جاؤں گی تیرا، چیتھڑے کر دوں گی تیرے!!" گوری کے اندر سے وحشت پھنکارتی ہوئی اُمڈ رہی تھی۔

ہجوم جو اب تک ساکت تھا، اس میں ایک لہر پیدا ہوئی، ہجوم کو لیڈر مل چکا تھا، آنکھوں میں وحشت کا بھانبڑ جل اٹھا، جس کے ہاتھ جو آیا وہ اٹھا کر پیر مستان علی شاہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف دوڑا۔ پیر کی آنکھوں میں دہشت اور بے یقینی تھی، اس کا بنایا طلسم ایک ہی پھونک سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا سیٹ اپ تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے جا رہا تھا، اس کے ملنگ ہجوم کے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ چوہدری بھی وہاں سے فرار ہونے کے چکر میں تھا، کچھ باغی اس کا بھی گھیراؤ کر رہے تھے۔

ہجوم...... وحشی ہجوم...... بے لگام ہجوم ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا، سچ مسکرا رہا تھا۔

ڈاکٹر چنگیزی کی آنکھوں میں سکون اتر رہا تھا، اس نے نگو کو اٹھایا اور ڈسپنسری کی طرف دوڑا۔ اسے آج پھر ایک گلاب کو بکھرنے سے بچانا تھا اور گلاب دین کے آنگن میں عید کی خوشیوں کے گلاب بکھیرنے تھے!!

☆☆......☆☆

افسانہ

غصہ حرام کیوں ہے۔ اس کا احساس تو بعد میں ہوتا ہے اور دو چار دن بعد شانی کا پاسپورٹ ٹکٹ بھی میز پر رکھا تھا۔ شانی حیران پریشان اس نقل مکانی کے اسباب پر بیٹھا غور کر رہا تھا۔ وہ کچھ سامان لینے شانی کے ساتھ گئی کہ سامنے لندن کے......

عید کی خوشیاں دوبالا کرتا ایک حساس افسانہ

رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا تھا اور اس بار وہ اپنے گھر تھی، روزے اور افطار کے مزے لوٹ رہی تھی۔ مگر اس کا دل خالی خالی سا تھا۔

عید آ رہی تھی۔ ہر سال کی طرح فضاؤں میں روشنیوں اور رنگ و نور کی بارش ہو رہی تھی۔ سماعتوں میں سرگوشی بصارتوں کو نور بخشتی دلوں

میں محبتوں کی لو جگاتی۔ ستاروں بھرا آسمان چاند کے نور سے منور ہو رہا تھا اور اس کی روشنی دلوں میں خوشی بن کر اترتی تھی۔ دلوں سے نفرتیں اور کدورتیں دھل گئی تھیں۔ دوریاں ختم ہو گئیں۔ بچھڑے مل گئے اور محبتوں کی فضا رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی ہر طرف۔

بھیا کا فون سن کر اس نے نماز ادا کی اور پھر کھانا سرو کرنے کچن میں آئی تو دیکھا۔ ایک روایتی شوہر کی طرح منہ پھلائے فرہاد خود ہی کھانا کھا رہے تھے۔ اس کی ذرا بھی پروانہ بھی گویا۔

یہ بھی کوئی بات ہے بھلا! محبت و چاہت کا یہ نجانے کون سا انداز ہے؟ انہوں نے کھانا ختم کیا اور ٹینی باز کی جانب مڑ گئے۔ اس کے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہا۔ لہٰذا روسٹ چکن اور سلاد وغیرہ فریج میں رکھنے لگی۔ وہ جام لے کر ٹیرس پر چلے گئے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے چند لمحے سوچا۔

ناراضگی کا سبب جاننے کی ضرورت نہیں تھی؟ اس لیے میں سائیڈ لیمپ بجھا کر سونے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔ جب بھی فرہاد ضرورت سے زیادہ پی جاتے کسی بھی بات کو ایشو بنانے سے ہر ممکن گریز کرتے ہوئے وہ کئی کئی دن کتراتی رہتی۔ یہی اس کی کامیابی تھی۔

صبح لیموں کے پانی میں نمک شہد حل کر کے فرہاد کے لیے لے کر گئی تو بمشکل تمام انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ لمحوں بعد یاد آ گیا کہ رات کس بات پر موڈ خراب تھا تو کہنے لگے۔

''تم چلی جاؤ گی تو میری خدمت اور دیکھ بھال کون کرے گا؟ جانتی ہو اچھی طرح کہ مجھے غم زدہ اور اپ سیٹ بیوی اچھی نہیں لگتی۔'' وہ مسکرا دی۔ ناشتے کے بعد وہ آفس جاتے ہوئے بولے۔

''آج میں تم کو پک کر لوں گا۔ بس سے مت آنا۔ عرصہ ہو گیا اپنے فیصل آبادی دوست رفیق کے گھر نہیں گئے۔ راستے ہی سے کچھ کھانا پینا خرید کر لے چلیں گے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سارے کاموں سے وہ گیارہ بجے تک فارغ ہو گئی۔ بارہ سے پانچ تک شاپ میں رہتی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے نیچے آ گئی۔ اس نے آس پاس کی رونق سے بھرپور، رواں دواں زندگی کو ایک نظر دیکھا۔

نجانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ اس آزاد دنیا سے اس کا دل بیزار ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی لاہور جاتی اس کی سہیلیاں اور کزنز اس پر رشک کرتی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی پردیس کی تنہائی، غریب الوطنی اور اپنوں سے دوری کا احساس نہ تھا۔

وہ چھوٹی سی عمر میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئی تھی۔ یہ بابا ہی تو تھے جنہوں نے اپنی جوانی ان دونوں بہن اور بھائی کے لیے قربان کر دی تھی۔ خاندان والوں، عزیزوں اور دوستوں نے بڑا سمجھایا کہ دوسری شادی کر لیں لیکن وہ نہیں مانے۔ انہوں نے شاندار تعلیمی اداروں میں جاسم اور روحی کو تعلیم دلوائی۔ عملی زندگی کی کامیابی کے گر سمجھائے۔ اکثر روحی کو یہ شکوہ ہوتا کہ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے سے دور کیوں کیا؟ روحی کی پھوپو نے بہت چاہا کہ ان کے اکلوتے بیٹے احتشام سے اس کی شادی ہو جائے اسے بھی احتشام میں درحقیقت کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی لیکن اس کے بابا کو ایک ایسے چمکدار ستارے کی تلاش تھی۔ جو ان کی بیٹی کو روشنی سے منور رکھ سکے۔

جاسم نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے شریکِ سفر کے چناؤ میں بہت

سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد اس پر فرہاد کی شخصی چمک، ان کی عملی قابلیت اور اعلیٰ عہدے کی چلمنوں میں ان کے مے نوشی اور کبھی کبھار کیسینو جانے کی خواہش کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے مطمئن و سرشار بابا کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس عذاب مسلسل کو سہنا یا برداشت کرنا ہی تھا۔ اسے وہ دن اب بھی نہیں بھولا تھا جب اس کی شادی کو ہفتہ ہی گزرا تھا اور وہ ایک دعوت سے واپسی میں، کچھ دیر کے لیے بابا کے ہاں رُک گئی تھی۔ خانساماں شاید سو گیا تھا۔ اس لیے احتشام ان کے لیے کافی بنانے کچن میں آ گیا تھا۔ اچانک اس نے روحی کو مخاطب کیا۔

''زندگی میں کبھی تمہیں کسی سے کوئی پریشانی لاحق ہو تو تم مجھے اپنا بہترین دوست اور مشیر پاؤ گی۔'' اس کی دوربین نگاہوں نے نجانے کیا بھانپا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''تمہارے بابا نے جتنے ناز و نعم سے تم کو پالا ہے ناروحی، اتنی ہی سنگ دلی سے تم کو اپنے سے دور بھی کر دیا ہے۔''

اس کے لبوں پر سسکی آ کر دم توڑ گئی۔ وہ خود کو سنبھال کر باہر نکل آئی۔ یوں احتشام کا اس گمبھیر لہجے میں بات کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا یا شاید وہ کسی بھید کو چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

بارش اور موسم کی خرابی کے باعث ساڑھے چار بجے سے ہی دکانیں بند ہونے لگیں۔ وہ بھی میکڈونلڈ میں جا گھسی۔ کوئی جگہ خالی نہ تھی لہٰذا اُلٹے پاؤں نکل آئی۔ دفعتاً اس نے فرہاد کی گاڑی دیکھ لی۔

''شکر ہے تم مل گئیں۔ میں تو پریشان ہو رہا تھا۔'' وہ بولے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کھانے پینے کا انتظام کر کے آئے ہیں؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

مست ملنگ سا وہ شخص اسے اس لیے بھی گوارا تھا کہ وہ مے نوش ہرگز نہیں تھا۔ اس کی سادہ لوح بیوی بھی پُرخلوص عورت تھی۔ مشرقی روایت کے مطابق کھانے کا انتظام تھا۔ لیکن وہاں اپنے علاوہ کسی اور کو بھی موجود دیکھ کر وہ چونک گئی۔ دراز قد، تیکھے نقوش اور بڑی بڑی جھیل جیسی گہری آنکھوں والی خاتون فرہاد کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔

''اوہ فرہاد! ہاؤ آر یُو؟'' اس نے اپنی لمبی مخروطی انگلیوں والا ہاتھ بے حد بے تکلفی سے فرہاد کی مضبوط انگلیوں میں پھنسا کر کئی پُرخلوص جھٹکے دیے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد فرہاد لندن شفٹ ہو گیا تھا۔ باقی بھائی اور والدہ امریکہ۔

''مجھے یقین نہیں آتا بیلی، ویس اِز یُو؟'' فرہاد کا لہجہ ہی عجیب تھا۔

''درمیان میں کتنے ڈھیر سارے سال آ گئے پر تم نہیں بدلے۔'' اس کی موجودگی ان پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔

''اوہو بس بھی کرو۔ اپنی وائف سے تو ملواؤ۔ ورنہ گھر جا کر مار کھانی پڑے گی۔ کیوں بھابی؟'' رفیق درمیان میں کود پڑا۔ تعارف والا مرحلہ بھی طے پا گیا۔

''ہم لوگ پڑوسی ہونے کے علاوہ بہترین دوست بھی تھے۔ بیڈمنٹن ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم اچھے لکھنے والوں کی انگریزی کتب کا تبادلہ بھی کرتے رہتے تھے۔'' وہ درمیانی عمر کی مگر قیامت خیز سراپے کی مالک عورت کہہ رہی تھی۔

''گھر جا کر چیک کر لینا بھابی، ہوسکتا ہے کسی ناول یا کتاب میں کوئی سوکھا گلاب کا پھول مل

جائے۔"
رفیق نے لقمہ دیا۔ اس نے مسکرا کر دیکھا۔ فرہاد بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔
"تم یہاں کیسے؟" وہ بولے۔
"میرے بیٹے کا داخلہ ہارورڈ میں ہو گیا ہے۔ وہ سترہ برس کا ہو چکا ہے۔ یوں سمجھ لو اسے نصیحت کرنے آئی تھی کہ بیٹا پڑھائی میں زیادہ دل لگانا ہے۔" وہ بنگالی لب و لہجہ میں نرم گفتاری سے بات کرتی تو مخاطب پلکیں جھپکانا بھول جاتا۔
"اور تمہارے میاں؟"
فرہاد نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بات ٹال گئی۔ اسے شکیلہ نے چپکے سے بتایا کہ وہ طلاق لے چکی ہے۔ اس بات کو بھی دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اب وہ اور شکیلہ ایک اچھے سامع کی طرح منہ بند کیے خاموش بیٹھے ان تینوں کی باتیں سن رہے تھے۔ جو لگتا تھا سیلاب کی صورت رواں ہو چکی تھیں۔ یادوں کی لہریں ہی لہریں تھیں۔
فرہاد نے تو اُسے ہمیشہ ڈھاکہ سے وابستہ تلخ یادیں سُنائی تھیں اور بہت کچھ نیا تھا اس کے لیے جو آج ہی انکشاف ہوا تھا اس پر۔ ہاں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھوپرے کی مٹھائی اور ناریل کا پانی فرہاد کو اکثر یاد آتا تھا۔ وہ ان کے گھر بنا کر بھیجتی تھی۔ اسے اپنی تنگ نظری پر ہنسی بھی آئی اور انجانے خوف نے اسے گرفت میں لیا۔ اس کا شوہر ایک ذمہ دار میچور آدمی تھا۔ لیکن شیطان عمر دیکھ کر نہیں پھسلاتا۔ وہ کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس کی ہر ادا کو سمجھنے والا اس زلفوں کا اسیر۔ اسے نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ فرہاد نے کبھی کسی انگریز عورت کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا، وہ ان سے کراہیت اور گھن کھاتے تھے۔ لیکن سانولی سلونی، عمر کے تیسرے حصے میں کھڑی چالاک و خوب صورت عورت کی جانب اٹھتی ان کی اُداس و پُرشوق آنکھیں اسے گوارا نہ تھا۔ یہ میرا فریبِ نظر بھی ہو سکتا ہے۔ اس فضول سی سوچ کو الفاظ کے جامے پہنا کر وہ فرہاد کی نگاہوں میں گر سکتی تھی۔
اس کے چہرے پر لاکھ کوشش کے باوجود کچھ سائے لہرائے جن کو محسوس کر کے اس معقول عمر کی عورت کے کسے کسائے، سنہری لہجے و رخساروں پر ننھے ڈمپل نمودار ہونے لگے۔ وہ دھیمے سُروں میں اس کے گرد طواف کرنے لگیں۔ وہ فرہاد سے چند سال بڑی تھی لیکن بلا کی پُرکشش تھی۔ فرہاد کی اس کی کیفیات سے لاعلمی ہی ان کی معصومیت کی گواہی تھی اور وہ اس معصوم انسان کو اس شاطرہ سے ہر صورت دور رکھنا چاہتی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ زندگی میں ہلچل مچ جائے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بظاہر جتنی بے پروا، پُرسکون تھی اس کے اندر اتنا ہی زیادہ تلاطم برپا تھا۔ رفیق کو کیا ضرورت تھی اسے منہ لگا رہے تھے۔ اس کے بے باک جملے زہر لگ رہے تھے۔ وہ بھی پیتی تھی، یہ سُن کر وہ سلگ اُٹھی۔
"چلیں فرہاد میں تھکن محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔ یوں محفل برخاست ہو گئی۔ چلتے چلتے اس نے اپنے کانٹیکٹ نمبرز فرہاد کو دیے اور ان کا وزیٹنگ کارڈ لے لیا۔
"اُف توبہ کیسی چلتی پرزہ ہے۔" مسز رفیق نے سرگوشی کی۔ فرہاد نے اسے سرسری طور پر کھانے پر بلانے کا اظہار کیا اور وہ روایتی بیوی بنتے بنتے رہ گئی۔ وہ رات بھر کروٹیں لیتی، نجانے کب تھک ہار کر سوئی۔ اس کے اندر کی اکیلی عورت خوفزدہ تھی۔ وہ خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ خود اعتمادی سے مالا مال لیکن آج اس پر یہ بھید کھلا کہ وہ اپنا اعتماد کھو بیٹھی تھی۔ اسے اس نقصان کا ازالہ کرنا تھا۔ ورنہ کوئی بھی اس خسارے سے اپنا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

فرہاد نے اگلے ویک اینڈ پر ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ ساری تیاری روحی نے کی تھی۔ شام ڈھلے وہ آ گئی۔ سفید ساڑی میں ملبوس، پشت پر ناگن جیسے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سانولی رنگت کچھ نکھری دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ رفیق اور اُن کی مسز بھی مدعو تھے۔ وہ دونوں ابھی کچن سے نکلی بھی نہ تھیں کہ بلبلی گلاس تھامے ٹیرس پر جا کر کھڑی ہوئی تھی۔

ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

مہمانوں کی رخصتی کے ساتھ ہی گھر میں وہ تماشا ہوا جو ان طویل سالوں میں کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ اس نے کچھ کانچ کے ڈیکوریشن پیس توڑ ڈالے۔ فرہاد بھونچکے رہ گئے۔

"ویسے ہی یہ لعنت کیا کم تھی، جو تم اس ذلیل عورت کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگے؟" وہ آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ تڑپ تڑپ کر روئی اور دوسرے کمرے میں جا کر چٹخنی لگالی۔ اس کا دل مکر و فریب کی اس دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ خود غرض دوستوں کے نقلی چہروں سے اُکتا چکی تھی۔ نغموں کی تاثیریں مٹ چکی تھیں۔ پھولوں کا رنگ اُڑ چکا تھا۔

دوستوں کی سرد مہری نے تو دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس دامِ فریب سے نکلنا چاہتی تھی اب۔

اس تمام ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرہاد نے بھی اس سے بول چال بند کر دی۔ اس کا ٹکٹ اور پاسپورٹ تیار کروا دیا۔ ان کے اس رویے سے روحی مجسم ہو کر رہ گئی۔

"تمہارا دماغ جب ہی ٹھکانے پر آئے گا جب تم اپنے باپ سے مل آؤ گی۔" انہوں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میں شانی کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ میری واپسی کی امید کم ہے۔" اس نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

غصہ حرام کیوں ہے۔ اس کا احساس تو بعد میں ہوتا ہے اور دو چار دن بعد شانی کا پاسپورٹ ٹکٹ بھی میز پر رکھا تھا۔ شانی حیران پریشان اس نقل مکانی کے اسباب پر بیٹھا غور کر رہا تھا۔

وہ کچھ سامان لینے شانی کے ساتھ گئی کہ سامنے لندن کے مہنگے ترین سپر اسٹور سے نکلتے ہوئے بلبلی اور فرہاد نظر آئے۔ وہ پتھر کی ہو گئی۔ وہ دونوں سامان کے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ فرہاد کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس مڑ گئی۔

☆......☆......☆

اس رات کوئی جنگ نہیں چھڑی ٹی وی دیکھتے ہوئے انتہائی نرمی سے فرہاد نے واضح کرنا چاہا۔

"وہ تمہارے ساتھ شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن تمہارا موڈ آف تھا۔ اس لیے یہ مصیبت میں نے جھیلی۔ تم جانتی ہو شاپنگ سے میں الرجک ہوں۔ لیکن مجبوری تھی۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگلے دن ان کے درمیان سخت خاموشی محیط رہی۔ اس نے بوریا بستر سمیٹ لیا اور اس شخص اور گھر کو اللہ کے حوالے کیا۔

"میں تم کو مس کروں گا شانی۔ جلدی آنا۔" وہ شانی کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے روحی سے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ منہ پھلائے رہی۔ جہاز میں شانی نے اس سے پوچھا۔

"آپ کی پپا سے لڑائی ہو گئی ہے مما؟"

"نہیں سونے دو مجھے۔" اس نے نرمی سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ سب کچھ بھولنا چاہتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اُسے یہ ڈور باندھنے کی خواہش تھی۔ اس لیے کہ اس کے مہربان باپ کو کوئی دھچکا نہ لگے۔ وہ اس کی ویران واُداس آنکھوں کا بھید نہ جان لیں۔

☆......☆......☆

ایئرپورٹ پر جاسم بھائی، بھابی ان کے بچے اعتشام بھی موجود تھے۔ بابا اسے دیکھ کر رو پڑے۔ وہ سخت نڈھال اور کمزور ہو چکے تھے۔ اسے کافی دیر سینے سے لگائے روتے رہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ جی جان سے ان کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔

جاسم بھائی کے علاوہ ایک ملازم لڑکا موجود رہتا تھا جو فل ٹائم ان کی دیکھ بھال میں حاضر رہتا۔ لیکن اب وہ اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کرتی، ان کے مفلوج پاؤں کی مالش کرتی، دوا کھلاتی۔ وہ کانپتے ہونٹوں سے دعائیں دیتے۔

اعتشام بلاناغہ آتا اور ان کی تیمارداری میں ہاتھ بٹاتا۔ روحی کو اس کی بیوی پر حیرت ہوتی۔ نجانے کس مٹی سے بنی تھی۔ وہ دن دیکھتا نہ رات، وقت دیکھتا نہ پہر اٹھا چلا آتا۔ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اس نے بھابی سے حیرانگی ظاہر کی تو بولیں۔

''ہاں روحی اس نے شروع دن سے اپنی بیوی کو یونہی سا مقام دے رکھا ہے۔ بہت خشک آدمی ہے بھئی۔'' وہ حیران تھی جس شخص کے دل میں دوسروں کے لیے پیار ہو۔ وہ اپنی شریک سفر سے اتنا خشک رویہ کیسے رکھ سکتا ہے۔ تب اس نے فیصلہ کیا وہ کسی قیمت پر اس کو اپنے دل کے بھید تک نہیں پہنچنے دے گی۔

اس کا سامنا کم سے کم کرتی۔ بابا کی طبیعت بہتری کی جانب مائل تھی۔ ایک دن وہ بولے۔

''میں نے غلطی کی جو تمہیں دور بھیج دیا۔ میری روحی تیری آنکھوں کے جگنو بجھ سے گئے ہیں۔ تیری ہنسی کھو گئی۔'' وہ موم ہو گئی لیکن خود کو سنبھال لیا اور آنسوؤں کا گولہ حلق میں اتار لیا۔

''یہاں پر بجلی کی لوڈشیڈنگ، گرمی، پولوشن، مہنگائی، دہشت گردی، نوکروں کے جھنجٹ، کیا ہے یہاں پر؟'' اس نے مصنوعی پن سے کہا۔

''تمہارا بابا بھی تو یہیں ہے۔'' وہ درد سے مسکرائے۔ وہ چپ رہ گئی۔ کیا کہہ سکتی تھی۔ قطرہ قطرہ جس زہر کو اس نے اپنے اندر اُتارا تھا۔ اس نے روحی کا تن بدن بھسم کر دیا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے، بس آپ میرے ہمراہ چلیے۔'' اس نے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''تم بلا لو نا فرہاد کو یہاں۔ ہمیشہ کے لیے اِدھر آ جائے اپنوں میں۔''

☆......☆......☆

ایک ماہ پر لگا کر اڑ گئے۔ شانی کو اسکول واپس جانا تھا۔ اس نے رواداری میں فون ملایا تو انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شانی کو اب یہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہیں کسی بہترین اسکول میں داخل کرا دو۔'' روحی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ ناسمجھی میں کیا ہو گیا۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔

وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں بیمار پڑ گئی۔ تین دن غشی کے عالم میں گزر گئے اور وہ اسی کیفیت میں سب کچھ بول گئی اور اعتشام نے اس کے دل کا بھید پا لیا۔

وہ مرجھا کر رہ گئی۔ چہرہ زرد اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ بیماری نے اس کی کمر ہمت توڑ ڈالی۔

☆......☆......☆

''یہ تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟'' اعتشام کی آواز سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو گنگ رہ گئی۔ سامنے فرہاد کھڑے تھے۔ گھر میں ہلچل مچ گئی۔ وہ حیران اٹھنے کی کوشش میں ہانپ کر رہ گئی۔ وہ بابا کو سلام کرنے چلے گئے۔

''محترمہ پرسوں رات میں تمہاری عیادت کو آیا تھا۔ بخار میں تم نے اپنا آدھا افسانہ غم مجھے سنا دیا۔ فکر

مت کرو۔ میں قابلِ بھروسہ شخص ہوں۔ میں نے فوراً مسٹر فرہاد کو فون کر دیا کہ آ کر دیدار کر لو، پھر نہ کہنا ہم کو خبر نہ ہوئی۔" فرہاد بابا کو سہارا دے کر لائے تو احتشام نے کہنا شروع کر دیا۔

"ہاں جی تو میں نے سوچا فرہاد بھائی کو دیدار کا موقع دے ہی دیں۔" فرہاد مسکرا کر رہ گئے۔

"کیسے آ گئے اچانک؟" اس نے بے ربط انداز میں پوچھا۔

"دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میرے بنا کیسے رہتی ہو؟ مجھے بھی تو حق ہے شک کرنے کا؟" وہ دھیرے سے بولے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب باتوں میں مصروف تھے۔ کھانے کی میز پر بابا نے فرہاد سے کہا۔

"بیٹا یہاں اپنوں میں چلے آؤ۔" وہ مسکرائے۔

اس نے بے اعتباری کے عالم میں دیکھا۔

"میرا یہی ارادہ ہے جی۔ اس مرتبہ کوئی کاروباری لائن سیٹ کر ہی لوں گا؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"بس بس، اتنا زیادہ خوش مت کریں محترمہ کو، کہیں روح نہ نکل جائے خوشی سے۔" احتشام بولا۔ تو سب ہنس پڑے۔ اس کا دل اب بھی کثیف تھا۔ وہ کہنے لگے۔

"تمہارے جانے کے اگلے دن اسے بوریا بستر لے کر رفیق کے گھر جانا پڑا۔ تم پوچھنا چاہو تو اس سے پوچھ سکتی ہو کہ میں کیا کرتا رہا ہوں؟ اور ہاں اس رات بیلی نے الوداعی کال کی اور فوری طور پر ڈھاکہ روانہ ہو گئی، اس کی ماں بیمار تھیں وہ چل بسی ہیں اور ......" اس نے ان کا ہاتھ سختی سے دبا دیا۔

"آہستہ بولیے اور کھانا کھایئے۔"

"ایک دو دن میں تھکن اتر جائے تو مجھے بنے بنائے مکان دکھلا دیجئے گا۔ احتشام صاحب! سنا ہے آپ تو انجینئر ہیں۔ گھر بنانے میں ماہر ہیں۔" فرہاد احتشام سے کہہ رہے تھے۔ اس میں نجانے کہاں سے ہمت طاقت آ گئی تھی۔ وہ ہمت کے ساتھ اٹھی۔ کپڑے بدلے، وضو کر کے نماز ادا کرنے چلی گئی۔ اس کی ریاضتوں کا پھل اسے مل گیا تھا۔ اس کا پیا واپس چلا آیا تھا۔ برآمدے میں اسے احتشام مل گیا۔

"کہاں جا رہے ہو، رکو۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"خدارا مجھے پٹواؤ گی، میرا اپنا بنایا گھر ٹوٹ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ ویسے تم اسی طرح خوش رہا کرو۔" احتشام نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

عیدالفطر کا چاند نظر آ گیا تھا۔

چاند رات یوں تو ہر شخص کے لیے اہم ہوتی ہے لیکن روحی کے لیے تو یہ چاند رات اس لیے بھی اہمیت کی حامل تھی کہ فرہاد لوٹ آئے تھے اور ان دونوں کے دل سے ملال دھل گئے تھے۔

یہ چاند رات ارمانوں بھری رات تھی۔ عید کا چاند ان کے لیے ڈھیروں مسرتوں اور خوشیوں کے پیغام لائی تھی۔

"عید مبارک فرہاد۔"

"تمہیں بھی عید مبارک روحی۔"

"میری عیدی......؟"

"عیدی دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم اپنا سب کچھ مجھے سونپ دو۔"

"فرہاد......" اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

فرہاد نے محبت پاش نظروں سے روحی کی طرف دیکھا۔ ان کے سینے سے لگا شافی بڑے اطمینان سے سو چکا تھا۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ ان کی جانب قدم اُٹھا رہی تھی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

آپا کی رخصتی کا منظر اس کے لیے اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا آپا کو اس شخص کے ساتھ جاتا دیکھنا تھا جو کسی طرح بھی اس کی من موہنی آپا کے قابل نہ تھا۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا اپنی آپا ارفع کے نام کے ساتھ تایا زاد اشعر کا......

دردمیں ڈوبا، عید کا ایک رنگ بطورِ افسانہ

جس وقت آپا نے گھر کی دہلیز پار کی کشف نے اُن کے نازک وجود کی لرزش کو صاف محسوس کیا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے رونا آ بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے تو بس حیرت تھی، حد سے زیادہ حیرت...... یہ کیسے ممکن ہے کہ رونے دھونے پر ختم ہونے والی کسی تقریب کو 'خوشی' کی تقریب سے تعبیر کیا جائے، یہ تو ایک ایسا ماتمی جلوس تھا جس میں لوگ زرق برق لباس پہن کر شریک ہوئے تھے اور بس......!

اماں رشتے دار خواتین میں گھری شان سے دلاسے اور مبارکبادیں ایک ساتھ وصول کر رہی تھیں۔ دلاسے بیٹی کو جدا کر دینے پر اور مبارکبادیں اُس بوجھ کے اُتر جانے پر جو ماں باپ کے کاندھوں کو ہمیشہ جھکا کر رکھتا ہے۔ ابا کے تیور البتہ خاصے مختلف تھے۔

اپنے جیسے 'باپ' احباب میں شان سے سر اٹھائے ابا کو دیکھ کر کسی فاتح کا گمان ہوتا تھا۔ کشف کو ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''اونہہ...... سمجھتے تھے منگنی ختم ہو جائے گی تو میری بیٹی میرے در پر پڑی سڑتی رہے گی۔ دیکھ لو، اُن کے بیٹے کو تو اب تک کوئی لڑکی نہ ملی اور میں نے ایک مہینے کے اندر اندر اپنی بیٹی کو رخصت بھی کر دیا۔''

ارد گرد والے ابا کا شانہ تھپتھپا کر اُنہیں سراہ رہے تھے۔ کشف نے اپنے اندر اُترنے والے تمام تیروں کو ہمت سے سہتے ہوئے سوچا۔

'کیسے ماں باپ تھے اُس کے' جنہوں نے ہزاروں خدشات، واہمات، وسوسوں اور خوف کو جہیز کے ساتھ بیٹی کے پلو سے باندھ کر اُسے رخصت کر دیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ جب اُن کی بیٹی اس ناقابلِ قبول جہیز کے ساتھ یہ وسوسے اور خوف، کلنک کے ٹیکے کی طرح ساتھ لے کر جائے گی تو اس کا کیا انجام ہوگا۔

یہ وہی ماں باپ تھے ناں جنہوں نے شعور کی پہلی گرہ کھلتے ہی بیٹی کے کانوں میں رس گھولنا شروع

کر دیا تھا۔
"تجھے تایا ابو کے گھر رخصت ہو کر جانا ہے۔"
اور شعور کی اگلی گرہ میں اشعر بھائی کا نام پھونک کر دوبارہ باندھ دیا گیا تھا، ایسے ٹوٹکے کی طرح جو ساری زندگی آسیب کی طرح بیٹیوں کے خوابوں پر قابض رہتا ہے۔ اور یوں آپا کے انگڑائیاں لے کر بیدار

ہوتے شعور کے ہر پہلو میں ایک ہی نام سماتا چلا گیا، اشعر......اشعر......اشعر

مگر پھر کیا ہوا......؟ آپا کے سارے خوابوں اور ارمانوں کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھا ایک اجنبی کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا۔

اپنے ماں باپ کو "تمغے" وصول کرتا چھوڑ کر کشف اپنے اور آپا کے مشترکہ کمرے میں چلی آئی۔ اذیت اس کے انگ انگ میں زہر بن کر اُتر رہی تھی۔

کس سفاکی سے آپا کے تمام خواب چھین کر انہیں اپنی انا پر قربان کر دیا تھا اس کے ماں باپ نے۔

اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس خوف سے نہیں کہ کوئی اسے روتا ہوا نہ دیکھ لے بلکہ اس مجبوری میں کہ آپا کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں کو سمیٹ کر کسی کونے کھدرے میں دفن کر سکے۔ یہ کرچیاں اس کے پاس امانت تھیں اس کی آپا کی۔ جو اُس کے ساتھ زندگی کے اٹھارہ سال ایسے بتا گئیں کہ وہ اس سے پہلے کبھی شمار بھی نہ کر سکی۔ اکیلے کمرے میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

'آپا!! میری پیاری آپا!' مجھے یہ تو بتا جاتیں کہ مظلوم بیٹیاں اپنے دیرینہ خوابوں کو آنکھوں سے کیسے کھرچ کر نکالتی ہیں؟

لہو اگلتے دل کی سرخی سے عروسی جوڑے کو کیسے تابناک بناتی ہیں؟

میکے کی دہلیز پار کرنے سے پہلے اپنے ارمانوں کو کیسا ہے کفناتی ہیں؟

آپا کی رخصتی کا منظر اس کے لیے اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا آپا کو اس شخص کے ساتھ جاتا دیکھنا تھا جو کسی طرح بھی اس کی من موہنی آپا کے قابل نہ تھا۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا اپنی آپا ارفع کے نام کے ساتھ تایازاد اشعر کا نام سنا تھا۔ اشعر بھائی جب بھی اُن کے گھر آتے آپا کے چہرے پر دھنک رنگ کی چادر ایسے تن جاتی جیسے کسی نے سفید مخمل پر رنگ برنگے شگوفے بکھیر ڈالے ہوں۔ اشعر بھائی کا بہانے بہانے سے اُس کمرے کی طرف دیکھنا جہاں آپا روپوش ہوتی تھیں اُسے بڑا مزا دیتا تھا۔ تایا، تائی کی محبت اور دعاؤں میں آپا کا گلابی ہو جانا اُسے بھی مخمور کر دیتا تھا لیکن پھر اچانک جیسے سب کچھ بدل گیا۔

☆......☆......☆

زبردست گرما گرمی کے بعد بڑے کمرے میں اب گھرا سناٹا تھا۔ آپا میرا ہاتھ اپنی پسینے سے تر مٹھی میں دبائے اگلی آوازوں کی منتظر تھیں۔ پھر ابا کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

"دیکھیں بھائی جان! یہ خاندانی مسئلے اپنی جگہ مگر میں بات سے پھرنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کسی اور کو پھرنے دوں گا۔ جائیداد میں جو میرا حصہ ہے وہ میرے حوالے کریں باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

"مگر تم یہ تو سوچو کہ زرینہ ہماری بہن ہے۔ شرعی اور قانونی طور پر ابا کی جائیداد میں اس کا بھی حق ہے۔" تایا ابا نے نرمی سے کہا تھا۔

"ارے کہاں کا حق؟ اپنی پسند سے شادی کی تھی اُس نے۔ ختم ہو گیا وہ حق اب۔" ابا زور سے دھاڑے۔

"تمہارے کہہ دینے سے اس کا حق ختم نہیں ہو جائے گا۔"

"اِن تین حصوں بخروں میں میرے اور آپ کے ہاتھ کیا آئے گا، یہ تو سوچیے۔" ابا کا لہجہ اونچا تھا۔

"آرام سے افضل، آرام سے۔ بڑا بھائی ہوں تمہارا۔ تم سے زیادہ اونچا بولنا جانتا ہوں۔" اب کے تایا ابو سے بھی برداشت نہ ہوسکا تھا۔ "اپنی حد میں رہو۔ تم خوامخواہ معاملے کو اُلجھا کر نئی اور پرانی رشتے داریوں کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔"

"پرانی رشتے داری تو گئی بھاڑ میں۔ اور نئی رشتے داری کو میں جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔" ابا کے الفاظ کسی بم کی طرح کشف اور ارفع کی سماعتوں پر برسے تھے۔

تایا ابا شاید اس جواب کی توقع نہیں کررہے تھے۔ چھوٹے سے خاندانی مسئلے پر ابا کا اس طرح طیش میں آکر رشتے کی توہین کرنا وہ برداشت نہ کرسکے۔

"ٹھیک ہے پھر۔ اگر میرا بیٹا تمہارے لیے اتنا غیراہم ہے کہ تم ہم سے جڑنے والے اس رشتے کو اپنی ٹھوکر میں رکھتے ہو، تو میرا بیٹا بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں ہے۔" تایا ابو کھڑے ہوئے اور دہلیز پار کرگئے۔

"جاؤ جاؤ، کسی اور گھر میں جاکر رشتے کی بھیک مانگو، میں اپنی بیٹی کسی قیمت پر تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔" ابا نے اپنے فیصلے پر لفظوں کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا تھا۔ یوں محبتوں سے جڑنے والا یہ رشتہ نفرت کے چند بولوں نے منٹوں میں ختم کردیا۔

دونوں گھرانے اپنے اپنے فیصلوں پر اٹل تھے۔ اشعر کا غصہ، دھمکی اور پھر التجائیں کچھ بھی نہ کام آسکیں۔

"ابا! آپ تایا ابو سے چھوٹے ہیں۔ آپ ہی انہیں منانے میں پہل کرلیں۔"

آپا کو دن رات روتے تڑپتے دیکھ کر کشف نے بڑی ہمت سے کام لے کر ابا کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"کیوں؟ بیٹی والا ہوں تو قدموں میں گر جاؤں اُن کے۔" ابا دھاڑے۔

"رشتے جوڑنے والا کبھی چھوٹا نہیں ہوتا ابا۔" کشف نے التجا کی۔

"جانتا ہوں، اسی لیے تو اپنے سے چھوٹے لوگوں کو بیٹی نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

ابا نے سینہ پھلا کر کہا اور اُس وقت کشف نے آپا کی آنکھوں میں ایسی وحشت دیکھی جیسے موت کے حصار میں گھری ہوئی لاچار زندگی۔

"خدا کے واسطے امی! آپا کی طرف دیکھیں۔" اُس نے التجا کا رُخ موڑا۔

"چپ کر بے غیرت! وہ میری بیٹی ہے۔ ماں باپ کی عزت پر مٹ جانے والی۔"

☆......☆......☆

اور پھر امی ابا نے مل کر آپا کو منانے کا بندوبست کرہی لیا۔

ابا نے اپنے دوست کے بیٹے راحت کو آپا کی زندگی میں شامل کرکے ساری زندگی کے لیے انہیں راحت سے محروم کردیا۔

کیا جوڑ تھا آپا اور دولہا بھائی کا؟

وہ کسی طرح بھی آپا کے لائق نہ تھے۔ کم علم، کم رو اور بے ڈھنگی طنزیہ گفتگو کرنے والے دولہا بھائی کو وہ اشعر بھائی کی بددعا تو سمجھ سکتی تھی مگر آپا کا شریک زندگی ہرگز نہیں۔

شریک ضروریات اور شریک زندگی کا فرق آپا اور دولہا بھائی کو دیکھ کر با آسانی نظر آجاتا تھا۔ اُس شخص نے آپا کی زندگی تو کیا ان کی سانسوں تک کو محصور کردیا تھا۔ آپا اپنی نہیں بلکہ اپنے شوہر اور ساس نندوں کی زندگی جی رہی تھیں۔ شادی سے پہلے آلو کے نام سے چڑنے والی اس کی آپا اب رغبت سے آلو کھانے لگی تھیں۔ وہ حیران

ہو کر پوچھ بیٹھی۔

"آپا! تم آلو کب سے کھانے لگیں؟" آپا نے لقمہ نگل کر اُسے دیکھا۔

"شکر کرو، آلو تو میسر ہیں۔ ان آلوؤں کا احسان ہے مجھ پر جو مجھے بھوک سے مرنے نہیں دیتے، ورنہ بوٹیوں پر تو میرا کوئی حق ہے ہی نہیں۔" آنسوؤں سے آلو نگلتے ہوئے آپا نے کہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"اور وہ لوگ بوٹیاں کھاتے ہیں۔"

"ہاں...... میری بھی......" آپا کا جواب اُسے لاجواب کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

خاندان میں کسی کی شادی تھی۔ شادی ہال میکے سے قریب تھا۔ آپا جلد تیار ہو کر میکے میں ہی آ گئی۔

"یہ کیا کپڑے پہن کر آئی ہو؟"

ماں کی جراح پر آپا نے خالی خالی نظروں سے شوہر کی سمت دیکھا۔

"ہمارے ہاں کا جوڑا ہے۔ پورے تین ہزار کا لایا تھا میں۔ کیا برائی ہے اس جوڑے میں بھئی؟" دولہا بھائی تنک کر بولے تھے۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ سارا خاندان جمع ہو گا وہاں۔ نئی نئی شادی ہے۔ تھوڑا چمک دمک ہوتی اس میں تو اچھا لگتا۔" امی داماد کے سامنے منمنانے لگیں۔

"جوڑا تو اچھا خاصا ہی ہے۔ آپ کی بیٹی کے وجود پر اپنی خوبصورتی بھی کھو بیٹھا بے چارا۔ اِس جوڑے پر بھی تو ترس کھائیے ذرا۔" دولہا بھائی کے جواب نے آپا کو شرمسار کر دیا تھا اور امی کو ناراض۔ جب ہی دولہا بھائی کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی بولیں۔

"تیرے تایا لوگ بھی وہاں ہوں گے۔ کیا عزت رہ جائے گی ہماری کہ کیسے بھوکے ننگوں میں بیٹی دی ہے۔ تیرے منہ میں زبان نہیں تھی۔ کہہ دیا ہوتا کہ اپنی مرضی سے کپڑے پہنوں گی۔"

آپا نے حیرت سے امی کو دیکھا تھا۔ رخصت کرتے وقت زبان بندی کا درس دینے والی ان کی ماں اب انہیں زبان درازی سکھا رہی تھیں۔ آپا بے بسی سے دیکھتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

ہمیشہ یہی ہوتا، آپا میکے آتیں اور ان گھنٹے دو گھنٹے کی مہلت میں کبھی چھوٹے کمرے، کبھی دالان تو کبھی غسل خانے میں اپنے خوابوں اور ارمانوں کی میتیں دفنا کر امی کی 'خوش' رہنے کی نصیحت کا پوٹلا اٹھائے واپس چلی جاتیں اور آپا کے جانے کے بعد کشف بیڈ پر رکھے تکیے، کمرے کے کونے میں پڑے گیلے ٹشو پیپرز اور واش بیسن میں آپا کے آنسوؤں کے قطرے تلاش کرتی جاتی اور ساتھ ساتھ آپا کے ارمانوں کے جنازے پر فاتحہ خوانی بھی کرتی جاتی۔ ہر بار یہی ہوتا۔

گیارہ مہینوں میں نہ ارفع کے آنسوؤں میں کمی آئی تھی اور نہ کشف اس فاتحہ خوانی سے اُکتائی تھی۔

آپا کو نئی زندگی کی نوید ملے ساتواں مہینہ تھا جب اُن کے سسرال سے لوٹ کر پہلی مرتبہ امی کو کشف نے بے انتہا مغموم دیکھا تھا۔

"کیسی پیلی پھٹک ہو رہی ہے میری بچی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔"

"مان لیجیے امی کہ ابا کی جلد بازی اور سرا اونچا رکھنے کی خواہش نے آپا کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔" کشف سے رہا نہ گیا۔

"ماں باپ اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ نصیب کا لکھا کسے پتا ہوتا ہے۔" امی نے اُسے بری طرح

جھاڑ دیا۔

"آپ نہ بھی مانیں، تب بھی یہ سچائی بدل تو نہ جائے گی کہ تایا ابو کے سامنے پندرہ دن کے اندر اندر بیٹی کی شادی کہیں اور کر دینے کے دعوے نے آپ کو اور ابا کو اتنا مجبور کر دیا تھا کہ آپا کا جوڑ دیکھے بنا آپ نے انہیں اُس جہنم میں دھکیل دیا۔"

"تھوڑی بہت پریشانی تو سسرال میں ہر لڑکی کو اٹھانا پڑتی ہے۔ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" خلاف توقع امی نے نہایت پست آواز میں وضاحت کی تھی مگر ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اپنی بات پر انہیں خود اعتبار نہیں ہے۔

"اونہہ...... سر کٹانے کے بعد......؟" کشف کے طنز کو امی سمجھ تو گئی تھیں مگر منہ سے کچھ بھی نہ بولیں۔

"آپا کو کچھ دن کے لیے یہاں لے آئیں امی۔ بہت کمزور ہو رہی ہیں وہ۔" کشف کی التجا پر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔

☆......☆......☆

اور پھر آپا کو ایک ہفتہ کے لیے ان کے سسرال والوں نے میکے بھیج ہی دیا۔

"امی! آپ راحت سے فون کر کے پوچھ لیں۔ میں چند دن اور رُک جاؤں یہاں؟" جانے کے نام سے آپا کے چہرے پر بے نام سا خوف اور پریشانی نمودار ہوئی تھی۔

"پوچھا تھا تمہارے ابا نے، منع کر دیا اُس نے۔ کہہ رہا تھا پھر ایسا کرو ساری زندگی کے لیے رکھ لو۔" امی نے غصہ میں جواب دیا تھا۔

"تو رکھ لیں ناں ساری زندگی، ورنہ وہاں تو زندگی ہی نہیں رہے گی۔" آپا نے سرگوشی میں کہا تھا مگر اس سرگوشی نے گھر میں طوفان برپا کر دیا۔

ابا آپے سے باہر ہو گئے۔

"بے عزتی کروا لوں اپنے بھائی کے آگے کہ ایسی جگہ شادی کی کہ بیٹی چار دن بھی نہ بس سکی۔ ایسا سوچنا بھی مت...... اب جو ہے، جیسا ہے اسی کے ساتھ زندگی گزارنا پڑے گی۔" آپا سسک کر خاموش ہو گئیں اور لرزتے ہاتھوں سے جانے کے لیے بیگ تیار کرنے لگیں۔

"ابا! کیا تایا ابو کا طعنہ آپ کی بیٹی کی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔" کشف پہلی بار باپ کے مقابل آئی تھی۔

"ہاں...... مجھے اپنی عزت اور انا تمہاری زندگیوں سے زیادہ پیاری ہے۔"

"تو کیا آپ اپنے بھائی سے کبھی نہیں ملیں گے؟"

"کبھی بھی نہیں۔" ابا سر اکڑا کر بولے تھے۔

اور پھر آپا چلی گئیں۔ اپنے آپ کو ابا کی انا پر قربان کرنے کے لیے اُس کی پیاری سی آپا سسرال لوٹ گئیں۔

☆......☆......☆

دو ماہ گزر گئے۔ رمضان کا آخری عشرہ اختتام پر تھا۔ کشف آپا کی خیریت کے لیے بے چین تھی۔ ماں الگ ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔ آپا کے سسرال میں جانے کے لیے انہیں اپنی انا کو گھر میں چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ بے غیرتی سے وہاں بیٹھ کر طنز اور طعنے سہنے پڑتے تھے۔ اس لیے وہاں جانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مگر پھر کشف سے برداشت نہ ہو سکا۔ شادی کے بعد پہلی عید اور سسرال والوں نے میکے جانے پر پابندی لگا دی۔

"چلتے ہیں امی! جہاں اتنا کچھ سُنا ہے اور بھی سُن لیں گے۔ مجھے آپا کی بہت یاد آ رہی ہے۔ آج

عید کا دن بھی ہے۔" امی تو جیسے اسی بات کی منتظر تھیں فوراً جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

مگر...... ان کو جانا ہی نہ پڑا۔ اُس کی آپا خود آگئی۔

سوختہ لاش کی صورت......

ابا کا شملہ اونچا کرنے کو۔

بچے کی پیدائش سے صرف تین دن پہلے آپا کے سسرال کا "چولہا" پھٹ گیا تھا۔ آگ بجھانے والوں کی انگلیاں تک نہ جھلسیں۔ مگر آپا اور اُس کا بچہ...... دونوں کوئلہ ہوگئے۔

ابا نے کہا تھا...... اب مر کر ہی واپس آنا۔ اور وہ مر کر ہی واپس آئی تھی۔

اُس کا جرم بھی تو کتنا سنگین تھا ناں۔

وہ ایک بے زبان بیٹی تھی اور دوسری بے زبان بیٹی کی ماں بننے جا رہی تھی۔

اتنا بڑا جرم بھلا کوئی کیسے برداشت کرتا۔ سزائے موت تو بنتی تھی۔

ابا دیوار سے لگے بے سدھ کھڑے بیٹی کا جنازہ دیکھ رہے تھے اور کشف، ابا کو! اچانک کشف نے دیکھا ابا دروازے کی سمت دوڑے ہیں۔ اس کی نگاہیں بھی اتنی ہی تیزی سے دوڑی تھیں۔ مگر اگلے ہی پل وہ بپھر کر کھڑی ہوگئی۔

"خبردار!! کوئی ٹوٹا ہوا رشتہ اب نہیں جڑے گا۔" اُس کے تایا اور ابا دونوں جہاں تھے وہیں رُک گئے۔

ابا کی خشک آنکھیں سمندر بنی ہوئی تھیں اور تایا دونوں بازو وا کیے کپکپاتے ہونٹوں سمیت ابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا فائدہ ابا! آپ دونوں کی انا نے میری بہن کی زندگی ختم کردی۔ پچھلی عید گزری، دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں منایا۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ آؤ آج عید کا دن ہے۔ سارے گلے شکوے دور کر کے پھر سے ایک ہوجاتے ہیں اور اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑ لیتے ہیں جس سے میری آپا کی زندگی جڑی ہوئی تھی۔

اب جبکہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ میری آپا نہ رہی۔ آپ پھر سے رشتے جوڑنے لگے۔ کیا آپ لوگوں کو آپا کی موت کا انتظار تھا۔ کیا صرف موت ہی اب ٹوٹے رشتوں کو جوڑ سکتی ہے۔

کشف کی دھاڑ میں اشکوں کی نمی تھی۔ جہاں ابا کے قدموں نے ساتھ چھوڑا تھا اور وہ زمین پر بیٹھتے چلے گئے تھے، وہیں تایا کے دونوں بازو گر چکے تھے مگر کشف کو ان کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔

"خدا کی قسم! اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ ایک موت آپ دونوں کے ملن کا سبب بن جائے گی تو میں اپنی آپا کی خاطر موت کو بخوشی گلے لگالیتی۔"

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"میری آپا نے پچھلی عید پر آپ دونوں کے ملنے کا انتظار کیا۔ دعائیں کیں، مگر آپ نہیں ملے۔ تو اب کیوں؟" وہ چیخی۔

"آپ کی انا اور ہٹ دھرمی نے میری بہن کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ اب میں بھی آپ دونوں بھائیوں کو نہیں ملنے دوں گی۔" وہ بپھر کر کھڑی ہوگئی تھی اور کسی کو فاصلہ پاٹ کر قریب آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

بہت پہلے اُس نے کسی سے سُنا تھا کہ عید ملنے اور منانے کا بہانہ ہوتی ہے۔ مگر اب اس کی جگہ موت نے لے لی تھی۔ اب روٹھنے والے ملنے اور منانے کے لیے موت کا انتظار کرتے ہیں عید کا نہیں۔

اور جب موت بھی اپنا اثر کھو بیٹھی...... تو...... پھر کیا ہوگا؟

☆☆......☆☆

افسانہ

انزلہ کو لگا اس کے پیروں تلے نہ زمین ہے نہ سر پر چھت۔ کامران کا یہ سنگ دل روپ اس کے لیے بالکل انجان تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس سے اپنی مرضی منواتی آئی تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ مرد کو حاکم اللہ نے بنایا ہے۔ وہی گھر کا سربراہ ہوتا ہے......

گھر، گھرہستی سے جڑا ایک روشن افسانہ

"سنیں کامران مجھے عید کی شاپنگ کب کروائیں گے؟" انزلہ نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کروادیں گے یار۔ ابھی تو رمضان شروع ہوا

ہے۔ پانچواں روزہ ہے۔" کامران نے انگڑائیاں لے کر سستی اتارنے کی کوشش کی اور چائے کا کپ اٹھا کر چسکیاں بھرنے لگا۔

"ہاں تو آپ کا ارادہ پھر سے پندرہ رمضان کے بعد کا ہے کیا؟ آپ کو کیا معلوم کہ درزیوں کے کس قدر نخرے ہو جاتے ہیں۔ ریڈی میڈ تو آپ مہنگے ہونے کی وجہ سے لینے نہیں دیتے اور پھر سوٹ آئے تو باقی لوازمات میچنگ جیولری اور جوتے وغیرہ بھی آہستہ آہستہ کر کے لوں گی ورنہ آخری دنوں میں بھاگ دوڑ میں صحیح چیز تو ہاتھ ہی نہیں آتی۔" انزلہ نے اپنی وضاحتوں سے کامران کو راضی کرنا چاہا۔

"تو بیوی اس لیے تو کہتا ہوں کہ عقل مند خواتین کی طرح شعبان میں ہی کپڑے لے کر ٹیلر کو ڈال دو اور باقی چیزیں بھی حتی الامکان خرید لو مگر تم تو بچوں کے کپڑے حتیٰ کہ چادریں تک رمضان کے لیے ہی اٹھا رکھتی ہو۔" کامران نے گو کہ نہایت سادہ لہجے میں انزلہ کو سمجھانا چاہا مگر وہ سخت چڑ گئی اور تنک کر بولی۔

"عقل مند نہیں ہوتی وہ عورتیں...... بے وقوف ہوتی ہیں۔ فیشن کی الف ب بھی نہیں آتی ان کو۔ اور یہ دکاندار سیل کے نام پر بے وقوف بنا کر پرانی چیزیں سستے داموں دے کر خوب لوٹتے ہیں۔ مگر آپ مردوں کو ان چیزوں کی کیا سمجھ۔ آپ کو بس پیسے بچانے سے مطلب ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں پیسے بچانا بیوقوفی کا کام ہے؟ ڈیئر آج کے جدید دور میں جب محض ایک انگلی کی حرکت سے ہر طرح کا کچا چٹھا سامنے آجاتا ہے کون اتنی آسانی سے کسی کو بیوقوف بنا سکتا ہے۔ آج کل میگزینز کے علاوہ ٹی وی اور انٹرنیٹ سے ہر طرح کی اپ ڈیٹ منٹوں میں حاصل ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ دکاندار کا تو کام ہے مطلب نکالنے کا اسی لیے وہ رمضان میں چیزوں کی قیمتیں دگنی تگنی بڑھا دیتے ہیں کہ گاہک کے پاس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ تو ہے نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ گڑیا کا اسکرٹ بلاؤز جو پچھلی عید کے لیے شروع رمضان میں پسند کیا تھا، قیمتوں کی کمی کے انتظار میں چاند رات میں تین سو سے نو سو تک پہنچ گیا تھا۔"

اب کی بار کامران کا لہجہ طنزیہ اور آواز کچھ بلند تھی۔ جسے محسوس کر کے انزلہ نے اپنی ٹون بدلنے میں ہی عافیت جانی۔

"ہاں یہ تو ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ابھی شروع میں ہی شاپنگ کرا دیں۔ بتائیں نا کب چلیں گے۔" وہ اب بچوں کی طرح اٹھلانے لگی تو کامران نے ایک گہری سانس ہونٹوں سے خارج کی اور ٹی وی کا سوئچ آن کرتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی تو تم بچوں سے بھی گئی گزری حرکتیں کرتی ہو۔ کرا دوں گا! ابھی تو رمضان کا راشن ڈالا ہے۔ ذرا رک جاؤ۔ کچھ پیسوں کا انتظام کرنے دو۔ پکڑوں گا کسی سے کچھ پیسے پھر شاید آخری دنوں میں بونس مل جائے تو دے دوں گا۔ اب جاؤ ذرا بچوں کو دیکھو۔ ہوم ورک وغیرہ چیک کر کے سلا دو۔ میں بھی بس یہ بلیٹن دیکھ کر سوؤں گا ورنہ سحری میں اٹھنا مشکل ہوگا۔"

"بونس واؤ!! چلیں تو پھر تو میں خوب دل کھول کر شاپنگ کروں گی۔ چلیں اب آپ نیوز دیکھیں۔ میں بالکل آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" انزلہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے کپ سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور ٹی وی لاؤنج سے نکل گئی اور کامران نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے اپنی نصف بہتر کو جاتا ہوا دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

کامران کی انزلہ سے لو میرج ہوئی تھی۔

کامران نے انزلہ کو اپنے کزن ابرار کی شادی پر دیکھا تھا۔ وہ اس کی من موہنی صورت اور سیاہ لانبے بالوں پر پہلی ہی نظر میں فدا ہو گیا تھا۔ پھر شادی کے بعد جب ابرار دعوت پر کامران کے گھر مدعو تھا تو کامران نے اسے اس کی شادی کی تصویریں کمپیوٹر پر دکھانے کے بہانے انزلہ کی تصویر بھی دکھائی اور ابرار جو کزن ہونے کے ساتھ ساتھ کامران کا اچھا دوست بھی تھا، یار کے دل کا حال اس کے بنا کہے ہی جان گیا اور آخر کار اگلوا کر ہی دم لیا۔

انزلہ ابرار کے پڑوس میں رہتی تھی اس لیے کامران کی بے قراری دیکھتے ہوئے اس نے کامران کے ہی اصرار پر اپنی خالہ اور کامران کی ممی سے اس رشتے کے بارے میں بات کی۔ کامران کی ممی روایتی ماؤں میں سے نہیں تھیں کہ اس بات کو انا کا مسئلہ بنا بیٹھتیں۔ اس لیے انہوں نے بیٹے کی پسند کو بنا دیکھے ہی نہ صرف پسند کر لیا بلکہ اگلے ہی ہفتے اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر انزلہ کے گھر پہنچ گئیں۔

انزلہ کا گھرانہ بھی کامران کے گھرانے کی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ انزلہ کے والدین بھی بڑی بیٹی کی شادی کے بعد انزلہ کے رشتے ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انزلہ کے والد عباسی صاحب گھر آئے رشتوں کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت جانتے تھے، اسی لیے انہوں نے بھی فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ ابرار کے اطمینان دلانے کے باعث انہوں نے غیر ضروری چھان بین سے بھی گریز کیا۔ ویسے بھی کامران ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور رنگ و روپ اور عمر کے حساب سے بھی بے حد موزوں تھا۔

شادی کے بعد انزلہ کامران کی محبت اور بے حد خیال رکھنے والی نیچر کے باعث اور بھی نکھر گئی۔ کامران بھی اپنی محبت کو اپنا شریک سفر بنا کر بہت خوش تھا۔ مگر پھر گزرتے ماہ و سال نے جب انزلہ کا باطن کامران کے سامنے بے نقاب کرنا شروع کیا تو اسے اپنا فیصلہ غلط لگنے لگا۔ انزلہ صورت کی ضرور من موہنی تھی مگر سیرت کے اعتبار سے وہ اتنی ہی کم روتھی۔ انزلہ کی طبیعت میں صبر اور برداشت کا مادہ نہیں تھا اور سمجھوتا کرنا تو اس نے جیسے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک حد تک خود غرض بھی تھی۔ اسے اپنے آپ اور اپنی خواہشوں سے محبت تھی اور اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے وہ کامران پر بے انتہا دباؤ ڈالنے لگی تھی۔ آئے دن نت نئی فرمائشیں اور فرمائشوں کے پورا نہ ہونے پر منہ پھلا لینا گویا اس کی عادت تھی۔

شروع شروع میں تو کامران اسے انزلہ کے لاابالی پن اور نئی دلہن کی خواہشیں سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا اور انزلہ کو زندگی کو ترتیب اور سلیقے سے برتنے کے لیے سمجھانے کی کوشش بھی کرتا رہا، مگر انزلہ انتہائی ڈھٹائی سے اپنی روش پر قائم رہی۔

کامران کی ممی نے بھی بہو کو پیار، دُلار اور سختی دونوں سے سمجھانا چاہا کہ گھر یوں نہیں بستے مگر انزلہ نے ان سے بدکلامی شروع کر دی تو انہوں نے بیٹے کی محبت میں خاموشی اختیار کر لی اور آخر کار اسی روگ کو لیے محض تین ماہ میں ہی خالق حقیقی سے جا ملیں اور گھر کی حکمرانی انزلہ کے ہاتھ آ گئی۔ وہ مزید دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگی۔

جب کامران نے دیکھا کہ بینک بیلنس صفر ہونے کو ہے تو اس نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھو انزلہ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اپنے اخراجات کنٹرول کرنا ہوں گے۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں کہ سیر سپاٹوں اور ہوٹل بازیوں میں جمع پونجی لٹا دیں۔ ہمارے ساتھ دو معصوم جانیں بھی ہیں۔ کل کو بیٹے کو اچھا پڑھانا ہے، بیٹی کی اچھی جگہ شادی کرنی ہے اور اپنے بڑھاپے کے لیے بھی محفوظ کرنا ہے۔ آج بچت کریں گے تو کل اپنے پیروں پر کھڑے

ہوں گے وگرنہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیں گے۔ تم اب مہینے میں صرف ایک بار بازار جاؤ گی اور کھانا بھی گھر میں ہی پکے گا۔ میں اب کوئی قرضہ افورڈ نہیں کر سکتا۔"

کامران کے لہجے میں درشتگی محسوس کر کے انزلہ نے کچھ دنوں تو اس کے کہے پر عمل کیا۔ مگر دو تین مہینوں میں ہی اس نے ایسا گیم کھیلا کہ کامران اس کے بدلے روپ کو پہچان ہی نہ پایا۔ وہ ویسے تو سارا دن ٹی وی کے آگے ڈرامے اور مارننگ شوز دیکھتے گزار دیتی مگر جب کامران کے گھر آنے کا وقت ہوتا تو سر پر دوپٹہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور اکثر طبیعت کی خرابی کا بہانا تراشتی۔ وہ اتنی کامیابی سے ایکٹنگ کرتی کہ کامران کو گمان تک نہ ہوتا۔ وہ بے چارہ الٹا اس کی تیمارداری میں لگ جاتا اور ایسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر سے باہر کا کھانا آ جاتا اور تو اور اس کا دل بہلانے اور ہوا کھلانے کی غرض سے وہ اسے اکثر باہر آؤٹنگ پر بھی لے جاتا۔ مگر کامران بھی انسان تھا۔ جاب کی تھکا دینے والی مصروفیات کے باعث جب گھر آ کر بھی اسے آرام اور چین سے بیٹھنے کو نہ ملتا تو وہ بیزار ہونے لگا۔ ایسے میں اسے لگا کہ انزلہ کو تھوڑے دن اس کی ماں کے گھر چھوڑ آنا ہی بہتر ہوگا۔ پھر انزلہ کے نہ نہ کرنے پر بھی وہ اسے ماں کے گھر چھوڑ آیا کہ کچھ عرصے ریسٹ کر کے اس کی طبیعت بحال ہوگی۔ ویسے بھی کامران کے آفس ٹائمنگ میں اسے اکیلے ہی رہنا ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

انزلہ کی امی فرخندہ خاتون اولاد سے اندھی محبت کرنے والی ماں تھیں جو اولاد کی غلطیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیتی ہیں۔ وہ خود بھی شوہر پرست خاتون نہیں تھیں، سو انہوں نے بیٹیوں کو بھی شوہروں کو اپنے اشارے پر چلانے کی تربیت دی تھی۔ ان کی اپنی زندگی تو عباسی صاحب کی صلح جو طبیعت کے باعث ان کی مرضی کے مطابق گزری تو انہوں نے اپنے رویے اور چلن کو اور کامیاب سمجھتے ہوئے بڑی بیٹی اقصیٰ کو بھی اپنے تئیں مفید مشورے دیے اور خوش قسمتی سے وہ بھی شوہر کو محکوم بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

ماں اور بڑی بہن کی روش پر چلنے کی خواہش نے انزلہ کو بھی ازدواجی زندگی کے اصل مفہوم اور میاں بیوی کی محبت کے فلسفے سے نابلد ہی رکھا۔ فرخندہ خاتون نے جب داماد کی کل پلٹتے دیکھی تو بیٹی کو مزید نئے سبق پڑھانا شروع کر دیے۔

"ارے فکر نہ کرو۔ تم آرام سے پندرہ دن رکو یہاں۔ ہاں البتہ فون پر باتوں باتوں میں اسے یہی تاثر دو کہ تم یہاں خوش نہیں ہو اور یہ کہ تمہارا اس کے بغیر بالکل جی نہیں لگ رہا اور اسے وقتاً فوقتاً یہاں بلاتی بھی رہو۔ لگام ڈھیلی چھوڑو گی تو مرد کو سرکش گھوڑا بننے میں دیر نہیں لگتی اور ہاں اب تین ماہ سے اوپر ہو چلے ہیں۔ اس لیے اب بس کرو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ڈرامہ فلاپ ہی ہو جائے اور وہ کہیں زیادہ ہی بیزار ہو جائے تم سے۔ اب یہاں سے جاؤ تو یہی تاثر دینا کہ آرام اور مسلسل توجہ کے باعث تمہاری طبیعت میں بہتری آئی ہے۔ ظاہر ہے اکیلی عورت گھر اور بچے سنبھال کر ہلکان ہو جاتی ہے اور ماسی کو ہٹانے پر تو ہرگز راضی نہ ہونا۔ البتہ اپنے آپ کو اب ایکٹو شو کرنا۔ گھر اور بچوں پر بھی توجہ دو۔ اس کے نئے نئے اس کی پسند کے کھانے کھلاؤ۔ اپنی بات منوانے اور مرد پر راج کرنے کے سو طریقے ہیں بیٹا۔ ہر مرد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ عورت کو اسی حساب سے اسے ڈیل کرنا پڑتا ہے۔"

☆......☆......☆

اور پھر انزلہ نے اپنی تجربہ کار ماں کی ہدایتوں پر مکمل عملدرآمد کیا اور حسب توقع نتائج بھی پا لیے۔

کامران انزلہ میں آئے بدلاؤ کو دیکھ کر بہت خوش تھا مگر وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھا کہ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

انزلہ نے کچھ دن تو کامران کے ساتھ بہت مثبت رویہ اپنائے رکھا۔ وہ اس کا اور بچوں کا بے حد خیال رکھتی۔ ماں کی ہدایات کے مطابق ہی فی الحال اس نے فرمائش نامہ بھی لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مناسب وقت کا انتظار کرنے لگی۔

☆......☆......☆

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے میں دس بارہ دن رہ گئے تھے۔ انزلہ نے اپنی جون میں واپس آنا شروع کر دیا۔ پہلے تو اس نے رمضان کے راشن کے نام پر ہی ایک لمبی چوڑی لسٹ بنا کر کامران کے سامنے رکھ کر پیسوں کا مطالبہ کیا۔ کامران سامان کی لسٹ دیکھ کر چونکا ضرور مگر اپنی سادہ طبیعت کے باعث ایک بار پھر وہ بیوی کے جھانسے میں آ گیا اور خاموشی سے مطلوبہ رقم اسے فراہم کر دی۔ مگر جب رمضان کی چاندرات کو ہی انزلہ نے اپنا چولا ایک دم سے اُتار پھینکا تو وہ دم بخود رہ گیا۔

"کامران اس عید پر مجھے اپنے اور بچوں کے تین تین جوڑے تو ہر حال میں چاہئیں اور ہاں ابھی پچھلے ہفتے میں گروسری کرنے گئی تھی نا تو ایک ساڑی مجھے بے حد پسند آئی ہے۔ بہت ہی نفیس کام ہے۔ اس کا پلو اور بارڈر تو بے انتہا خوبصورت ہے۔ عید کے فوراً بعد شادیوں کی دعوتیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور میرے سارے کپڑے گھس چکے ہیں۔ ہر شادی میں وہی جہیز اور بری کے جوڑے پہن پہن کر اب تو شرم آنے لگی ہے مجھے۔"

اور کامران جو اسی وقت تراویح پڑھ کر آیا تھا اور رات کا کھانا کھا رہا تھا، کھانا چھوڑ کر انزلہ کو یک ٹک دیکھنے لگا۔

"کیا ہو گیا آپ کو؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔" انزلہ، کامران کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی مہارت سے خود پر خول اتارتی اور چڑھاتی ہو۔ مجھے لگا تھا کہ تم بدل گئی ہو مگر نہیں تم بالکل ویسی ہو۔" یہ کہہ کر کامران تیزی سے اُٹھ کر چلا گیا اور انزلہ اپنی جلد بازی پر خود کو ملامت کرنے لگی۔

☆......☆......☆

دو تین دن یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ پھر اپنی عادت کے باعث کامران آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا۔ انزلہ ایک تو رمضان کی مصروفیات میں گم تھی دوسرے وہ خود کامران سے الجھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ ایسی صورت میں نقصان سراسر اسی کا تھا اور جو بھی تھا بہرحال وہ کامران کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر کامران کو نارمل ہوتا دیکھ کر اور اپنی عادت کے باعث وہ پھر زبان ہلا رہی تھی۔

اس بار کامران نے بھی حالات و واقعات سے گویا سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس لیے اس نے انزلہ کو سمجھانے اور بحث کرنے سے گریز کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر وہ پانچویں روزے کو انزلہ کی پسند کی تمام چیزیں دلا کر لے آیا۔ انزلہ اپنی خواہشوں کی تکمیل پر بے انتہا خوش تھی۔ وہ بات بے بات ہنس رہی تھی۔ لیکن کامران بالکل خاموش تھا۔ اس نے انزلہ اور بچوں کو خریداری کے بعد باہر سے ہی افطار اور ڈنر کروایا۔

واپسی پر بچے تو راستے میں سو گئے۔ انہیں بیڈ پر لٹا کر انزلہ ساری چیزیں شاپر سے نکال کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ وہ ایک ایک چیز کو چھو کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ اتنے میں کامران دو سوٹ کیس اٹھا لایا اور انزلہ کے آگے رکھ دیا۔

"تم اپنا یہ سامان اور باقی اپنا اور بچوں کا دیگر ضروری سامان پیک کر لو۔"

انزلہ نے حیرت سے پہلے سوٹ کیسوں اور پھر کامران کی طرف دیکھا۔ "ہم کہیں جا رہے ہیں کیا؟"

''ہاں میں کل صبح تمہیں اور بچوں کو تمہاری امی کی طرف چھوڑ دوں گا۔'' کامران نے سپاٹ لہجے میں کہا تو انزلہ کا دل انجانے خدشے کے تحت تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''مگر کیوں...... سب خیریت ہے نا؟ امی ابو ٹھیک تو ہیں، اور آپ سحر و افطار میں کیا کریں گے۔ میں کیوں جاؤں...... مطلب...... آپ صحیح بتائیں کیا ہوا؟''

''تمہارے امی ابو دونوں ہی خیریت سے ہیں۔ میں دبئی جا رہا ہوں اور یہ گھر بیچنے کے لیے میں نے ابرار سے کہہ دیا ہے۔ لہٰذا تم اور بچے اب میکے میں رہو گے۔'' کامران نے کاٹ دار لہجے میں کہا تو انزلہ کے حلق میں ایک دم کانٹے چبھنے لگے۔

''مگر کیوں...... یہ سب اچانک...... آپ نے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں۔''

''تمہیں کچھ بھی بتانے کا کیا فائدہ ہے...... ہرگز نہیں۔ بندہ اس سے اپنے دل کی بات شیئر کرتا ہے جو اس کا درد محسوس کر سکتا ہو، دل کی حالت سمجھ سکتا ہو اور تمہارے کیوں کا جواب یہ ہے کہ تمہاری خواہشوں کی تکمیل کے لیے میں بال بال قرضے میں جکڑ چکا ہوں۔ اس کو اُتارنے کے لیے اس گھر کو بیچنا اور میرا باہر جانا بے حد ضروری ہے اور تم کیوں فکرمند ہو رہی ہو۔ تمہاری عید کی تیاریاں میں نے کروا دی ہیں۔ اب جلدی سے پیکنگ کرو۔ کل دوپہر تین بجے میری فلائٹ ہے۔ گھر کا سودا ہو چکا ہے اسی بہانے سے میں نے تمہیں شاپنگ کروائی ہے اور اپنے جانے کا انتظام کیا ہے۔ گھر کو خالی کرنے کی اور دیگر خرید و فروخت کی ڈیلنگ اب ابرار کرے گا۔ میں کل صبح تمہیں اور بچوں کو چھوڑ دوں گا ہم سحری کر کے فجر کی نماز کے بعد نکل جائیں گے۔ بی کوئیک، تمہارے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے۔'' اس نے رات کا ایک بجاتی وال کلاک کی طرف اشارہ کیا اور انزلہ کو زہر خند نظروں سے تکتا کمرے سے نکل گیا۔

انزلہ کو لگا اس کے پیروں تلے نہ زمین ہے نہ سر پر چھت۔ کامران کا یہ سنگ دل روپ اس کے لیے بالکل انجان تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس سے اپنی مرضی منواتی آئی تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ مرد کو حاکم اللہ نے بنایا ہے۔ وہ ہی گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ چاہے عورت تسلیم کرے نہ کرے۔ وہ مرد کے بغیر ادھوری ہے۔

رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا اور اس کی تاریکی کے سائے انزلہ کو اپنی باقی ماندہ زندگی پر چھاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

☆......☆......☆

''آج پندرھواں روزہ تھا۔ کامران کو گئے۔ دس دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے انزلہ سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ البتہ اپنی خیریت اور پہنچنے کی اطلاع ابرار کے ذریعے دے دی تھی۔ ابرار انزلہ کے کئی بار پوچھنے پر بھی تفصیل بتانے سے گریز کرنے لگا تو انزلہ نے خاموشی اختیار کر لی۔

انزلہ کے یوں گھر آ بیٹھنے پر جب عباسی صاحب کو اصل صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے انزلہ سے براہ راست تو کچھ نہیں کہا البتہ اپنی بیگم کو زندگی میں پہلی بار آئینہ دکھا دیا جس میں انزلہ کو اپنا عکس بھی نظر آ گیا۔

''فرخندہ بیگم مرد کی خاموشی کی وجہ ہر بار اس کی پسپائی یا ہار ماننا نہیں ہوتی۔ صرف عورت ہی نہیں مرد بھی گھر کو بکھرنے سے بچانے اور گھر کے سکون کے لیے خاموش، صلح اور صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے، جسے تم جیسی ناعاقبت اندیش عورتیں اپنی جیت اور مرد کی ہار تصور کرتی ہو۔''

فرخندہ بیگم بیٹی کی حالت دیکھ کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتیں کیونکہ درحقیقت اس کا یہ انجام انہی کی غلط تربیت کی بدولت ہوا تھا۔

گزرتے دنوں کے ساتھ انزلہ کے قلب و روح کی بے چینی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ پہلے تو اس نے گھر کے کاموں میں خود کو الجھانا چاہا۔ وہ بے سبب ہر وقت مختلف چینل سرچ کرتی رہتی، وقت بے وقت الماریوں کو ترتیب دینے بیٹھ جاتی۔ اس دن بھی وہ اپنی پرانی کپڑوں کی الماری ترتیب دے رہی تھی کہ لاکر کی صفائی کے دوران اسے کامران کا شادی سے قبل دیا گیا عید کارڈ ملا۔ سرخ اور سفید پھولوں سے سجا عید کارڈ انزلہ کو بہت کچھ یاد دلا رہا تھا۔ اس کی اور کامران کی شادی عید کے تیسرے روز ہوئی تھی۔ کامران اسے اپنی عید کا تحفہ کہتا تھا کیونکہ انہی روزوں میں وہ پہلی بار اعتکاف میں بیٹھا تھا کہ جوانی اور کنوارے پن کی عبادتوں میں زیادہ یکسوئی ہوتی ہے شاید اسی لیے ان کا اجروثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

انزلہ نے کارڈ کھولا تو کامران کے دل کی ترجمانی لفظوں کی صورت میں انزلہ کے دل کو ایک بار پھر سے بے قرار کرنے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے آج اس کی منگنی کے بعد پہلی عید ہونے جارہی ہو۔ سچے جذبوں کی شدتیں ایسی ہی زور آور اور دیرپا ہوتی ہیں جو کبھی بھی اپنا اثر نہیں کھوتیں۔ وہ زیرلب پڑھنے لگی۔

تُو ایسے آیا ہے میرے ہمدم
کہ جیسے دل کے سونے آنگن میں
جھوم کے پھر بہار آئی ہو
اک تیری دید سے جو پائی ہے
اس خوشی کا شمار ناممکن
میری امیدوں کی صبح روشن
رات بھی تجھ سے منور ہے جہاں
اس طرح مجھ کو تیری دید ہوئی
دل کی جو آرزو تھی بر آئی
عید سے پہلے میری عید ہوئی

"اُف میرے مولا! یہ میں کیا کر بیٹھی؟" وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بلکنے لگی۔ پچھتاوے کی آگ اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگی تھی۔ کیسا کفرانِ نعمت کر بیٹھی تھی وہ۔ کامران جیسا مخلص اور چاہنے والا شریکِ سفر دے کر اس کے رب نے بن مانگے اس کی جھولی بھر دی تھی۔ مگر اب وہ کیا کرے؟ اسے کوئی راہ بھائی نہ دے رہی تھی۔

"یا میرے مولا! مجھ پر رحم کردے۔" اس نے شاید زندگی میں پہلی بار بڑی شدت سے اپنے رب کو پکارا تھا۔ بندہ اپنے رب کی پکار سنے نہ سنے، رب ضرور بندے کی پکار سنتا ہے۔ پیش امام کی مسجد سے آتی ہوئی مسلسل آوازیں اسے یقین دلا رہی تھیں۔

"اہلِ محلہ متوجہ ہوں۔ کل سے اعتکاف کی راتوں کا آغاز ہونے والا ہے۔ وہ مبارک ساعتیں جب بندہ اپنے رب کے سب سے قریب ہو کر مغفرت اور رحمت طلب کرتا ہے، ہم سے دور نہیں۔ مسجد میں اعتکاف کے حوالے سے خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔"

اور پھر وہ اپنی زندگی میں پہلی بار اعتکاف میں بیٹھی۔ آج پہلی بار وہ انسانوں کے بجائے اپنے رب سے مانگنے آئی تھی اور آج اس کی طلب، اس کی چاہ مادی سے بنی اشیا نہیں تھیں۔ آج وہ اپنے رب کی نظرِ کرم کی منتظر تھی اور پھر وہ شکرانے کے سجدے ادا کرتی گئی۔ اس کے رب نے اسے یہ موقع فراہم کیا اور وہ گڑگڑاتی رہی کہ وہ بخش دی جائے۔ اسے پناہ دے دی جائے۔

ہو نگاہِ کرم ورنہ چوکھٹ پہ ہم
آپ کا نام لے لے کے مرجائیں گے

وہ سرتاپا اپنے رب کو منانے میں مشغول تھی۔ اس پر بس اپنی مغفرت کروانے کی دھن سوار تھی۔ وہ دنیا کو تقریباً بھول بیٹھی تھی۔ اسے بچے، کامران...... کوئی بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

پھر جب امی نے اسے انتیسویں روزے کو افطار کرانے کے بعد گلے لگا کر مبارکباد دی اور عباسی صاحب نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ کرم کی ساعتیں اتنی جلدی بیت گئیں جانے وہ کچھ حاصل بھی کر پائی تھی یا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں موجود اضطراب شاید عباسی صاحب نے پڑھ لیا تھا۔

"بیٹا تمہارے دل اور روح میں جو سکون اُترا ہوگا وہی تمہارا حاصل ہے۔ اپنے بندوں کو نامراد لوٹانا اس کی شان نہیں۔"

"جاؤ بیٹا۔ عید کی تیاریاں کرو، بچوں کے کپڑے وغیرہ تیار کرو اور شیر خورمہ تو تمہیں معلوم ہے، تمہارے ابو تمہارے ہاتھ کا کتنا پسند کرتے ہیں۔" فرخندہ بیگم نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

عباسی صاحب بچوں کو لے کر چاند رات کی رونقیں دکھانے نکل گئے۔ فرخندہ بیگم میوہ کاٹنے بیٹھیں تو ساتھ ساتھ ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ جس میں چاند رات کی گہما گہمی کی خبریں نشر ہونے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

عید کی صبح شیر خورمہ تیار کر کے اس نے گھر صاف کیا اور پھر بچوں کو اُٹھا کر نہلا دھلا کر تیار کیا اور باہر لاؤنج میں لے آئی، جہاں فرخندہ بیگم ناشتے کی ٹیبل لگا رہی تھیں۔

"نانو اسلام وعلیکم اور عید مبارک۔" شزا اور رافع نانو سے لپٹ گئے تو فرخندہ بیگم نے دونوں کے ماتھے چوم لیے۔

"اللہ تم لوگوں کو خوب خوشیاں دے اور ہاں عیدی آپ کے نانا ابو دیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔"

"جی نانو۔" بچے سر ہلا کر ٹی وی کے سامنے آ بیٹھے۔ جہاں انزلہ نے ان کے لیے کارٹون چینل لگا دیا تھا۔ پھر وہ کچن میں فرخندہ بیگم کی تیاریوں کی مدد سے گئی تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"انزلہ بیٹا...... یہ کیا!! تم نے عید کے کپڑے نہیں پہنے اور نہ ہی مہندی، نہ چوڑیاں، تم سہاگن ہو بیٹا۔"

"میں صرف نام کی سہاگن ہوں امی۔ نکاح کا لیبل لگ جانے سے کوئی عورت سہاگن نہیں ہو جاتی۔ عورت کا سہاگ اس کے پاس نہ ہو۔ اس سے راضی نہ ہو تو ایسی عورت، میرے جیسی عورت......"

الفاظ انزلہ کے گلے میں پھنسنے لگے تھے۔ وہ واپس اپنے کمرے کی جانب دوڑ گئی۔ فرخندہ بیگم تڑپتے دل سے اپنی لاڈلی کی خوشیاں مانگنے لگیں۔

☆......☆......☆

انزلہ نے کمرہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ تر کر دیا اور بے چینی اور بے سکونی اس کی روح میں حلول کرنے لگی تھی۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی خوشیاں برباد کی تھیں۔ عید کی خوشیاں بلکہ اب شاید زندگی کی ساری خوشیاں اس پر حرام تھیں۔ اس کا دل اپنی تنہائی، اپنے اکیلے پن پر ماتم کر رہا تھا۔

بیڈ پر کامران کی عید کی شاپنگ والا شاپر کھلا پڑا تھا جس میں سے اس نے بچوں کو عید کے کپڑے نکال کر پہنائے تھے اور جلدی میں یونہی ادھ کھلا چھوڑ کر باہر چلی گئی تھی۔ شاپر میں اس کے تین عدد جوڑے اور ہم رنگ چوڑیاں جھلک رہی تھیں۔ جن کو پانے کے لیے وہ کس قدر بے تاب تھی۔ ہر ہر جوڑے کو اس نے بچوں کی طرح ضد کر کے لیا تھا۔ مگر آج ان کی چمک دمک میں اسے کوئی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کامران کی عادت تھی کہ وہ انزلہ کی تعریف بڑے دل کھول کر کرتا تھا۔ عید کی صبح جب کامران کے نماز سے آنے پر وہ اسے تیار ملتی تو چند لمحے تو وہ اسے تکتا ہی رہتا۔ اس کی دل کھول کر تعریف کرتا تو انزلہ کو لگتا جیسے اس کا سنگھار مکمل ہو گیا ہے۔ بیوی کو شوہر کی توجہ اور محبت ہی کافی ہوتی

ہے، یہ بات اب انزلہ کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر سسکنے لگی تھی۔ آگہی کا عذاب اس پر مسلط ہونے لگا تھا۔ انسان کے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں، یہ اسے ہمیشہ نقصان کے بعد ہی پتا چلتا ہے۔ کرب تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ماضی کی یادیں، کامران کی دوری انزلہ کو بے قرار کر رہی تھی۔ قریب تھا کہ اس کی سسکیاں، چیخوں میں تبدیل ہوتی۔ دروازے پر زوردار دستک نے اسے حال میں لا کر کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں کی آوازوں نے اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بچے اس سے لپٹ گئے اور انزلہ کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بچوں کے ساتھ کھڑے عباسی صاحب کے عقب میں کھڑا کامران اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ انزلہ دم بخود ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ وہم ہے یا حقیقت؟ عباسی صاحب کی آواز نے گویا اس کا سوال پڑھ لیا۔

"انزلہ بیٹی! کامران اور میں ساتھ ناشتہ کریں گے۔ جلدی سے تیار ہو کر آؤ اور گرما گرم پراٹھے بنا دو۔ میں ذرا محلے میں عید مل آؤں۔ زیادہ دیر مت کرنا، بچے بھی بھوکے ہیں۔" عباسی صاحب زیر لب مسکراتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو کامران بچوں اور انزلہ کا ہاتھ تھامے بیڈ کی جانب آ گیا۔ اس نے انزلہ کو شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور شاپر سے چوڑیاں نکال کر اسے آہستگی سے پہنانے لگا۔ اس کا انداز آج بھی ایسا ہی تھا کہ وہ انزلہ کو چوڑی ٹوٹنے کی تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔

"میں کتنی بری ہوں نا۔ آپ کیوں اتنے اچھے ہیں۔ میں نے کبھی آپ کے دل کے ٹوٹنے کا خیال نہیں کیا اور تو اور اپنے گھر کے بکھرنے تک کا خیال نہیں کیا۔ آپ کیوں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر۔ آپ کو پتا ہے آپ کے جانے کے بعد مجھے لگنے لگا تھا کہ میرے ارد گرد آکسیجن کی کمی ہونے لگی ہے۔ مجھے شدید گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔" وہ کہے جا رہی تھی اور کامران سنے جا رہا تھا۔ انزلہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ اور کامران کو یک ٹک تکتی آنکھیں اس کے لفظوں کی سچائی کی گواہ بنے ہوئے تھے۔ کامران نے ایک گہری سانس لے کر اس بدلی ہوئی انزلہ کو دیکھا اور بولا۔

"انزلہ تم نے سنا ہوگا نا کہ لوگ کہتے ہیں کہ محبت لفظوں کے ذریعے اظہار کی محتاج ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ محبت کے عمل کو مکمل کرنے کے لیے تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک ماں اپنے بچوں کو صرف چومے، چاٹے اور میرا لعل اور میرا بچہ کہہ کر گلے لگاتی رہے۔ مگر بچے کو کھانے کو نہ دے، اسے بھوکا رکھے، اس کے آرام کا خیال نہ کرے اس کی دیگر ضرورتیں پوری نہ کرے تو ایسی ماں کی ممتا پر شک گزرے گا نا...... مجھے پتا ہے کہ تم سب جان چکی ہو۔ ابرار کے ذریعے تمہاری صورت حال کا علم ہوتا رہا ہے۔ میں گیا اس لیے تھا کہ تم محبت اور ضرورت کا فرق جان سکو اور واپس اس لیے آ گیا کہ......" کامران لمحے بھر کو رکا تو انزلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہاری ایک امانت میرے پاس تھی۔"

کامران نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مہندی کی کون نکال کر انزلہ کو تھما دی تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"ابھی بھی آپ کو لگتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے؟" انزلہ نے نروٹھے پن سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں...... تمہارے سنگھار کو اس کی ضرورت ہے۔ جاؤ اور میری دلہن کے روپ میں ہی میرے سامنے آنا۔ ورنہ عیدی نہیں ملے گی۔" کامران نے اس کے بکھرے بال سمیٹے تو شرمیلی مسکان نے اس کے چہرے کو گلنار بنا دیا۔

☆☆......☆☆

"یہ کیا ہوا ہے تمہارے چہرے پر؟" ان کا لہجہ حیران تھا۔ بریرہ دھک سے رہ گئی۔
ہارون کے تھپڑوں کے نشان چھپانے کو اس نے میک اپ کا بھی سہارا لیا تھا خلاف
عادت ومزاج؛ جبھی تو صبح ممی اسے دیکھ کر جانے کس کس خوش فہمی کا شکار ہو گئیں......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا پانچواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
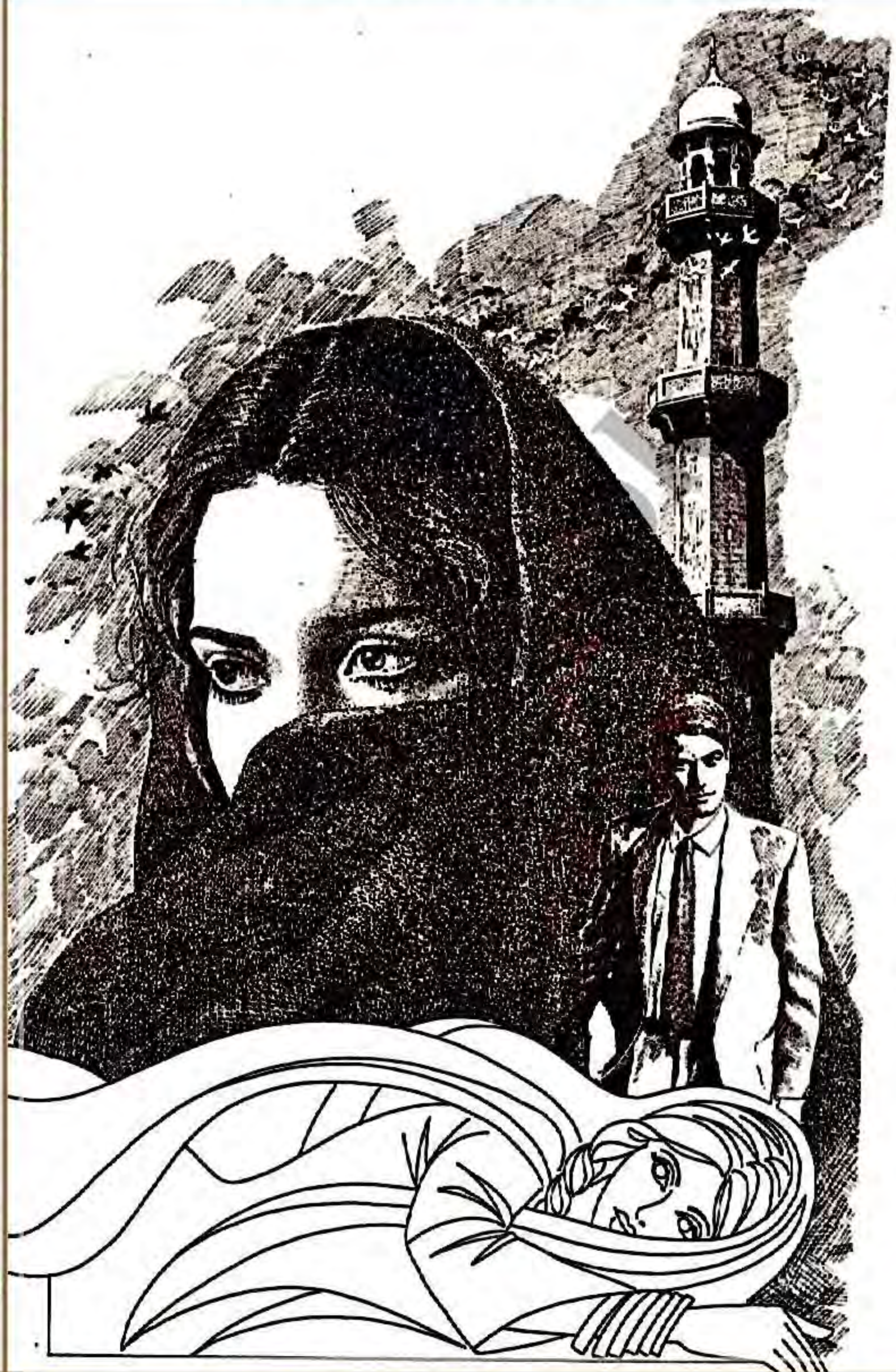
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی رجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں جتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں جتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس گھٹیا حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساس جرم میں جتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی متمنی ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

میرایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرز زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تار عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

حضرت نافعؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک بار کہیں موسیقی کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اس راستے سے دور ہو گئے اور کچھ دیر بعد مجھ سے کہا۔

''اے نافع! کیا تجھے کچھ سنائی دیتا ہے؟'' میں کہا نہیں۔ نافع کہتے ہیں۔ پھر آپؓ نے اپنی انگلیاں کانوں سے ہٹا لیں اور کہا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی علیہ والہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ ﷺ نے ایسی ہی آواز سنی تو یہی عمل کیا جو میں نے کیا۔''

انہوں نے توقف کیا پھر اسے دیکھا۔ جو خجالت آمیز انداز میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

''میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں بیٹے! نصیحت کرنا ہے۔ یہ مسجد ہے اور اس کا تقدس ہمیں ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔''

''آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہو گی چاچو!'' اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔

''اللہ پاک تمہیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔'' انہوں نے محبت سے اس کا کاندھا تھپکا تھا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے آگے بڑھ گئے۔ اس نے ان کی تقلید کی تھی۔ جانتا تھا یہ اس کا قرآن پاک کا سبق لینے کا ٹائم تھا۔ وہ وضو کے ارادے سے وضو خانے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

اس نے نماز پڑھی۔ پھر دعا کو ہاتھ پھیلا دیے۔ کچھ دیر ہونٹ بھینچے رہا۔ یہاں تک کہ دل کی طلب سے ہار کر سسک پڑا تھا۔ کیا کرتا وہ۔ اسے کوئی دعا مانگنی ہی نہ آتی تھی ماسوائے اس ایک دعا کے کہ 'دیا' اُسے مل جائے۔ اس کے دل میں تھوڑی سی جگہ کا ہی تو طلب گار تھا وہ اور شاہ صاحب کہتے تھے۔ جب تک وہ غیر اللہ کی محبت نہیں چھوڑے گا خوار ہوتا رہے گا۔ وہ خوار ہونا ہی تو نہیں چاہتا تھا۔ آنسو بے دریغ بہنے لگے۔ اللہ سے محبت کیسے کرے وہ؟ اس کے اندر سے سوال اٹھتا مگر اسے پوچھنے سے خوف محسوس ہوتا۔ اس نے جائے نماز کا کونا موڑا اور سائیڈ پر ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے خود اپنی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ اسے لگتا وہ منجدھار میں لٹک رہا ہے۔ ذہن میں کبھی کی پڑھی نظم کے مصرعے خود بخود گونجنے لگے۔

گوشۂ ذہن میں بے ربط خیالوں کا ہجوم
چشم تنہائی سے چھن کر وہی بے باک سے اشک
لحۂ وصل کے اس عہد فراموش کو
یاد کرتا ہے سسکتا ہے بلکتا ہے بہت
آج بھی دشت مسافت کے کٹھن رستوں میں
جلتی بجھتی ہوئی بے نام رفاقت کی شعاع
عارضِ وقت کی سرخی پہ چھلک پڑتی ہے
پھر سے ملنے کی یہ موہوم طلب اور تڑپ
آج بھی ذہن کے گوشوں میں چمک اٹھتی ہے

اس کا دل اتنا رقت زدہ ہوا تھا کہ آنسو قطرہ قطرہ پھسلتے اس کے گریبان میں گم ہو رہے تھے۔ عجب بے خودی کا عالم تھا۔ جب شاہ صاحب نے نہایت محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ پھر اس قدر ہڑبڑا کر آنسو پونچھنے لگا تھا۔

''آئی ایم سوری!'' وہ شرمسار اور رنجیدہ سا

بولا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں میرے بچے! صبر سے رحمت کا انتظار کرو۔ اُس کے گھر میں دیر بھی حکمت کی وجہ سے ہوتی ہے اور اُس کی حکمت ہماری سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ اللہ ہم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ دکھ...... یہ الم عارضی ٹھکانے اور پناہ گاہیں ثابت ہوا کرتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھنے کا آغاز، ان کیفیات سے نہیں گھبراتے۔ دل کا موم ہوجانا اللہ کا قرب ہے۔ آنکھ کا جاری ہوجانا اللہ کا قرب ہے۔ اللہ کے قرب کی علامت ہے۔ جو مستقبل سے مایوس ہوگیا۔ وہ خدا سے باغی ہوگیا۔ دنیا کے اندر سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ دنیا گناہ کے متلاشی کو گناہ دیتی ہے اور فضل کے متلاشی کو فضل۔ تم خود اپنے حالات پر غور کرو۔ جب تک تمہیں گناہ کی جستجو اور خواہش تھی۔ تم گناہ کرتے رہے۔ جیسے ہی ہدایت کی چاہ کی۔ ہدایت سے نواز دیے گئے۔ پھر دکھوں سے گھبرانا تو میرے بیٹے بزدلی ہے۔ دکھ ہماری ذات سے الگ نہیں ہوتے۔ یہ ہماری روح کے بند قفل ہی تو کھولنے آتے ہیں۔ اللہ پر یقین نہ رکھنے والا خودکشی کرلیتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر مسئلے کے حل کے لیے اپنی طرف دیکھتا ہے جبکہ اللہ پر یقین رکھنے والے کی روح اس کے وجود سے مخاطب رہتی ہے۔ اسے حقیقت سمجھا کر زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ دل میں تقویٰ کا قفل ہو تو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہی ہے۔ دنیا کے ہر مسئلے کا حل اسی رجوع میں ہے۔ تمہیں اسی رجوع میں گہرائی کی ضرورت ہے۔ سکون چاہتے ہو تو اللہ سے اللہ کی محبت طلب کرو۔ اللہ صبر بھی دے گا، ہمت و استقامت اور ڈھال بھی۔ سجدوں میں طوالت پیدا کرو۔ باوضو رہو۔ ہر برائی سے دستبردار ہوجاؤ۔ چاشت اور اشراق میں باقاعدگی کرو۔ قرآن پاک کو توجہ سے سیکھو۔ تم جانو گے اس کے اعراب میں بھی ہدایت پنہاں ہے۔ ہمیشہ خلقت کی بہتری چاہو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو تمہارے مطیع کردے گا۔ نیکی ایسے کرو۔ جیسے بارش برستے وقت جگہ نہیں دیکھتی۔ بلکہ ہر جگہ کو سیراب کردیتی ہے۔ یاد رکھو کہ تمہارے عمل سے ثابت ہونا چاہیے کہ تم رب رحمٰن کے ماننے والے ہو۔ میرے بیٹے خدا کے سامنے اپنے مطالبات نہ رکھو۔ اُس کی رضا میں راضی رہنے والے بن جاؤ۔ وہ سب کچھ تمہاری رضا کے مطابق کردے گا۔ آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں کہ اگر انہیں اللہ مل جائے تو سوال کریں گے کہ یہ چیز دے دو۔ وہ چیز دے دو۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں۔ جنہیں اگر اللہ مل جائے تو عرض کرتے ہیں۔ حکم فرمائیں مجھے کیا کرنا ہے۔ بس آپ حکم ماننے والوں میں شمار ہوجاؤ۔ یقین رکھو کہ رحمت آکے رہے گی۔ گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ شرط اظہارِ ندامت ہے۔ خلوص دل سے توبہ ہے۔ شرط حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کی تمنا ہے۔ شرط اللہ کی رسی کو مل کر مضبوط پکڑنے کی ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ (آمین)۔

"ثم آمین۔" وہ زیرِ لب بولا تھا اور اس کے لہجے کی مضبوطی کو محسوس کرتے شاہ صاحب مسکرا دیے تھے۔

☆......☆......☆

وہ جو پھول راہ کی دھول تھے وہ مہک اٹھے
لیے سات رنگ بہار کے چلا میں جو سنگ بہار کے
تو سجا دیے بھی راستے کسی دشت شعبدہ ساز نے
میرے نام پر میرے واسطے میری بے گھری کو پناہ دی
میری جستجو کو نشاں دیا جو یقین سے بھی حسین ہے
مجھے ایک ایسا گماں دیا
وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا

اسے اک نظر میں بہم کیا
کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے
یہ کمال مجھ پہ کرم کیا

اس نے آسودگی سے لبریز گہرا سانس کھینچا اور مؤدب مگر محبت آمیز نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھا۔ اس کی نگاہ میں عقیدت تھی، احترام تھا۔ کبھی وہ وقت تھا، جب وہ اسے وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ اسے لگتا تھا کبھی یہ اس پر سچ نہیں ہوگا۔ وہ کبھی اتنا صبر نہیں کر پائے گا۔ مگر آج وہ وقت تھا۔ ہر بے قراری سکون کی جانب مائل تھی۔ یہ اللہ کا کرم ہی تو کہا جا سکتا تھا۔ جیسے رات کی تاریکی میں دور سے نظر آنے والا چراغ روشنی تو نہیں دے سکتا۔ لیکن ایسی کیفیات مرتب کرتا ہے کہ انسان مایوسی سے نکل کر اُمید تک پہنچا ہے اور اُمید سے یقین کی منزل محض دو قدم پر ہے۔ وہ اس کی زندگی میں ایسا چراغ ہی بن کر چمکے تھے۔

انہوں نے کہا تھا تمہارے پاس جب تک علم نہیں تھا، تمہیں کائناتی ذہن سے رابطے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ مگر تمہاری روح لاشعوری طور پر اپنے خالق سے مربوط رہتی تھی اور دُعا کا تقاضا آگہی کا محتاج نہیں۔ روزِ اول جب خالقِ کائنات نے "الست بربکم" فرمایا تو تمام ارواح نے "بلیٰ" کہہ کر پہچاننے کا اقرار کیا تھا۔ تمہیں رب کے وجود کی آگہی نہیں تھی۔ تم بیشک خدا کو ایک نہیں مانتے تھے۔ مگر وجود سے انکار بھی نہیں تھا۔ ہر چلتی سانس کا مطلب یہی احساس بخشتا تھا، کوئی ہے، جو یہ سانسیں اندر باہر کرنے کا نظام سنبھالے ہوئے ہے۔ پکار کا عمل تو جاری تھا۔ اسی لیے خالق و تخلیق کے بیچ 'بلیٰ' موجود ہے۔ بعض دکھ بہت بخت آور ہوتے ہیں۔ سعید ثابت ہوتے ہیں۔ یہی دکھ ہوتا ہے جس کی دراڑیں چہرے سے تو رخصت ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ انسان کے اندر بڑی بڑی تبدیلیوں کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔ گناہ کے بعد گناہ کا احساس اس بات کی علامت ہے کہ انسان کا ایمان زندہ ہے۔ ایسے میں شیطان انسان کو فریب دیتا ہے کہ اب تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مومن نہایت ہوش مندی سے گناہ کے وجوہات کی نشاندہی کرتا ہے اور سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہاں تمہاری تربیت کا کام مکمل ہوا۔ اب آپ خود اس قابل ہو کہ کسی کی تربیت کرنے، روشنی دینے کا ذریعہ بنو۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔"

وہ اس کا کاندھا تھپتھپا رہے تھے۔ عبدالہادی نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

جلا وہ آگ محبت کی میرے سینے میں
خیال غیر کا آئے تو خاک ہو جاؤں

ٹپ ٹپ کتنے آنسو کتنی بے تابی سے برسے تھے۔ وہ سر سجدے میں رکھے سسکتا تھا۔ برسوں گزر گئے۔ اس کی دعاؤں میں کوئی دنیاوی خواہش شدت سے تو کیا معمول بن کر بھی نہیں اتری تھی۔ جب بھی اور جتنا بھی مانگا اس کا تعلق دنیا سے نہیں آخرت سے رہا۔ مگر آج وہ پھر وہی بھولی بسری دُعا مانگ رہا تھا۔ التجائیں کر رہا تھا۔ اس کی بدگمانی دور ہونے کی۔ اس کا دل صاف ہونے کی۔ انداز ایسا تھا۔ جو مانگ رہا ہے۔ نہ ملا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ شاہ صاحب کسی اہم معاملے پر بات کرنے آئے تھے۔ اسے گریہ وزاری کرتے دیکھ کر وہیں سے پلٹ گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے اس کے انہماک کو توڑیں یا خلل ڈالیں۔ خاصی تاخیر سے وہ اٹھا تھا۔ جائے نماز تہہ کرتے ان پر نگاہ گئی تو نمناک انداز میں مسکرا دیا تھا۔

"آپ کب آئے؟"

"جب میرا بیٹا اللہ سے بہت شدتوں سے کچھ

مانگ رہا تھا۔ مجھے اللہ نے بھیجا کہ اسے خوشخبری سنا آؤں۔" وہ بہت محبت سے مسکرائے تھے۔ عبدالہادی چونک گیا تھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں چاچو؟"

"عبدالوہاب صاحب سے اچھی سلام دعا ہے میری۔ ابھی کچھ دیر قبل تشریف لے کر گئے ہیں۔ انہیں اپنی صاحبزادی کے لیے اچھے رشتے کی تلاش ہے۔ میں نے تمہارے متعلق سوچا ہے۔ جانتے ہو کون ہے ان کی صاحبزادی.....؟" ان کی مسکراہٹ میں شرارت کا رنگ اُترا۔ عبدالہادی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"ک.....کون.....؟" وہ ہکلایا۔

"علیزے، یعنی آپ کی دیا صاحبہ!" وہ ہنسے تھے۔ عبدالہادی گنگ رہ گیا۔

"اُس سے بڑھ کر اپنے وعدوں میں کون سچا ہوسکتا ہے میرے بیٹے! دیکھ لو، خود اسباب پیدا فرما رہا ہے۔ بس اب تم شادی کی تیاری پکڑلو۔"

انہوں نے محبت سے کہتے اس کا کاندھا تھپکا تھا۔ عبدالہادی کچھ کہے بغیر ان کے گلے لگ گیا تھا۔ اس کا دل اس کے وجود کی ہر ہر پور رب کائنات کے حضور سربسجود تھی۔

☆......☆......☆

"محبت نے جب پہلی بار سانس لینا سیکھا تھا تو زمین پر پہلی وحی اُتری تھی۔ جس نے زمینوں کے شگاف بہت چپکے سے بھرے تھے۔ جیسے کہ دلوں کے رابطے بندھ گئے تھے۔ محبت کتنی طاقت ور ہے، اس کا اندازہ مشکل ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں محبت عبادت ہے۔ چاہے جس روپ میں بھی ہو۔ کائنات کی ہر شے رب کا ذکر کرتی ہوئی ملے گی۔ چاچو نے بہت شروع میں مجھے سمجھایا تھا۔ محبت دوڑ نہیں ہوتی، طوفان بھی نہیں ہوتی، سکون ہوتی ہے، دریا نہیں ہوتی جھیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی بھور سے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی، اُجالا ہوتی ہے۔ میں نے اس فرق کو سمجھا تو بے سکونی کو سکون آ گیا۔ یہ بھی جان لیا کہ رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن ہی نہیں۔ یہ ہی قانونِ قدرت ہے۔ رکاوٹیں دراصل رحمتیں ہوتی ہیں۔ رکاوٹیں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ جن کے پہنچ جانے کا خطرہ ہو ان کو ہی رکاوٹیں دی جاتی ہیں۔ میں کچھ نہیں تھا مگر اُس نے مجھے نگاہ میں رکھا۔ میں تو کہتا ہوں۔ اللہ کا بھی جواب نہیں ہے۔ وہ میرے لیے بیک وقت محبوب بھی بن گیا، استاد بھی، خالق بھی، دوست بھی۔ مجھ سے کہتا ہے میری طرف دیکھو۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ کہتا میری بات کرو۔ مجھ سے اپنی باتیں کرالیں۔ کہتا تھا میرا نام جپو، میری زبان پر ذکر جاری کردیا۔ فرماتا تھا مجھ سے یارانہ لگالو۔ مجھے اس قابل بنالیا کہ دوستی کی سعادت نصیب فرمادی۔ حکم دیتا تھا میرے عشق میں سرشار رہو۔ میرے دکھوں کو خود ہی دور کیا۔ خود ہی آسودگی بھی بخش دی۔ بتائیں میرا کیا کمال اس میں؟ سارے کمال اُسی کے ہیں۔ اُسی کی تعریفیں، اُس نے سارے وعدے سچ کردیے۔"

وہ کچھ ثانیوں کو خاموش ہوا تو عبدالغنی کا بھی استغراق ٹوٹا تھا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا تاثر رینگنے لگا۔ عبدالغنی اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں گم ہوچکا تھا۔ انداز عبدالغنی کو کسی قدر اضطرابی لگا تھا۔

"سالہا سال گزر گئے۔ مگر ایک احساس مجھے ہمیشہ کچوکے لگاتا رہا۔ دیا کے نقصان کا احساس۔ بلاشبہ میں نے اس کو ناقابلِ تلافی نقصانات سے دوچار کیا تھا۔ جن کی تلافی اور ازالہ اللہ نے کردیا تھا۔ مگر میرے اندر جرم کا احساس تھا کہ ختم نہ ہوتا تھا۔ چاچو کہتے ہیں میں بہت بے صبرا ہوں۔ ہر کام

ہر شے فوری چاہتا ہوں۔ اب مجھے ان کی بات کا یقین آ گیا ہے۔ میں اگر بے صبری کا مظاہرہ نہ کرتا تو..... تو دیا کا رویہ شاید یہ نہ ہوتا۔ مجھے خوف ہے ان کا ری ایکشن آپ کی فیملی کے لیے بہت مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔"

نظریں جھکائے..... شرمسار سادہ ہاتھ مسل رہا تھا۔ عبدالغنی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ چند قدم چلا اور اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"انہوں نے یہ بات یقیناً بہت پہلے کہی ہو گی عبدالہادی! اس کام کا یہی مقررہ وقت تھا۔ اللہ کی کائنات میں خشکی و تری میں کوئی پتا بھی اللہ کے حکم کے بغیر نہیں گر سکتا۔ میں علیزے کو سمجھاؤں گا۔ اور کوشش کروں گا یہ بات اُم جان اور بابا جان تک اگر پہنچے بھی تو ایسے انداز میں کہ ان کی تکلیف اور پریشانی کا باعث نہ بنے۔ آپ پریشان نہ ہوں اب۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

اس کا کاندھا تری و رسان سے تھپکتے عبدالغنی کا لہجہ و انداز مخصوص قسم کی بردباری اور تحمل لیے ہوئے تھا۔ عبدالہادی نے بے ساختہ قسم کی حیرت کے ساتھ سر اُٹھا کر اسے تحیر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"اس کا مطلب آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ مجھ پر غصہ بھی نہیں آیا؟" غیر یقینی لہجے میں دبی ہوئی خوشگواریت اور انداز کی معصومیت عبدالغنی کو مسکرانے اور بہت دیر تک مسکراتے رہنے پر اُکسا گئی تھی۔

"جنہیں اللہ پر یقین اور بھروسا ہو۔ وہ اُس کے فیصلوں کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرتے ہیں عبدالہادی! پھر شکوک و شبہات کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں اگر آپ یہ ساری کہانی مجھے سنائے بغیر محض اتنا بتا دیتے کہ آپ ہی وہ یوسف ہیں جو علیزے کی زندگی میں پہلے بھی آ چکے ہیں تب بھی مجھے یہ سوچ کر پریشانی نہ ہوتی کہ آپ کا اب کا یہ کردار مشکوک ہو سکتا ہے۔ ویسے ایک شعر یاد آ رہا ہے مجھے آپ کی کہانی کو سن کر۔"

عبدالغنی نے مسکراہٹ دبا کر قدرے شریر انداز میں اسے دیکھا تھا۔ عبدالہادی جو پہلے ہی حیران بھونچکا تھا۔ بے تکلفی و اپنائیت کے اس مظاہرے پر ششدر ہوتا اسے تکنے لگا۔

بہکا تو بہت بہکا سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس چاک گریباں کا ہر رنگ نرالا تھا

عبدالغنی کے گمبھیر لہجے میں پڑھے شعر پر اس کی حیرت کی جگہ جھینپ اور خجالت نے لے لی تھی۔ "مجھے شاہ صاحب آپ کے متعلق بتا چکے تھے عبدالہادی۔ یہ بھی کہ جب آپ ان کے پاس آئے تو کیسی وحشتوں کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اللہ نے بہت کرم فرمایا۔ بہت نوازا ہے آپ کو۔ اللہ پاک صراطِ مستقیم پر آپ کو ہمیشہ قائم رکھے۔ (آمین)۔

عبدالہادی کچھ نہیں بولا۔ ممنون و مشکور جذبات کا اظہار اس کے چہرے سے ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

رات اوڑھے ہوئے آئی ہے فقیروں کا لباس
چاند کشکول گدائی کی طرح نادم ہے
دل میں دہکے ہوئے ناسور لیے بیٹھا ہوں
کون یہ وقت کے گھونگھٹ سے بلاتا ہے مجھے
کس کے معصوم اشارے ہیں گناؤں کے قریب
کون آیا ہے چڑھانے کو تمناؤں کے پھول
ان سلگتے ہوئے لمحوں کی چتاؤں کے قریب
وہ تو طوفان تھی، سیلاب نے پالا تھا اسے
اس کی مدہوش امنگوں کا فسوں کیا کہیے
تھرتھراتے ہوئے سیماب کی تعریف بھی کیا
رقص کرتے ہوئے شعلے کا جنوں کیا کہیے
رقص اب ختم ہوا مدت کی وادی میں مگر

وہ کب سے جاگا ہوا تھا۔ مگر بستر نہیں چھوڑا۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس نے غیر شعوری طور پر اپنے پہلو کی جانب نگاہ کی تھی۔ وہ اسے نظر نہیں آئی۔ وہ اسے اب کبھی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر اسے ڈھونڈنے کی عادت وہ پھر بھی ترک نہیں کر سکا تھا۔ اس کا دل غم کے احساس سے بوجھل ہو کر پھٹنے کے قریب ہونے لگا۔ رات اس نے پہلی بار ضبط کھویا تھا اور ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ بریرہ کے ساتھ اپنا سلوک...... اسے نادم اور خفت زدہ کرنے کو کافی تھا۔ اس میں حوصلہ نہیں تھا اور اس سے سامنے کا۔

'کاش وہ یہاں آیا ہی نہ ہوتا۔' سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگاتے کش لیتے اس نے افسردگی سے سوچا۔

'کاش میں ڈرنک نہ کرتا۔ یہ سارا کام خراب ہی اسی وجہ سے ہوا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں اور...... اور اگر اس نے کسی سے کچھ کہہ دیا......'

یہ آخری خیال اس قدر ہولناک اور پریشان کن تھا کہ باقی ہر احساس پس پشت چلا گیا۔ سگریٹ پھینک کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔ بغیر چپل کے دروازے پر آ کر ملازمہ کو پکارنا چاہتا تھا کہ بریرہ اپنے دھیان میں اندر آئی تھی۔ چونکہ اس کی وہاں موجودگی سے غافل تھی جبھی اپنی جھونک میں بہت زور سے ٹکرائی تھی اس سے۔ اس سے قبل کہ سنبھل کر پیچھے ہٹتی۔ ہارون نے اک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر اسے دونوں بازوؤں سے دبوچ لیا تھا۔ بریرہ اسے اسی جنونی کیفیت میں پا کر تھرا کر رہ گئی تھی۔

"رات...... جو کچھ بھی ہوا۔ خبردار...... خبردار جو تم نے کسی سے بکواس کرنے کی کوشش کی سمجھیں؟" وہ غرایا۔ بریرہ کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی تسلی کی خاطر اثبات میں سر بھی نہیں ہلا سکی اور گویا اس کے قہر کو آواز دی تھی۔

"سنا نہیں تم نے...... کیا کہا میں نے؟" وہ دبے ہوئے لہجے میں غرایا تھا۔ بریرہ نے ہراساں ہوتے فی الفور سر کو اثبات میں زور سے جنبش دے ڈالی۔

"جج...... جی...... میں نہیں کہوں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ ہکلائی۔ ہارون نے اسے زور سے جھٹک دیا۔

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" وہ اب کے انداز بدل کر طنز سے بولا تھا۔ بریرہ نے نگاہ جھکا لی۔ اپنا دوپٹہ درست کیا۔ پھر مدھم آواز میں بولی تھی۔

"ناشتا تیار ہے۔ آ جائیے۔" آگے بڑھ کر وہ اس کے کپڑے وارڈ روب سے نکالنے لگی۔ ہارون کچھ کہے بغیر واش روم میں گھس گیا تھا۔

بریرہ نے اس کا لباس نکال کر بیڈ پر رکھ دیا اور خود پلٹ کر باہر آ گئی۔ ممی عبداللہ کو گود میں لیے ناشتے کی ٹیبل پر اس کی منتظر تھیں۔ اسے تنہا آتے دیکھ کر سرد آہ بھری۔

"ہارون ناشتا نہیں کرے گا؟"

"آ رہے ہیں کچھ دیر میں۔" وہ نرمی سے جواب دیتی ان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"تم نے بات کی اس سے ولیمہ پر ساتھ جانے کی؟" ممی کے سوال پر بریرہ نظریں چرا گئی تھی۔

"ان کے پاس ٹائم کہاں ہوگا ممی! میں نہیں چاہتی انہیں الجھن یا پریشانی میں مبتلا کروں۔" اس جواب پر ممی کو اس پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم بہت بے وقوف ہو بریرہ! وہ تم سے دور ہو رہا ہے اور تم اسے ہونے دے رہی ہو۔ کم از کم اپنے حق تو وصول کرو۔ احساس نہیں دلاؤ گی تو اس کی غفلت بڑھتی جائے گی۔ اپنا نہیں تو اپنے بیٹے کا خیال کیا کرو۔" ان کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔ بریرہ

خاموش رہی۔ ممی کو خود اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا تو گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔
"آئی ایم سوری بیٹے! لیکن تمہاری نرمی اسے شہہ دے رہی ہے اور......" معاً وہ تھم گئیں۔ بلکہ چونک گئی تھیں اور ہاتھ بڑھا کر انگلی سے اس کا گال چھوا۔
"یہ کیا ہوا ہے تمہارے چہرے پر؟" ان کا لہجہ حیران تھا۔ بریرہ دھک سے رہ گئی۔ ہارون کے تھپڑوں کے نشان چھپانے کو اس نے میک اپ کا بھی سہارا لیا تھا خلاف عادت و مزاج جبھی تو صبح ممی اسے دیکھ کر جانے کس کس خوش فہمی کا شکار ہو گئی تھیں۔ مگر اب ان کا سوال بتلاتا تھا یہ کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوئی ہے۔
"کچھ نہیں ممی! شاید میک اپ کی وجہ سے الرجی ہو رہی ہے چہرے پر، میں یوز نہیں کرتی ناں اس لیے۔" بوکھلاہٹ چھپا کر وہ سرسری سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس پر ستم ہارون کی آمد، وہ اس کے برابر بیٹھا ہوا کتنے دھیان سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھنے میں مصروف تھا۔
"یہ تو اچھی علامت نہیں۔ دیکھو تو کیسے سوجی ہوئی ہے جلد۔ ہارون ٹائم نکال کر بیٹے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس لے جانا بریرہ کو، او کے؟" ممی نے ایسے انداز میں اور کچھ ایسی فکرمندی سے کہا تھا گویا یہ دنیا کا سب سے اہم اور ضروری کام ہو۔ کچھ کہے بغیر اس نے محض ہنکارہ بھرا تھا۔ بریرہ اسے ناشتا سرو کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔
"میں محسوس کر رہا ہوں ممی! میرا بیٹا مجھ سے دور کیا جا رہا ہے۔ وہ مجھ سے مانوس نہیں ہے۔" ممی کی گود میں بیٹھے عبداللہ کو لینے کو ہاتھ بڑھانے پر عبداللہ ممی سے چمٹ گیا تھا۔ ہارون کے چہرے پر کتنے ہی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔ بریرہ پر خشمگیں نگاہ ڈالتا ہوا وہ قدرے غصے سے بولا۔ وہ ساکن ہو کر رہ گئی۔
"بس اسی ایک الزام کی کمی رہ گئی تھی میرے بیٹے!" ممی نے متاسف ہو کر کہتے سرد آہ بھری۔ ہارون اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔
"اتنے سے بچے کو اگر آپ کا خیال ہے اس کی ماں سکھاتی پڑھاتی ہو گی تو خاصا احمقانہ خیال ہے۔ بچہ اپنے رشتوں سے آگاہی نہیں رکھتا۔ وہ ان چہروں سے مانوس ہوتا ہے جو اس کے آس پاس نظر آتے ہیں اور اسے محبت و توجہ سے نوازتے ہیں۔ تم تو قریب نہیں ہو اس لیے وہ تم سے مانوس نہیں ہے۔ لیکن اسامہ تو ارسل احمد سے قریب ہے۔ مگر وہ باپ سے پھر بھی مانوس نہیں، پتا ہے کیوں؟ ارسل احمد کو باپ کی محبت و توجہ ہی حاصل نہیں ہے۔ اس کی معذوری اس کی بدنصیبی ثابت ہوئی ہے۔" ان کی آنکھوں میں یاس و غم نمی کی صورت اتر آیا تھا۔ ٹیبل پر یکلخت سناٹا پھیل گیا۔ بریرہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کے دبایا۔ یہ بھی ڈھارس کا ایک انداز تھا۔
"اسامہ سے مجھے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ اس قدر شدت پسند کیوں ہے۔" ہارون نے جھنجلا کر کہا تھا۔ ممی خاموشی سے آنسو پونچھتی رہیں۔ تب ہی کچھ فاصلے پر پڑا بریرہ کا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا تھا۔ اس کے فون کی رنگ ٹون پر سورۃ رحمٰن کی تلاوت ہوتی تھی۔ وہ چونکی اور آہستگی سے کرسی دھکیل کر اٹھتی فون کی جانب گئی۔ ہارون کی نگاہ نے ساتھ ساتھ سفر کیا تھا۔ گلابی دوپٹے میں اس کی لانبی چوٹی بل کھاتی نظر آ رہی تھی۔ اس کا نازک سراپا لچکتی ڈال جیسا تھا۔ موی گداز سراپا، جس سے روشنیاں سی پھوٹتی محسوس ہوا کرتی تھیں۔
"السلام علیکم! جی بھائی!" اس کی آواز مدھم اور جھرنے کے جیسی تھی۔ اتنی مترنم کہ کانوں میں رس

گھول دے۔ ہارون کو یاد آیا، اس ساحرہ کی آواز کا ہی تو وہ اسیر ہوا تھا۔ صورت کا سحر تو بعد میں طاری ہوا تھا۔ اسے جانے کیا کیا یاد آیا اور آنکھیں سلگنے لگیں۔

"کیوں بھائی! خیریت ہے ناں سب؟" اس کی آواز سے پریشانی جھلکی۔ ممی چونک کر اسے تکنے لگیں۔ ہارون نے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔

"ابھی......؟ اس وقت؟" وہ متحیر ہو کر پوچھ رہی تھی۔ پھر گہرا سانس کھینچا۔

"جی ٹھیک ہے۔ نہیں، میں آ رہی ہوں۔ جی جی، وعلیکم السلام!" فون بند کر کے وہ پلٹی تو ممی اسی کی منتظر تھیں۔ وہ ان کے نزدیک آن کھڑی ہوئی۔

"علیزے کا ناشتا لے کر جانا ہے۔ بھائی چاہتے ہیں۔ میں بھی ساتھ چلوں۔ چلی جاؤں؟" ممی کو بتانے کے بعد اس نے سوالیہ اجازت طلب نظروں کو ہارون پر جمایا تھا۔ ہارون کے چہرے پر تنفر سا پھیل گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ چائے کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگا چکا تھا۔ بریرہ کا چہرہ خفت کے احساس سے تاریک پڑ گیا تھا۔ ممی کو ہارون کی یہ بے نیازی و لاتعلقی بالکل پسند نہیں آئی۔

"ہارون بریرہ کچھ پوچھ رہی ہے آپ سے۔" ممی کا لہجہ ٹوکتا ہوا جتلاتا ہوا تھا۔

"اونہہ......جیسے یہ باقی سب کام میری اجازت سے کرتی ہیں۔ ابھی سنا نہیں آپ نے۔ محترمہ کہہ چکی ہیں میں آ رہی ہوں۔ اب میری اجازت......؟ آہ۔" اس کا لہجہ سلگتا ہوا چٹختا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری! آپ منع کریں گے تو میں نہیں جاؤں گی۔" بریرہ تیزی سے بولی تھی۔ ہارون نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"اوہ میں کیوں منع کروں گا؟ مجھے ضرورت کیا پڑی ہوئی ہے۔" وہ زور سے پھنکارا۔ بریرہ نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ ممی کو دیکھ کر لگتا تھا گہرے دکھ سے دوچار ہیں۔

"آپ جایئے محترمہ! مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اٹھتے ہوئے وہ سرد آواز میں بولا تھا۔

"میں تو چاہتی تھی تم ولیمے میں بھی شریک ہوتے۔ لیکن تمہاری مرضی ہے۔ بہن کا سسرال بھی ہے صرف تمہارا نہیں۔ خود خیال کرنا چاہیے ان نزاکتوں کا۔ بہتر ہوگا کم از کم اب بریرہ کو وہاں چھوڑ دو۔ اگر ولیمے میں شریک ہونے کا ارادہ نہیں ہے تو معذرت کر لینا ان لوگوں سے۔" ممی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ بریرہ نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ انداز خائف ہونے والا تھا۔ ہارون رسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، اگر آپ کی لاڈلی بہو صاحبہ تیار ہوں تو پورٹیکو میں بھیج دیں۔ مجھے اسامہ کے پاس بھی جانا تھا۔ مگر اتنی فرصت کہاں رہنے دی آپ نے......" خفا خفا سا کہتا وہ پلٹ کر باہر نکل گیا۔ ممی نے خوشگواریت میں گھر کر بریرہ کو دیکھا تھا۔ پھر اُٹھ کر کھڑے ہوتے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

"اسے اتنی توجہ اور محبت دو بیٹے کہ وہ تمہاری طرف پلٹ آئے۔ اس کے شکوے ختم ہو جائیں۔ میں یہی چاہتی ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ زیادتی نہ کرے۔ چلو اب جاؤ، میں بعد میں آؤں گی۔ سارہ کہہ رہی تھی آج وہ بھی ولیمے میں شریک ہو گی۔ اگر ہارون کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کے پاس ہی رُکتی۔ جانتی ہوں اس کی شکایات میں اضافہ ہونا تھا۔"

بریرہ نے کچھ نہیں کہا۔ کمرے سے عبایا پہن کر آئی تو ممی پورٹیکو میں آ چکی تھیں۔ عبداللہ کو اس کے حوالے کر کے ہنسی خوشی انہیں رخصت کیا تھا۔ بریرہ نے عبداللہ کو گود میں تھپکتے ہوئے ڈرتے ڈرتے ہارون کی جانب نگاہ کی تھی۔ فریش شیو کی نیلاہٹوں نے اس کی خوبروئی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ نیوی بلیو

پینٹ کوٹ میں وہ نکھرا ستھرا کہیں سے بھی رات کا مجنونانہ وحشت بھرا کوئی تاثر نہیں رکھتا تھا۔ بریرہ کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی۔ اسے حوصلہ نہیں ہوا کہ کچھ کہہ سکے اس سے۔

"ہارون...... میں نے جامعہ میں پڑھانا بھی آپ کی اجازت سے شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ میری اور کوئی سرگرمی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ نہیں چاہتے تو میں......"

ہارون نے بہت چونک کر اس کے گلابی نازک ہاتھ کو دیکھا تھا۔ جو وہ اس کے اسٹیئرنگ پر جمے مضبوط ہاتھ پر رکھے نرمی سے کہہ رہی تھی۔ اس کی نگاہ ہاتھ سے ہٹا کر اس کے چہرے کی جانب آئی تھی۔ اگلے لمحے اس پر تنفر پھیل گیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، نہ ہی تم یہ فرمانبرداری دکھاؤ مجھے۔" اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ دبے ہوئے مگر غصیلے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ بریرہ کا وہ سارا حوصلہ مسمار ہو گیا جواب تک اس نے جمع کیا تھا اس سے بات کرنے کو۔ اس کے صبیح چہرے پر خفت کا غبار پھیلا تھا اور رنگت زرد پڑ گئی۔ کچھ کہے بغیر وہ ہونٹ بھینچ کر آنسو اندر اتارنے لگی۔

"مجھے آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا مگر......"

"اچھا......؟" وہ غرایا۔ پھر اسے جھلستی نظروں سے دیکھا تھا۔

"مثلاً یہ کہنا ہوگا کہ رات میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی اور یہ کہ......"

"نہیں......" بریرہ نے بے اختیار اس کی بات کاٹ دی۔ اس کی کاٹ دار نظروں کے جواب میں اسی تلقین کے ساتھ سر کو نفی میں جنبش دینے لگی تھی۔

"مجھے ہرگز یہ نہیں کہنا تھا۔ بلکہ آپ نے جو میرے ساتھ کیا یہ آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ میرا رویہ اسی لائق تھا۔ ہارون مجھے تشویش نے جلا اگر کیا تو آپ کا رویہ ابنارمل تھا۔ آپ حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے۔ مجھے دکھ ہے، مجھے معذرت بھی کرنی ہے کہ میری وجہ......" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہارون کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جو بریرہ کو خوفزدہ کرنے کو کافی تھا۔

"اپنی بکواس یہیں بند کرلو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" اس نے پھنکارنے کے انداز میں کہا تھا۔

"ہارون......" وہ ملتجی ہو کر کہنا چاہتی تھی کہ ہارون چیخ پڑا تھا۔

"شٹ اپ......" بریرہ دہل کر خاموش کی خاموش رہ گئی۔ ہارون چند ثانیے یونہی گہرے سانس بھرتا رہا۔ جیسے خود کو کمپوز کرنا چاہتا ہو۔ پھر ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔ اب کی مرتبہ ڈرائیونگ تیز اور خطرناک تھی۔ بریرہ دل ہی دل میں آیات پڑھتی رہی۔

"اترو اور میرے حوالے سے جو تمہارے دل میں آئے کہتی رہنا۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔" گاڑی گھر کے سامنے روک کر وہ بے مہر انداز میں بولا تھا۔ بریرہ چند ثانیوں کو ساکن و سامت رہ گئی پھر خود کو سنبھالا تھا اور رخ پھیر کر براہ راست اسے دیکھا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ کب آئیں گے۔" وہ مسکرائی تھی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

ہارون کتنی دیر تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا۔ پھر سر جھٹک کر ایک دھماکے سے دروازہ بند کیا تھا۔

☆......☆......☆

کبھی تو شہر ستم گراں میں
کوئی محبت شناس آئے
وہ جس کی آنکھوں سے نور چھلکے
لبوں سے چاہت کی باس آئے

چلے تو خوشیوں کے شوخ جذبے
ہماری آنکھوں میں موجزن تھے
مگر نہ پوچھو کہ واپسی کے
سفر سے کتنے اُداس آئے
ہمارے ہاتھوں میں اک دیا تھا
ہوا نے وہ بھی بجھا دیا تھا
ہیں کس قدر بدنصیب ہم بھی
ہمیں اُجالے نہ راس آئے

ایک گہری اور تکلیف دہ غفلت کا بالآخر انجام ہوگیا۔ اس کے حواس جاگے، پھر متحرک بھی ہوگئے۔ ذہن تو غافل ہوا ہی نہ تھا۔ غفلت میں بھی جاگتا تھا اور ٹیس دیتا تھا۔ ہر یاد ایک ٹیس تھی۔ ہر احساس ایک کرب تھا۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ ماحول کی اجنبیت نے اعصاب پر کوڑا زنی کرتے ہوئے اور کرب بخشا تھا۔ اس کی ہر سعی بے کار گئی تھی۔ وہ اسی تار عنکبوت میں مقید تھی۔ اس کا جسم ایسی اذیت سے دوچار ہوگیا گویا بلڈوزر کے نیچے آ کر پس گیا ہو۔ کرب وجود کے ہر ریشے میں سرائیت کر گیا۔ یہ یقین کہ اللہ ناراض ہے۔ اسے معاف نہیں کیا۔ اس کی وحشت کا باعث بنا ہوا تھا۔

یہ وحشت، یہ کرب ہر سانس کے ساتھ لامتناہی ہو رہا تھا۔ جسم کا ہر عضو حرکت کرنے سے عاری ہونے لگا۔ خاصی دیر اسی طرح اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد یہ درد جیسے تھمنے لگا تھا۔ مگر وہ خود کو ہنوز بے دم محسوس کر رہی تھی۔ ذہن پر چھایا غبار اپنی ہی آہ و بکا سے ایک لمحے کے لیے چھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے بے پناہ اذیت کو لب بھینچ کر برداشت کرنا چاہا۔ اسے لگا وہ مر چکی ہے اور قبر میں عذاب سے دوچار ہے۔ اس کا دل خوف اور وحشت سے بھر آیا۔ زندگی کو نگل لینے والی دلدوز تاریکی، مہیب سناٹا، قرب وجوار میں کوئی آواز نہ تھی۔ جو زندگی کے ہونے کا پتا دیتی۔

اپنی ٹوٹی پھوٹی سانسوں کی لاچاری سرسراہٹ جو اس کے نیم بے ہوش ذہن کو چونکا جاتی۔ دل و دماغ پہ حاوی دہشت کسی مکار گدھ کی طرح اسے نوچتی تھی اور وہ اس دوران ہوش سے بے ہوشی کے کتنے مرحلے نپٹا چکی تھی۔ شعور سے لاشعور کے رابطے ٹوٹتے بحال ہوتے رہے۔ بے بسی کے شدید ترین احساس نے بارہا اسے رُلایا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے وہ اپنی موت کی دعا خود مانگتی رہی۔ یہ زندگی بہرحال موت سے بدتر تھی۔ معاً اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی تھی۔ اس کے مفلوج ہوتے احساسات اور اعصاب اس تیز آواز پر خوف کی شدت سے جاگے اور ایک دم متحرک ہوگئے۔

پہلا خیال ہی اس کے حوالے سے تھا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے کی رنگت خطرناک حد تک سفید تھی۔ جسم پسینوں میں شرابور، آنکھوں سے ہراس ٹپکتا تھا۔ تب دروازہ پھر بجا اور اگلے لمحے پٹ آہستگی سے وا کرتا عبدالغنی اندر داخل ہوا تھا۔ علیزے کو اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آسکا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنا چاہا تھا۔ پھر تیزی سے اٹھی۔ اس کے پاس آنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر گری تھی۔ عبدالغنی نے سرعت سے بڑھ کر اسے سنبھالا تو وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح اس سے چپک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ وہ اسے وہی سب بے ربط جملوں میں بتا رہی تھی جو عبدالہادی بتا چکا تھا۔ بلک بلک کر روتے وہ ہلکان ہوئی جاتی تھی۔

"وہ بہت غلط انسان ہے بھائی! وہ پھر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگیا ہے۔"

غم دکھ اور خوف کی شدت سے وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی سانسیں اس کے سینے میں اٹک رہی تھیں اور جسم میں دم نہیں تھا۔ ہمتیں زائل ہو چکی تھیں۔ ایک خوف اس کے حواسوں پر سوار تھا۔ وہ ہر

آہٹ پر چونک رہی تھی۔ عبدالغنی نے نرمی وحلاوت بھرے انداز میں اسے بازو کے حلقے میں لے کر بستر پر بٹھایا۔ آنسو پونچھے، بال سمیٹے۔

"یہاں نہیں رُکنا مجھے بھائی! مجھے لے چلیں، وہ ......وہ آجائے گا۔" وہ سسکی اور تڑپ کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ اس کے ہر انداز سے اضطراب اور انتشار جھلکتا تھا۔ عبدالغنی نے اسی رسان سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ دوسرے سے اس کا گال تھپکا تھا۔

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں علیزے گڑیا، وہ اب یوسف نہیں، عبدالہادی ہے۔ وہ اسلام قبول کر چکا ہے۔ اور آپ کو پتا ہے ناں نومسلم نوزائیدہ بچے کی طرح ہوتا ہے، ہر عیب، ہر گناہ سے پاک۔"

علیزے کے چہرے کے عضلات جیسے سکتے کی کیفیت میں آکر جامد ہو گئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں گھات لگائے بیٹھا خوف سرعت سے پھیل گیا۔ معاً وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور خفا انداز میں عبدالغنی کا ہاتھ دور ہٹا دیا۔

"آ......آپ کا مطلب ہے آپ مجھے اس سے نجات نہیں دلائیں گے؟" اس کی آواز میں غم وغصہ کے ساتھ خوف اور وحشت کی فراوانی تھی۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھر کے خود کو کمپوز کیا۔

"علیزے بیٹے......"

"کوئی صفائی نہ دیجیے گا اس مکار انسان کی مجھے۔ بھائی......! آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔ یہ بھیس بدل کر، بہروپ بھر کے وہ سب کو دھوکہ دے سکتا ہے مجھے نہیں۔" وہ چیخی تھی۔ عبدالغنی نے بے حد نرمی سے اسے تھام لیا۔

"دیکھو علیزے گڑیا! اللہ نے ہمیں ظاہری قول و فعل کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ دل میں کسی کے ایمان ہے یا نہیں یہ طے کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ فیصلہ کرے گا۔ بہتر ہے تم اس بات کو نہ سوچو۔" علیزے نے جیسے بے تحاشا دکھ میں مبتلا ہو کر آنسوؤں سے چھلکتی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکی دبائی۔

"آپ اس کے عزائم اور فطرت سے آگاہ نہیں ہیں، میں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے سب سے قیمتی خزانے اسی کی وجہ سے کھوئے۔ مجھے لگتا ہے میں ایک بار پھر اللہ کو کھو چکی۔ یہ اللہ کی ناراضی کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں پھر سے اسی آزمائش اور اذیت سے دوچار کر دی گئی ہوں۔"

وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ عبدالغنی نے خود کو زندگی کے دشوار ترین لمحات سے دوچار پایا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ایسا کیا کہے کے علیزے کی تشفی ہو سکے۔ اس کا خوف قرار پا سکے۔ بریرہ کو آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ عبدالہادی کے بار بار فون آتے تھے۔ وہ اسے علیزے کے اٹھنے سے قبل وہاں بلانا چاہتا تھا تا کہ وہ اسے سنبھال سکے۔

"اگر انہوں نے پھر مجھے دیکھا تو مجھے خطرہ ہے ان کی ذہنی حالت مزید ابتر ہو جائے گی بھائی! بہتر ہو گا آپ تشریف لے آئیے۔"

اور عبدالغنی کو اس کے لہجے کی بے قراری نے ایک بار پھر واضح کیا تھا کہ اس کے نزدیک علیزے کی، اس کے احساسات کی کتنی پروا ہے۔ اسے یک گونا طمانیت محسوس ہوئی تھی۔ لاریب کو صورتِ حال کی گھمبیرتا کے متعلق مختصراً بتا کر وہ خود یہاں چلا آیا تھا تا کہ لاریب سلیقے سے بریرہ تک یہ بات پہنچا سکے۔ عبدالغنی کا ذاتی خیال تھا بریرہ اس سے بہتر طور علیزے کو سنبھال اور سمجھا سکتی تھی۔

"کسی کے بارے میں بلا ضرورت تجسس نہیں رکھنا چاہیے۔ علیزے گڑیا اندازے لگانے اور شک

کرنے سے پرہیز کرو۔ اس سے روحانی توانائی جمع ہوگی۔ جیسے جیسے یہ توانائی بڑھے گی۔ اللہ سے قربت بھی بڑھے گی۔ دعائیں قبول ہوں گی۔ غیبی مدد حاصل ہوگی۔ اگر اُس مالکِ حقیقی پر تمہارا اٹل یقین ہے تو دوسروں کی کوتاہیوں پر کڑھنے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ محض عیب جوئی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس راز کو جان لو میری جان! اور خود کو اس احساس سے لاتعلق کرلو۔ سکون کا راز اس کے علاوہ کوئی نہیں۔"

بریرہ جو اس کی آخری بات سُن چکی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بے حد ٹھہرے ہوئے انداز میں ایسے بولی تھی جیسے پانی بہتا ہو، بے آواز۔ علیزے نے جواب میں کچھ کہے بغیر شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور آنکھوں میں آئی نمی کو ہاتھ کی پشت سے رگڑنے لگی۔ عبدالغنی بریرہ کو دیکھ کر بے اختیار پُر سکون ہوا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے آپ سب نے طے کرلیا ہے کہ مجھے اس کے حوالے کرنا ہے۔ کوئی میری بات نہیں سمجھتا۔" وہ اپنے بال مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے وحشی ہوتی ہوئی چلائی۔ بریرہ نے بے اختیار اسے تھاما، اور اپنے ساتھ لگالیا۔

"بابا جان اور عبدالغنی اپنی اپنی جگہ استخارہ کر چکے ہیں علیزے! تم جانتی ہو اشارہ مثبت تھا۔ اللہ کے فیصلے پر کیسا شک۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔ علیزے کے اندر اسی قدر ہیجان امڈنے لگا۔

"یہ بھی حقیقت ہے کہ صحیح اور حقیقی علم اللہ کے پاس ہے۔ استخارہ کو حرفِ آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ مجھے تو یہ عتابِ الٰہی ہی لگ رہا ہے۔ صرف گہری اور کڑی آزمائش، اللہ کی ناراضگی۔"

وہ ہاتھوں پر سر گرا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ عبدالغنی نے بے بسی سے بریرہ کو دیکھا۔ جو خود لاچار تھی۔

"میں نے اپنی مرضی سے خدا کو چھوڑا تھا۔ اب اگر وہ مجھے چھوڑ دے تو مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔" اس کی آواز میں جیسے نوحے گونج رہے تھے۔ عبدالغنی نے بے اختیار ہو کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو علیزے! اللہ ایسا نہیں کرتا، ایسا تو دنیا کرتی ہے۔ ہم انسان کرتے ہیں۔ دھوپ کو دیکھو وہ ہر شے پر اتر رہی ہے۔ بلا تخصیص سب کو نواز رہی ہے۔ کسی کو حرارت سے محروم نہیں کرتی۔ دھوپ پیڑ پر اُترتی ہے تو وہ پھول اور پھل دیتا ہے۔ اور کسی پتھر پر دھوپ پڑے تو وہ کیا دے گا۔ بے فیض ناشکرا پڑا رہے گا جوں کا توں۔ اس میں دھوپ کی تو کوئی غلطی نہیں۔ یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ ہم دنیا کو تھامے رکھنے کی خاطر ہلکان ہو جاتے ہیں۔ علیزے...... مجھے یہی کہنا ہے۔ خود کو سنبھالو۔ اس وقت ضرورت تمہیں اپنا ظرف بڑا کرنے کی ہے۔ خدا کی قدرت کو سمجھو۔ اس اشارے میں محض حکم کو سمجھو۔ تم کیا سمجھتی ہو یہ سب یا اتنا بڑا کام یونہی ہو گیا؟ اس میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہے؟ ایسا ممکن ہی نہیں۔ ممکن ہے اللہ تم سے کچھ چاہتا ہو۔ جھوٹا سچا جیسا بھی...... وہ مسلمان تو ہوا ہے ناں۔ اسے اپنے سنگ لے کر چلو۔ یاد کرو۔ برسوں قبل اللہ یہ کام میرے سپرد بھی کر چکا۔ بھائی کے سپرد بھی کر چکا۔ اب تمہاری باری آگئی ہے۔ میں ناکامی کا شکار ہوئی۔ بھائی کو اللہ نے سرخرو کردیا۔ تم سرخرو ہونا نہیں چاہو گی؟"

بریرہ نے اس کا ہاتھ تھام کر بے حد رسانیت سے کہا تھا۔ علیزے چکرا سی گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ شدتِ جذبات نے اسے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ بس آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ اگر جھوٹا بھی ہے۔ منافق بھی ہے۔ تب بھی تم اپنی ریاضت سے، اپنی دعاؤں سے اسے صحیح راستے پر لے آؤ۔ اگر اللہ نے یہ کام تمہارے سپرد کیا ہے تو اس حکم پر سر جھکا دو۔" وہ اس کا سر تھپک رہی تھی۔ عبدالغنی نے مسکرا کر بریرہ کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ بریرہ کی آنکھیں جانے کس کس احساس سے نم ہو رہی تھیں۔ کچھ کہے بغیر اس نے علیزے کو گلے لگا کر بھینچ لیا۔ جو بری طرح کانپ رہی تھی۔ بریرہ نے اسے تھپکا تھا پھر اسی پُرسان مدھم لہجے میں مزید گویا ہوئی تھی۔

"اس لیے بھی سویٹ ہارٹ کہ سعید روحیں ناموافقت پر منہ سرلپیٹ کر نہیں پڑا کرتیں۔ دُعا کے ذریعے رابطے میں رہتی ہیں اور ادھر کوئی غرض و غایت ہی رابطہ ہے۔ امتحان نہ ہوں تو ہاتھ اٹھانے کا دھیان کیسے آئے۔ رابطے تو دھیان کے محتاج ہیں۔ فطرت سے بددلی اور اعراض...... فطرت کو بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔ مگر رابطے بحال رہنے کی صورت میں بہت کچھ ہونے کے امکان روشن رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تم ہمت ہارو، مایوس ہو، حالات کیسے بھی ہوں اب اِس بھروسے کو کمزور نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ تعلق گہرا ہونا چاہیے۔" علیزے کا وجود ہولے ہولے ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ مگر یہ خاموشی بھی غنیمت تھی۔ اس شدید منفی رویے سے تو بہت غنیمت اور بہتر۔

☆......☆......☆

اس کا ولیمے کا جوڑا پیازی رنگ کا تھا۔ بہت بھاری نہیں تھا مگر بہت نفیس کام سے مزین تھا۔ ساتھ میں بہت خوبصورت میچنگ کی جیولری تھی۔ عبدالغنی واپس چلا گیا تھا مگر بریرہ وہیں رُک گئی تھی، علیزے کے پاس۔ عبدالہادی نے ہی اسے بتایا تھا کہ سوٹ کیس میں سب چیزیں موجود ہیں۔ چونکہ ولیمے کی تقریب بہت سادہ تھی اور زیادہ مہمان بھی مدعو نہیں تھے۔ سارا انتظام گھر پر ہی تھا۔ عبدالہادی ہی شاہ صاحب کے ساتھ سارے انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ بریرہ خود بھی عبدالہادی سے مل کر بہت مطمئن ہوئی تھی۔ جھکی نظروں والا بے حد خوبرو سا یہ نوجوان اسے علیزے کا صحیح حقدار لگا تھا۔ عبدالغنی کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بجا کر اس سے کتنے مؤدب اور احترام بھرے انداز میں کلام کیا تھا۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کیجیے آپا۔" عبدالغنی کے ہاتھ وہ اس کی ضیافت کے لیے مشروب اور پھل وغیرہ اندر پہلے بھجوا چکا تھا۔ بریرہ چونکہ پردہ کرتی تھی جبھی وہ خود بھی بہت خیال کر رہا تھا۔

"شکریہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کی مہربانی عبدالہادی بھائی!" بریرہ نرمی سے مسکرا کر جواب دینے لگی۔ معاً کچھ یاد آنے پر بولی تھی۔

"ولیمے کا جوڑا تو بنوایا ہوگا آپ نے علیزے کا؟ وہ بتا دیجیے کہاں ہے۔ تاکہ میں تیار کرسکوں اسے۔"

"جی...... جی بالکل! بیڈ کے نیچے میرون کلر کا سوٹ کیس ہے۔ ہر شے ضرورت کی اس میں موجود ہے۔ وہ......" معاً وہ جیسے جھجک محسوس کرتا تھم گیا تو بریرہ نے اسے حوصلہ دینے کو لہجہ مزید نرم کیا تھا۔

"جی...... جی، کہیے عبدالہادی بھائی! بلا جھجک کہیے۔" اس کے حوصلہ دلانے کے باوجود وہ چند ثانیے خاموش رہا تھا۔ پھر جب بولا تو انداز دھیما اور ہنوز جھجکتا ہوا تھا۔

"مم...... میں دیا...... میرا مطلب ہے علیزے کی خیریت جاننا چاہتا تھا۔ وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟" اور علیزے کو پلٹ کر دیکھتی بریرہ کے چہرے پر بہت کھلی کھلی مسکان بکھر گئی تھی۔ اسے عبدالہادی کا یہ فکرمندانہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔ جانتی تھی عبدالغنی اس

کی تسلی کرا کے گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ سوال جتلاتا تھا عبدالہادی کے نزدیک علیزے کی کس درجہ اہمیت ہے۔

''جی وہ بہت بہتر ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بلکہ اگر اسے ملنا چاہیں تو آ جائیے۔'' مسکراہٹ دبائے وہ بظاہر سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ علیزے جیسے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی، بیٹھی رہی۔ بلکہ بریرہ کو تو شک ہوا اس نے شاید اس کی بات سنی بھی نہیں تھی۔ دوسری جانب عبدالہادی جھینپ کر رہ گیا تھا۔

''نہیں...... نہیں، اٹس اوکے، میں باہر جاتا ہوں اب۔ غالباً چاچو کو ضرورت ہو گی میری۔'' بوکھلا کر کہتا وہ پلٹ کر تیز قدموں سے چلا گیا تھا۔ بریرہ مسکراتی ہوئی پلٹ کر بیڈ کے نزدیک آ کر جھکی اور سوٹ کیس کھینچ لیا۔ چابی لاک میں ہی لٹک رہی تھی۔ اس نے لاک کھولا اور ایک ایک کر کے چیزیں نکالیں۔

''اگر یہ عبدالہادی نے خود خریدی ہیں تو بہت شاندار ہے اس کی پسند۔'' وہ علیزے کو بولنے پر اکسانے کی خاطر جوڑا اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔ وہ جامد تاثرات کے ساتھ بیٹھی رہی۔ بریرہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر نرمی سے مخاطب کیا تھا۔

''علیزے...... چندا جاؤ فریش ہو کے آؤ۔ ٹائم دیکھو۔ بارہ بج گئے ہیں۔ مہمان بس پہنچتے ہوں گے۔''

علیزے کی آنکھوں کی سطح پر بے بسی کے شدید احساس کے ہمراہ نمی چمکنے لگی۔ کچھ دیر ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی۔ پھر جھٹکے سے اُٹھ کر پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ واپس لوٹی تو دوپٹہ غائب تھا۔ کپڑے آدھے سے زیادہ گیلے تھے۔ انداز روٹھے بچوں جیسا ہٹ دھرم سا تھا۔

''اچھا بھئی کپڑے تو چینج کر کے آؤ۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔'' بریرہ نے پچکار کر کہا تھا۔

علیزے کے چہرے پر جھنجلاہٹ سی بکھری۔ وہ ایک بار پھر ایک جھٹکے سے اُٹھی تھی۔ جھپٹ کر اس کے جما جما کر استری کیے کپڑے مٹھی میں دبوچ کر اٹھائے۔

''میں بتا رہی ہوں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی گھر جاؤں گی۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔ ایسے کہ آنکھوں میں لرزتے آنسو گالوں پر پھیل آئے۔ بریرہ کو اس پر اس پل بے تحاشا ترس آیا تھا۔

''وہ تو چلو گی ہی، اس میں نیا کیا ہے۔ ویسے پر دلہن رسم کے مطابق میکے جاتی ہے۔ بھول گئیں تم؟'' وہ اس کا گال تھپک کر بہلانے والے انداز میں بولی تھی۔ علیزے کے چہرے پر زندگی کا رنگ اترا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ ایسے واش روم کی جانب بڑھی۔ جیسے زندہ رہنے کی نوید سنی ہو۔ لباس تبدیل کر کے وہ باہر آئی اور برش اُٹھا کر خود بال سلجھانے لگی تھی۔ بریرہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ پھر اس کی تیاری کے دوران وہ دل ہی دل میں اس کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی۔

''اس سب کی کیا ضرورت ہے بجو!'' میک اپ اور جیولری سے اسے بار بار ٹوکتے ہوئے کہتی رہی تھی۔ بریرہ اسی نرمی سے اسے بہلائے گئی۔

''ضرورت ہے ناں میری جان! سب کیا کہیں گے۔''

''آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی بجو! پلیز مجھے اکیلا نہ چھوڑیے۔'' بریرہ نے اس کو دوپٹہ اوڑھا کر تیاری مکمل کی تو علیزے نے پھر ہراساں ہوتے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں کم ڈاؤن۔ دیکھنا ابھی اُم جان اور لاریب کے ساتھ دیگر لوگ بھی آ جائیں گے۔ بلکہ آتے ہی ہوں گے۔'' بریرہ نے اس کا گال سہلا کر تسلی دی تھی۔

''ہم آ گئے ہیں جناب! ویلکم تو کیجیے۔'' لاریب دروازے سے ہی چہکی تھی اور کھلکھلاتی ہوئی دونوں

بازو وا کیے آ کر علیزے کے گلے لگ گئی۔
''کیسی ہے ہماری بنو؟'' اس کا انداز مخصوص شوخی وشرارت لیے تھا۔ بریرہ نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کیا تھا۔ لاریب سنبھل سی گئی۔ علیزے کے انداز میں اس جیسا جوش وخروش تو کیا ہلکی سی بھی خوشی نہیں تھی۔
''اُم جان کہاں ہیں؟'' بریرہ نے چیزیں سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھتے سوال کیا۔
''وہ اپنے حسین وجمیل داماد سے سلام دُعا کررہی تھیں۔ ہم یہاں بھاگ آئے۔ بہت پیاری لگ رہی ہو علیزے، بالکل گلابی گڑیا!'' اس نے بہت محبت سے علیزے کی پیشانی چومی۔ وہ تب بھی بجھی بجھی سر جھکائے بیٹھی رہی۔
''اُم جان کے سامنے اپنا رویہ نارمل رکھنا علیزے! انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے اور معلوم ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ناں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ برداشت نہیں کرسکیں گی۔'' بریرہ نے سوٹ کیس بند کر کے دوبارہ بیڈ کے نیچے کرتے ہوئے اسے ایک طرح سے تنبیہہ کی تھی۔ علیزے کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے سخت احتجاجی نظروں سے پہلے بریرہ پھر لاریب کو دیکھا تھا مگر بریرہ نے کوئی تاثر نہیں دیا۔
''لاریب ہے تمہارے پاس، میں ذرا عبداللہ کو دیکھ لوں۔ اٹھ نہ گیا ہو۔'' وہ پلٹ کر باہر چلی گئی تھی۔ علیزے کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُتر آئے۔
''مجھے تو لگتا ہے میں کوئی بوجھ تھی ان سب کے سروں پر اتنے سالوں سے، جسے اس طرح اُتار کر پھینک دیا ہے۔ اب جیسے بھی حالات کاٹوں ان کی بلا سے۔'' وہ ہیجانی کیفیت کے زیر اثر بولی تھی۔ آنسو گالوں پر ٹپ ٹپ برسے تھے۔ لاریب کے تو اوسان ہی خطا ہوگئے۔ وہ ٹپٹا کر لپکتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی اور اسے اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔
''ایسا مت سوچو علیزے خدارا! ایسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے۔ اُم جان سے ہی ذرا بچاؤ کرنے کا کہا ہے، ایسا ان کی محبت میں کہا ہے۔ ان کا دل بہت

کمزور ہو چکا ہے۔ معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔" لاریب نے نرمی سے سمجھانا چاہا تھا۔ مگر علیزے نے اس کی بات پکڑ لی تھی۔

"تو تم مانتی ہو کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ میری جگہ پہ خود کو رکھ کر سوچو لاریب! پھر تمہیں اندازہ ہوگا میری اذیت کا۔" وہ سلگتے کوئلے کی مانند چٹخی۔

لاریب نے بے اختیار اس کا ہاتھ دبا دیا۔

ممی سارہ کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ علیزے نے ہونٹ بھینچ لیے۔ لاریب اُٹھ کر ان سے ملنے لگی۔

"اُم جان کہاں رہ گئیں؟" لاریب کو ان کے اب تک نہ آنے پر حیرانی ہوئی۔

"ان کی ذرا طبیعت بگڑ گئی تھی۔ باہر برآمدے میں بٹھایا ہے ہوا میں۔ کہہ رہی تھیں طبیعت سنبھلتی ہے تو اندر آتی ہیں۔" سارہ کے بتانے پر علیزے کے چہرے پر فکرمندی اور اضطراب پھیلتا چلا گیا۔ اگلے لمحے وہ کپڑے سمیٹ کر مضطربانہ انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ک...... کیا ہوا اُم جان کو؟" اس کی آواز لرزنے لگی۔

"میں دیکھتی ہوں علیزے! تم پریشان نہیں ہو، بیٹھو۔" لاریب نے اسے تھام کر بٹھانا چاہا مگر وہ تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک گئی تھی۔

"نہیں، میں خود دیکھوں گی انہیں، ابھی تو ٹھیک تھیں وہ۔" بھیگی آواز میں کہتی وہ لاریب سے بھی پہلے دروازے کی جانب بڑھی تھی اور تیز قدموں سے چلتی برآمدے کے آخری سرے پر رکھی کرسیوں کی جانب آ گئی۔ جہاں بریرہ بھی اُم جان کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔

"اُم جان......!" وہ تقریباً دوڑ کر ان کے نزدیک آئی اور سسکی سی بھرتے ہوئے ان کے کھلے بازوؤں میں سماتی گلے لگ کر رو پڑی۔

"کیا ہوا آپ کو؟" اس کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ اُم جان اس کی فکرمندی پر نرمی سے مسکراتے تھپکنے لگیں۔

"پریشان مت ہو بیٹے! ذرا بی پی شوٹ کر جانے کے باعث چکر آ گیا تھا۔ آپ لوگ خوامخواہ اتنا پریشان ہو جاتے ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ دیکھو بھلی چنگی تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔" وہ بہت توجہ سے کہتے اس کے آنسو پونچھنے لگیں پھر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

"تم بتاؤ میری بچی! خوش ہو ناں تم؟" ان کے لہجے میں کیا کچھ نہ تھا۔ خوشی، اطمینان، خدا سے اپنی دعا کی قبولیت کا شکر، فخر، علیزے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ معاً اپنے چہرے پر نگاہوں کی تپش کا احساس پا کر بے اختیار اس کی نگاہ داہنی جانب اُٹھی تھی۔ وہ وہی تھا۔ سفید براق لبادے پر سیاہ گاؤن میں ملبوس، اسے یک ٹک دیکھتا ہوا۔ نگاہوں کا یہ تاثر بہت نرمی اور محبت کا گرم تاثر لیے تھا۔ علیزے نے فی الفور نگاہ پھیر لی۔ چہرے پر بہت تکلیف دہ تاثر پھیلا تھا۔ اس نے غیر محسوس انداز میں رُخ پھیر لیا۔

"آپ اندر آ جائیے! اُم جان۔" وہ مدھم رہ کر بولی مگر اُم جان اب اس کی بجائے عبدالہادی کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔

"آ جاؤ بیٹے! وہاں کیوں کھڑے ہیں آپ" ان کا پُرشفقت لہجہ محبت سے لبریز تھا۔ جو علیزے کو گراں گزرا تھا جبھی ہونٹ بھینچ لیے۔

"یہ میں آپ کے لیے دوا لایا تھا۔ آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی انشاء اللہ!" وہ بھاری آواز میں کہتا قریب آ گیا۔ علیزے کے پہلو میں۔ علیزے کو اپنا پہلو جلتا آگ کی لپٹوں میں آتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سرعت سے پیچھے ہٹی تھی اور کسی کی بھی

پروا کیے بغیر پلٹ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ عبدالہادی کا چہرہ ایک لمحے کو پھیکا پڑ گیا۔

''میں اب ٹھیک ہوں بیٹے! آپ نے بہت زحمت کی۔ اللہ بھلا کرے، جزاک اللہ!'' وہ اسے دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔ عبدالہادی بمشکل مسکرا سکا۔

☆......☆......☆

''میں آپ کے ساتھ چلوں گی اُم جان!'' وہ ان کے پہلو سے لگ کر بیٹھی ہر دو منٹ بعد یہی بات دہراتی تھی۔ اب اُم جان کو بھلا کیا پتا تھا اس کے مسئلے کا جبھی ہر بار مسکرا کر اس کا گال تھپک دیتیں۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن تھیں کہ ان سے جدا ہونے کے خیال سے گھبرائی ہوئی ہے جبکہ اس کا یہ انداز لاریب کو اور بریرہ کو پریشان کر رہا تھا۔

''بیٹے یہ سب کیوں اتار رہی ہو؟'' اسے زیور اور گجرے وغیرہ اتارتے پا کر اُم جان نے ٹوکا تھا۔ علیزے ٹھٹک سی گئی۔

''کیوں......؟ میں آپ کے ساتھ نہیں چل رہی؟''

''ہاں، کیوں نہیں بیٹے! جبھی تو کہہ رہی ہوں رہنے دو۔ آس پڑوس کی بچیاں اور خواتین تمہاری آمد کی منتظر ہوں گی۔ تم سے ملنے آئیں گی۔ کیا پھر دوبارہ پہنو گی جا کر یا اتنے سادہ حلیے میں ملو گی سب سے؟'' وہ مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔ علیزے سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بے دلی سے اُتارا ہوا جھمکا پھر پہن لیا۔

''تو کیا یہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا؟'' وہ سب عبدالہادی سے الوداعی انداز میں مل رہے تھے۔ جب علیزے نے تلملا کر لاریب سے پوچھا تھا۔

''نہیں بھئی! حالانکہ چلنا چاہیے تھا۔ مگر تمہارے خطرناک تیوروں سے شریف انسان ڈر گیا ہے۔'' وہ حسب عادت کھلکھلائی۔ علیزے نے دانت پیس لیے۔ البتہ اطمینان قلب ضرور ہوا تھا۔ اس سے نجات کا احساس ہی بڑا سکون بخش تھا۔

''آج تو آپ نے ٹال دیا اپنی اہم معروفیات کا کہہ کر، مگر کل ہم انتظار کریں گے آپ کا رات کے کھانے پر بیٹے!'' بابا جان نے نہایت محبت سے کہتے عبدالہادی کو گلے لگایا تو اس کی نگاہ نا چاہتے ہوئے بھی علیزے کی جانب اٹھ گئی تھی۔ جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھی مگر تاثرات سرد ضرور تھے۔ ضبط گریہ نے اس کی ساحرانہ آنکھوں کے فسوں کو بڑھا ڈالا تھا۔ چہرے پر نفرت کا سیاہ رنگ اتنا ہولناک ہوتا کہ وہ نگاہ ملانے سے بھی کترا جاتا۔ یہاں ساتھ نہ جانے کا فیصلہ بھی اسے اذیت سے بچانا مقصود تھا۔

''جی میں حاضر ہو جاؤں گا انشاء اللہ!'' ان سے الگ ہو کر وہ فرمانبردار تابعدار انداز میں بولا تھا۔

''جیتے رہو بیٹے! اللہ پاک خوشیاں نصیب کرے۔'' انہوں نے نہال ہو کر دعاؤں سے نوازا۔ وہ ان سب کو رخصت کرنے ساتھ باہر تک آیا تھا۔ شاہ صاحب بھی موجود تھے۔ علیزے کے دل کو اس کی موجودگی کے باعث ہی پنکھ لگے ہوئے تھے۔ جلدی اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھتے نازک چپل اس کے پیر سے نکل کر نیچے گر گئی تھی اور دکھ کی بات یہ کہ یہاں قریب ترین بھی عبدالہادی ہی تھا اور متوجہ بھی۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھا تھا اور چپل اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دی۔ علیزے کے چہرے پر بے بسی اضطراب اور عجیب سا تنفر پھیل گیا۔ کوئی راہ فرار نہ پا کر اس نے نم جلتی آنکھوں کے ساتھ ہونٹ بھینچے چہرے کا رُخ پھیر لیا۔ عبدالہادی نے بہت ساری نگاہوں کا خود کو مرکز محسوس کر لیا تھا۔ جبھی دکھ کو اندر اتار کر چہرے پر مسکان سجالی۔ گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر جھکا

اور جوتا اس کے قدموں کے پاس رکھ دیا۔
"فی امان اللہ!" وہ آہستہ سے بولا تھا اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ بے بسی کے مظہر آنسو علیزے کے چہرے پر پھیلتے چلے گئے تھے۔ پھر وہ سارے رستے میں چپکے چپکے روتی اور اللہ سے شکوے کرتی گئی تھی۔

☆......☆......☆

حسبی ربی جل اللہ اللہ ہو اللہ
معافی قلبی غیر اللہ اللہ ہو اللہ
وہ تنہا وہ کون ہے اللہ ہو اللہ
بادشاہ وہ کون ہے اللہ ہو اللہ
مہرباں وہ کون ہے اللہ ہو اللہ
کیا اونچی شان ہے اللہ ہو اللہ

الماری میں کتابیں سیٹ کرتے ہوئے وہ بہت مگن انداز میں پڑھ رہا تھا۔ جب شاہ صاحب نے کھنکھار کر متوجہ کیا۔ وہ بے ساختہ چونکا۔ پھر انہیں روبرو پا کے مسکرا دیا تھا۔
"چاچو...... آیئے ناں!" وہ ایک دم مؤدب ہو گیا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اندر قدم رکھا۔
"تم نے پھر والدہ سے رابطہ کیا تھا عبدالہادی!" کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے آمد کا مقصد بیان کیا۔
عبدالہادی کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا کر معدوم ہو گیا۔ اس کی ماں نے اس کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع پا کر پہلے تو ہر طرح سے اسے اس کام سے پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ ناکامی کی صورت قطع تعلقی اختیار کر لی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا شاک تھا۔ مگر وہ ثابت قدم رہا تھا۔
"نہیں، ایک سال قبل جب رابطہ کیا تب بھی وہ مجھے معاف کرنے، بات کرنے کو آمادہ نہیں تھیں۔" وہ مدھم ہو کر کہہ رہا تھا۔

"ایک بار پھر ان سے رابطہ کرو۔ انہیں اپنی شادی کی اطلاع دے دو بیٹے!"
"جی بہتر چاچو! جیسے آپ کہیں۔"
"آج تمہیں اپنے سسرال بھی جانا ہے۔ علیزے بیٹی کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ؟"
"جی...... اور انکل نے آپ کو بھی بصد اصرار ساتھ لانا کا کہا تھا۔ دیا کا رویہ بہتر ہو جائے گا اللہ نے چاہا تو۔" وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ اس کے حوصلے بلند تھے۔ یہ وہ محسوس کر سکتے تھے۔
"اللہ پاک تمہارے لیے آسانیاں مہیا کرے آمین۔ اور بیٹے اپنے سسر سے میری طرف سے معذرت پیش کرنا۔ پھر کبھی ضرور حاضری دوں گا۔ یہی کہنے آیا تھا۔ اب چلتا ہوں۔ کسی کام سے شہر سے باہر جانا ہے۔ اللہ نگہبان۔"
"جی بہتر! فی امان اللہ!" وہ اُٹھ کر ان کے گلے ملا تھا۔ اور انہیں رخصت کرنے باہر تک ساتھ آیا۔
واپس آ کر مام کا نمبر ملایا تھا۔ جو بزی جا رہا تھا۔ اس نے آواز میسج چھوڑ دیا۔
شام کو جب وہ علیزے کے ہاں پہنچا تو عبدالغنی کے ساتھ بابا جان بھی اس کے منتظر تھے۔ اس کو اتنی ہی اہمیت اور پروٹوکول دیا جاتا رہا جس کا وہ حق رکھتا تھا۔ وہ علیزے کا منتظر تھا۔ وہی اسے نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ وہ بابا جان کے بلانے کے باوجود کھانے میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ تو اسے طرح طرح کے وہم گھیرنے لگے تھے۔ اللہ جانے وہ اس کے ساتھ جانے پر بھی آمادہ ہوتی ہے یا نہیں۔ اسے ایسی ہی سوچیں متفکر کرنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

عبدالغنی کے کہنے پر بریرہ اُٹھ کر علیزے کے پاس کمرے میں آئی تو اسے سر تک لحاف اوڑھے گٹھری کی طرح سوتی بنے پایا تھا، وہ سرد آہ بھر کے

رہ گئی۔ خطرہ دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے والا یہ انداز سراسر بچکانہ ہی تو تھا۔

''علیزے..... اٹھو بھئی! عبدالہادی کب سے آئے ہوئے ہیں۔ تم سلام کرنے بھی نہیں گئیں۔ کتنی بری بات ہے۔'' بریرہ نے اپنا لہجہ اپنا انداز بے حد سرسری رکھا تھا۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ آتش فشاں لاوے کی مانند پھٹ پڑی تھی۔

''کتنی بری بات.....؟ میں کیوں کروں سلام؟ ہے وہ اس قابل؟ آیا ہے تو آیا رہے۔ میرے جوتے کو بھی جو پروا ہو۔ بلکہ میرا بس چلے تو اسے اپنے گھر سے دھکے مار کر نکال دوں۔ اتنی ہی نفرت ہے مجھے اس منافق شخص کی صورت سے۔''

لحاف غصے میں دور اچھال کر وہ آتشیں لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر بولی تھی۔ لہجے میں جو نفرت تھی وہ ایک طرف حقارت اور تضحیک کے عنصر نے بریرہ کو ہلا کر لرزا کر رکھ دیا تھا۔

''اللہ اکبر..... لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم علیزے چندا اللہ تم پر رحم فرمائے۔ ایسا نہیں کہتے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ علیزے کچھ کہے بغیر آنکھوں میں آنسو لیے خاموش بیٹھی رہی۔ شاید اسے بھی اپنے الفاظ کا احساس ہو گیا تھا۔ بریرہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور بہت محبت سے بوسہ ثبت کیا تھا۔

''میں نے اُس دن کیا سمجھایا تھا۔ سب بھول گئیں؟''

''مجھے اس سے نفرت ہے۔'' اس کے چہرے پر بے بسی چھلکی اور آنکھوں سے آنسو۔

''تمہیں پتا ہے ناں قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے آیت کا مفہوم ہے۔ جو چیز ہمیں بری لگ رہی ہے ضروری نہیں ہے وہ بری ہو۔ اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کرو۔ غور کرو۔ علیزے دنیا کا نظام اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ کوئی بھی چیز خود اپنے فائدے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ دریا خود اپنا پانی نہیں پیتے۔ درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتے نہ اپنے آپ کو سایہ دیتے ہیں۔ سورج اپنے لیے حرارت نہیں پھیلاتا۔ پھول بھی خوشبو اپنے لیے نہیں بکھیرتے۔ پتا ہے کیوں؟ کیونکہ دوسروں کے لیے جینا ہی اصل زندگی ہے۔ ہر انسان کو اللہ نے کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ تم سمجھو تمہیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور تکبر سے بچو۔ اپنی معمولی سے معمولی نیکی پر بھی غرور میں انجانے میں بھی جتلانہ ہونا۔ تکبر انسان کے لیے شیطانی عمل ہے۔ اگر اپنے تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو کسی کو خود سے کمتر نہ جانو۔ دُعا اپنے لیے مانگنا عبادت ہے۔ اور دوسروں کے لیے مانگنا خدمت، عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا۔ تمہیں کیا چاہیے؟ یقیناً خدا۔ علیزے تم عبدالہادی کے لیے دعا کرو۔ وہ اگر صراطِ مستقیم پر نہیں بھی ہے تو صراطِ مستقیم پر آ جائے۔ نیکی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ایک خدا سے عاجزی اور محبت کا راستہ بنانے کی طرف لے جاتی ہے۔ اُس کی مخلوق سے خیر خواہی پر اُکساتی ہے۔ دوسری شاخ دل میں نیکی کا گھمنڈ پیدا کرتی ہے۔ اب یہ انسان کے ضمیر پر منحصر ہے کہ وہ کس شاخ کا انتخاب کرتا ہے۔ میں یہ تمہیں اس لیے سمجھا رہی ہوں علیزے کہ میں نے تمہارے الفاظ سے تکبر اور گھمنڈ کو محسوس کیا ہے۔ میں یہ ٹھوکر کھا چکی۔ اعمال کا ضائع ہونا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی تمہیں بھی اس نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔'' علیزے اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کے خاموش آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

(حیرت کے در وا کرتے، اس ناول کی اگلی قسط ماہ ستمبر میں ملاحظہ فرمایئے)

افسانہ

"شریکِ حیات تو سُنا تھا یہ شریکِ وفات کیا ہوتی ہے؟" نواز صاحب بھی مذاق کے موڈ میں تھے۔ "بیوی شوہر کی وفات میں ضرور شرکت کرتی ہے کیونکہ مرتا تو پہلے شوہر ہی ہے اس لیے بیوی شریکِ وفات ہی ہوتی ہے۔" حنیف صاحب نے......

عید کے رنگ، عیدی کے سنگ، بطور افسانہ

جمشید ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پی ٹی وی لگا رکھا تھا۔ ٹی وی پر عشاء کی اذان نشر ہو رہی تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا اور شرعی داڑھی بھی اُس نے رکھی ہوئی تھی۔ ہر وقت اُس کے سر پر سفید ٹوپی رہتی تھی۔ سفید کُرتا پاجامہ اُس کا لباس تھا۔ جبکہ جمشید کا بھائی شعیب جو اِس سے تین سال چھوٹا تھا۔ کرکٹ کا دیوانہ تھا۔ کرکٹ کھیلنا اور کرکٹ دیکھنا ہی اُس کا شوق تھا۔ ہر وقت کرکٹ کٹ میں ملبوس ہوتا، جب دیکھو اُس کے ہاتھ میں بلا نظر آتا۔ شعیب کرکٹ کٹ میں ملبوس ہاتھ میں بلا پکڑے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تو اس نے ریموٹ پکڑا اور چینل تبدیل کر دیا۔ پاکستان انڈیا کا لائیو میچ آ رہا تھا۔

"یار مجھے اذان سُننے دو، یہ کیا بدتمیزی ہے؟" جمشید غصے میں آ گیا۔

"مولوی صاحب اذان ہو چکی ہے۔ جائیں جا کر نماز پڑھیں اور مجھے میچ دیکھنے دیں۔ آفریدی کریز پر آ گیا ہے۔"

سدرہ اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ مگر دونوں سے بے تکلف تھی۔ جمشید نماز کے لیے جا چکا تھا۔ اب سدرہ اور شعیب موجود تھے۔

"ڈیئر سسٹر سدرہ ایک دن میرے خواب ضرور پورے ہوں گے جب میں پاکستانی ٹیم میں منتخب ہو گیا تو پھر تم نے مجھ سے آٹوگراف لینے کو ترسنا ہے۔"

آخر شعیب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کر مسجد کی طرف جانا پڑا۔

شعیب کے نکلتے ہی حنیف صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ اپنا بریف کیس انہوں نے صوفے پر پھینک دیا اور صوفے پر بیٹھتے ہی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور بولے۔

"خالدہ بیگم آج تو پاکستان اور انڈیا کا میچ لگا ہوا ہے اور تم ٹی وی بند کر کے بیٹھی ہو۔ باہر تو میچ کی وجہ سے سڑکیں ویران ہو گئی ہیں۔" پھر حنیف صاحب نے بیگم سے ریموٹ لے کر ٹی وی آن کر دیا۔

"شعیب کی طرح آپ کو بھی نا اُٹھتے بیٹھتے بس

کرکٹ کا ہی جنون ہے۔" خالدہ بیگم جنہیں کرکٹ کا کوئی شوق نہیں تھا، بےزار ہو کر بولی تھیں۔
" سارا پاکستان کرکٹ کے بخار میں مبتلا ہے۔ تم پتا نہیں کس دنیا میں رہتی ہو۔"
" اللہ مجھے اِس بخار سے محفوظ ہی رکھے۔"
" بیگم یاد کرو جب تم کو ملیریا ہوا تھا۔"
" مجھے تو زندگی میں ایک دفعہ ملیریا ہوا تھا۔ آپ کو تو روز ہی کرکٹیریا ہو جاتا ہے۔"
" ہاکیریا تو تم کو بھی روز ہو جاتا تھا۔" حنیف صاحب

لیے کوالیفائی بھی نہیں کر سکی۔"
" آپ کی کرکٹ ٹیم نے کون سے معرکے مارے ہیں۔ اُس نے بھی تو 1992ء میں عمران خان کی قیادت میں ورلڈ کپ جیتا تھا۔ وہ ورلڈ کپ رمضان کے مہینے میں ہوا تھا اور پاکستانی عوام کی دعاؤں نے وہ ورلڈ کپ جتوا دیا تھا ورنہ اُس ورلڈ کپ میں پاکستانی ٹیم کی حالت بڑی پتلی تھی۔ وسیم اکرم بھی اُس وقت بڑا پتلا تھا۔"
" پتلا نہیں، اُس وقت وسیم اکرم اسمارٹ تھا۔"
" اسمارٹ تو وہ اب ہوا ہے، اُس وقت وہ پتلا ہی تھا۔"

نے خالدہ بیگم پر طنز کیا کیونکہ خالدہ ہاکی کی شوقین تھیں۔
" ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے۔ ہاکی میں ہم نے چار ورلڈ کپ جیت رکھے ہیں۔"
" یہ بیس سال پرانی بات ہے، جب شہباز سینئر کی قیادت میں پاکستان نے ورلڈ کپ جیتا تھا۔ آج ہماری ہاکی ٹیم کی یہ حالت ہے کہ وہ ورلڈ کپ کے

" اچھا بیگم صاحبہ! آپ کی نظر میں، میں پتلا ہوں یا اسمارٹ؟"
" آپ نہ تو پتلے ہیں اور نہ ہی اسمارٹ۔ آپ اپنی توند پر خود ہی غور کیجیے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔"
" واہ امی جان یہ مارا ہے آپ نے چھکا۔"

سدرہ جو کافی دیر سے ماں باپ کی نوک جھونک سُن رہی تھی۔ بول پڑی۔

"مثال بھی دی تو کرکٹ کی ہی دی۔ میں نے چھکا نہیں میں نے تو پینلٹی اسٹروک پر گول کیا ہے۔" خالدہ بیگم نے کرکٹ سے بے زاری اور ہاکی سے محبت ظاہر کی۔

"مجھے تو شارجہ میں میانداد کا چھکا نہیں بھولتا، جو اُس نے شارجہ میں چیتن شرما کو لگایا تھا۔"

"مجھے تو حسن سردار کی ڈربلنگ نہیں بھولتی جب وہ سپنی کی طرح زگ زیگ بناتا پانچ کھلاڑیوں کے درمیان سے گیند لے کر نکل جاتا تھا اور گول کر کے ہی واپس آتا تھا۔"

☆......☆......☆

آج سنڈے تھا اور سب لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے مگر خالدہ بیگم کرکٹ سے بے زار، دیوار کے سائے میں کرسی پر بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھیں۔ گرمی کچھ زیادہ ہی تھی، مگر سب اپنے کرکٹ کے شوق کے ہاتھوں مجبور تھے۔ سب پسینے سے شرابور تھے۔ شعیب بیٹنگ کر رہا تھا۔ جمشید باؤلنگ، سدرہ اور حنیف صاحب فیلڈنگ کر رہے تھے۔ حنیف صاحب کا موبائل خالدہ بیگم کے پاس تھا۔ اچانک موبائل کی اسکرین روشن ہوئی، تو خالدہ بیگم نے شوہر کو آواز دی مگر تو انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر انہیں خود اُٹھ کر ان کے پاس جانا پڑا۔

"آپ کی کال آ رہی ہے سُن لیجیے۔"

"کس کا فون ہے؟"

"مجھے تو امریکہ کا نمبر لگتا ہے۔"

حنیف صاحب نے موبائل پکڑا اور لان کے کونے میں جا کر فون سُننے لگے۔ آدھے گھنٹے تک فون پر بات کرتے رہے، جب انہوں نے فون بند کیا تو خالدہ بیگم شوہر کے پاس آ گئیں۔

"کس کا فون تھا؟ کس سے اتنی لمبی بات ہو رہی تھی؟" خالدہ نے روایتی بیویوں جیسا رویہ اختیار کیا۔

"تمہارے لہجے میں ہر وقت شک کا زہر ہی کیوں رہتا ہے۔" انہوں نے بیگم کو کھری کھری سنا دیں۔

"کہیں امریکہ میں آپ نے میم شیم تو نہیں رکھی ہوئی، جس سے آدھا آدھا گھنٹہ بات کرتے ہو۔"

"میرا ایک دوست ہے نواز، بیس سال سے امریکہ میں ہے۔ اُس کی ایک بیٹی ہے جنت۔ نواز اپنی بیٹی کی شادی پاکستان میں کرنا چاہتا ہے۔ اِسی سلسلے میں وہ پاکستان آ رہا ہے۔"

"یہ نواز صاحب وہی ہیں جو پانچ سال پہلے بھی پاکستان آئے تھے اور ہمارے گھر چار دن رہ کر گئے تھے۔"

"ہاں وہی ہیں۔ تم نے اُن کی بیٹی دیکھی ہے؟ کیسی تھی وہ؟"

"پانچ سال پہلے کی بات ہے اُس وقت تو وہ بچی تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر تیرہ سال تھی اب تو وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوگی۔"

"کب آ رہے ہیں نواز صاحب پاکستان؟"

"دو دن بعد۔"

☆......☆......☆

"ہمارے گھر میں امریکہ سے مہمان آ رہے ہیں۔" سدرہ نے پانی کا گلاس شعیب کے آگے رکھا جو ابھی ابھی کرکٹ کھیل کر پسینے سے شرابور باہر سے آیا تھا۔

"کیا اوباما صاحب آ رہے ہیں۔" شعیب نے ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس پی کر گلاس میز پر رکھا۔

"پانی تین سانس لے کر پینا چاہیے۔" جمشید نے شعیب کو ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس ختم کرتے دیکھ کر کہا۔

"مولوی صاحب آپ کی بات کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ ڈیئر سسٹر سدرہ تم یہ بتاؤ امریکہ سے آ کون رہا ہے؟"

"ابو کے دوست ہیں نواز انکل، ساتھ اُن کی

بیوی آ رہی ہے فاطمہ......"

"میں نے تو سُنا ہے اُن کی بیٹی جنت بھی اُن کے ساتھ آ رہی ہے۔"

"واہ ڈیئر برادر آپ کو تو ساری خبر ہے۔ میں تو سمجھی تھی کرکٹ کے علاوہ آپ کو کسی چیز کی خبر نہیں۔"

"ڈیئر سسٹر سدرہ! خبر رکھنی پڑتی ہے۔ مولوی صاحب کی طرح نہیں بس نمازیں ہی پڑھ چھوڑیں۔"

"رمضان کا بابرکت مہینہ آ رہا ہے رمضان کے مہینے میں ہی نمازیں پڑھ لینا۔ رمضان کے مہینے میں تو شیطان قید ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے مولوی صاحب اگر آپ نے شیطان کو قید کر لیا تو میں نمازیں پڑھنی شروع کر دوں گا۔"

"جمشید بھائی آپ کو کچھ چاہیے میں جا رہی ہوں کچن میں، اگر کچھ چاہیے تو ابھی بتا دیجیے بعد میں مجھے آواز نہ دینا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے تم جاؤ کچن میں جا کر اپنا کام کرو میری تو نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔" جمشید وضو کے لیے قمیض کے کف فولڈ کرنے لگا۔

"ڈیئر سسٹر سدرہ پیاس تو تم نے میری بجھا دی اب چہاس بھی بجھا دو۔" شعیب نے جاتی سدرہ کو پیچھے سے آواز دی۔

"یہ چہاس کیا ہوتی ہے ڈیئر برادر۔" سدرہ بھی شعیب کے انداز میں حیران ہو کر بولی۔

"پانی کی طلب کو پیاس اور چائے کی طلب کو چہاس کہتے ہیں۔"

"واہ برادر یہ تو تم نے بڑا اچھا لفظ ایجاد کیا ہے چہاس۔"

"ڈیئر سسٹر مجھے تم کیا سمجھتی ہو مجھے صرف کرکٹ ہی کھیلنی آتی ہے۔"

"یہ لفظ چہاس ہمارے بڑے مشہور مزاح نگار ہیں شفیق الرحمٰن اُن کی ایجاد ہے۔" جمشید نے شعیب کی قابلیت کا پول کھول دیا۔

"واہ مولوی صاحب، آپ تو طنز و مزاح بھی پڑھتے ہیں۔ میں نے بھی یہ لفظ شفیق الرحمٰن صاحب کی کسی کتاب میں پڑھا تھا۔" شعیب نے فوراً ہی اعتراف کر لیا۔ "شاید کتاب کا نام حماقتیں تھا۔" شعیب نے ذہن پر زور دیا۔

"اور حماقتیں تم ہر وقت کرتے ہی رہتے ہو۔" جمشید نے پھبتی کسی۔

"مولوی صاحب یہی عمر ہے حماقتیں کرنے کی، شادی کے بعد تو مشقتیں ہی مشقتیں ہیں۔"

"ڈیئر برادر واہ کیا جملہ مارا ہے تم نے۔" سدرہ نے شعیب کو داد دی۔

☆......☆......☆

"پورا ایک مہینہ وہ بھی رمضان کا، تین بندوں کی مہمان داری مجھ سے نہیں ہو گی۔" خالدہ بیگم نے مہمان آنے سے پہلے ہی ہاتھ کھڑے کر دیے۔

"کسی نے سچ ہی کہا ہے عورت کی عقل اُس کی گُت (چُٹیا) کے نیچے ہوتی ہے۔" حنیف صاحب نے بیگم کو ڈگری دے دی۔

"میں گُت نہیں بناتی، میں بال کھلے ہی رکھتی ہوں۔" خالدہ بیگم اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"تم تو ہو ہی بیوقوف۔"

"یہ تو آپ مجھے شادی کے پہلے دن سے کہہ رہے ہو۔"

"شادی کے پہلے دن نہیں شادی کے دوسرے دن کہا تھا یاد کرو۔"

"پچیس سال پرانی بات کہاں یاد رہتی ہے۔ ویسے میں بیوقوف کیسے ہوں؟"

"نواز کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ جنت نواز کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے پاکستان آ رہا ہے اور ہمارے گھر میں بھی دو عدد

کنوارے لڑکے ہیں۔ ہوسکتا ہے نواز کو ہمارے دونوں لڑکوں میں سے کوئی پسند آ جائے۔"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"پھر ثابت ہو گیا نہ تم بیوقوف ہو۔"

"ہاں میں بیوقوف ہوں۔ اسی لیے تو تم سے شادی کی ہے۔" خالدہ بیگم نے اعتراف کر لیا۔

"تو کیا میں بھی بے وقوف ہوں۔" اور پھر دونوں کے قہقہے فضا میں بلند ہو گئے۔

دونوں ہنس ہی رہے تھے کہ سدرہ نے آ کر اطلاع دی کہ امریکہ سے مہمان آ گئے ہیں۔

☆......☆......☆

گیٹ کھلا، گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ حنیف صاحب نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو نواز صاحب باہر آ کر حنیف کے گلے لگ گئے۔ پچھلا دروازہ خالدہ بیگم نے کھولا تو نواز کی بیوی فاطمہ نے باہر قدم رکھا اور خالدہ کے گلے لگ گئی۔ جمشید اور شعیب بڑے مؤدب ہو کر کھڑے تھے۔ جمشید تو خیر پہلے بھی سنجیدہ ہی رہتا تھا۔ مگر اِس وقت شعیب بھی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے بڑا معزز بن کر خاموش کھڑا تھا۔ جنت نے گاڑی سے باہر قدم رکھا تو شعیب کو ایسا لگا جیسے اُن کے گھر بہار آ گئی ہو۔ دودھ کی طرح سفید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، شانوں پر بکھرے کالے سیاہ بال جو اُس کی کمر سے بھی نیچے تک جاتے تھے۔ صراحی دار گردن...... جنت کیا تھی بس جنت کی حور تھی۔ شعیب تو اُس کو دیکھتا ہی رہ گیا جبکہ جمشید نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ سدرہ جنت سے گلے ملی پھر خالدہ نے بھی جنت کو گلے لگایا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

"یہ ہے میری بیٹی جنت اور یہ ہے میری شریکِ حیات فاطمہ۔" نواز صاحب نے اپنی بیٹی اور بیوی کا تعارف خالدہ بیگم سے کروایا۔

"بھائی صاحب آپ تعارف تو ایسے کروا رہے ہیں جیسے میں اِن کو جانتی نہیں ہوں۔ آپ پانچ سال پہلے بھی ہمارے گھر آئے تھے اور چار دن رہ کر گئے تھے۔" خالدہ نے نواز صاحب کو یاد دہانی کروائی۔

"پانچ سال بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ پانچ سال بعد تو آدمی کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ اس لیے دوبارہ تعارف کروانا ضروری تھا۔"

"ہاں جی سچ کہا آپ نے، میاں بیوی پانچ سال اکٹھے رہ لیں تو دونوں بھائی بہن لگنے لگتے ہیں۔" حنیف صاحب نے بھی مزاح پڑھ رکھا تھا۔

"اِسی لیے امریکہ میں زیادہ تر شادیاں دو تین سال بعد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔" نواز صاحب بولے۔

"یہ ہے میرا بیٹا جمشید یہ ہے میرا بیٹا شعیب۔ یہ ہے میری بیٹی سدرہ اور یہ ہے میری شریکِ وفات خالدہ۔" حنیف صاحب نے بھی اپنی فیملی کا تعارف کروایا۔

"شریکِ حیات تو سُنا تھا یہ شریکِ وفات کیا ہوتی ہے؟" نواز صاحب بھی مذاق کے موڈ میں تھے۔

"بیوی شوہر کی وفات میں ضرور شرکت کرتی ہے کیونکہ مرتا تو پہلے شوہر ہی ہے اس لیے بیوی شریکِ وفات ہی ہوتی ہے۔" حنیف صاحب نے وضاحت کی۔

"خالدہ بہن آپ پر اٹیک ہو رہا ہے اور آپ خاموش کھڑی ہیں۔" فاطمہ نے خالدہ کو چھیڑا۔

"یہ مجھ سے پہلے نہیں مرنے والے یہ مجھے مار کر ہی مریں گے۔" خالدہ بیگم بولیں۔

"شوہر تو بے چارہ روز مرتا ہے، روز جیتا ہے۔" حنیف صاحب نے فوراً لقمہ دیا۔

"بڑا ڈھیٹ ہے شوہر جو روز مرتا ہے اور روز جی اُٹھتا ہے۔" خالدہ بیگم نے جواب دیا تو سب قہقہے لگاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔ جنت نے جمشید کو غور سے دیکھا جو نظریں جھکائے چل رہا تھا جبکہ شعیب اُس کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے

لڑکی پہلی دفعہ دیکھی ہو۔

☆......☆......☆

"ڈیئر سسٹر سدرہ یہ جنت بی بی تو لگتا ہی نہیں ہے کہ امریکہ میں پلی بڑھی ہیں۔" شعیب شوخی سے بولا۔

"کیوں کیا ہوا ڈیئر براور؟" سدرہ بھی شعیب کے اسٹائل میں بولی۔

"کل جب میں نے جنت کی طرف دیکھا تو اُس نے شرما کر آنکھیں ہی جھکا لیں۔ یہ جھکی جھکی نگاہیں انہیں میں سلام کرلوں۔ یہیں اپنی صبح کرلوں۔ یہیں اپنی شام کرلوں۔" شعیب کچھ زیادہ ہی چھچھورا ہو رہا تھا۔

"ڈیئر براور تم یہ چھچھوری حرکتیں کرنا چھوڑ دو ورنہ میں امی ابو کو بتا دوں گی۔" سدرہ نے وارننگ دی۔

"ویسے یہ اپنے مولوی صاحب بڑے بدذوق آدمی ہیں۔" شعیب کی شوخی ابھی تک برقرار تھی۔

"میں نے کیا بدذوقی کی ہے جناب مجھے بھی تو کچھ پتا چلے۔" جمشید جو تسبیح پڑھ رہا تھا خاموش نہ رہ سکا۔

"کل جب جنت نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا تو مولوی صاحب نے شرما کر آنکھیں ہی جھکا لیں۔" شعیب اپنی حرکتوں سے بھلا کیسے باز رہنے والا تھا۔

"تم تو ہو ہی بے شرم، جنت کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے لڑکی پہلی بار دیکھی ہو۔" جمشید بولا۔

"لڑکیاں تو پہلے بھی دیکھتا رہا ہوں مگر امریکن لڑکی پہلی بار دیکھی ہے۔" شعیب ابھی تک اپنی ترنگ میں تھا۔

"ڈیئر براور ویسے تم چاہتے کیا ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟" سدرہ نے شعیب سے پوچھا۔

"جنت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" شعیب کی زبان پر فوری دل کی بات آ گئی۔

"مسجد تو تم کبھی گئے نہیں ہو۔ نہ نماز نہ روزہ اور خواب دیکھ رہے ہو جنت کے۔" جمشید نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔

"تو میں کیا مندر جاتا ہوں؟ جاتا تو ہوں جمعہ کے جمعہ مسجد۔" شعیب نے فوراً جواب دیا۔

"ڈیئر براور شاید مندر ہی جاتے ہو تمہارا کیا پتا دپیکا پڈوکون بھی تو تم کو بڑی پسند ہے۔" سدرہ نے شعیب کی دُکھتی رگ چھیڑ دی کیونکہ اُسے پتا تھا دپیکا شعیب کی پسندیدہ ہیروئن ہے۔

"دپیکا میری قسمت میں کہاں وہ تو سلمان خان ،شاہ رخ خان کی بانہوں میں جھولتی ہے۔" شعیب نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"استغفراللہ صدقے جاؤں تمہاری سوچ کے۔ مسلمان ہو کر تم ایک ہندو لڑکی کے خواب دیکھتے ہو۔" جمشید نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"تم تو مجھے مسلمان سمجھتے ہی نہیں ہو جب دپیکا کا ذکر آیا تو تم نے مجھے مسلمان سمجھنا شروع کر دیا۔"

"مسلمان گھرانے میں تم پیدا ہوئے ہو مسلمان تو تم ہو۔" جمشید نے اعتراف کیا۔

"تو کیا پھر میں کترینہ کیف کے بارے میں سوچ سکتا ہوں کیونکہ وہ مسلمان ہے مولوی صاحب۔" شعیب بھی کہاں خاموش رہنے والا تھا۔

"تم میں تو شیطان کی روح آ گئی ہے تم سے بات کرنا فضول ہے۔" جمشید نے جیسے ہار مان لی ہو۔

"اگر میں دپیکا پڈوکون کو مسلمان کر کے اُس کا نام اللہ رکھی رکھ دوں پھر تو میں اُس سے شادی کر سکتا ہوں نا مولوی صاحب۔"

"تم نے دپیکا کو کیا مسلمان کرنا ہے اُلٹا وہ تم کو ہندو بنا کر تمہارا نام اکشے کمار رکھ دے گی۔" جمشید زیادہ تر رہتا تو سنجیدہ تھا مگر کبھی کبھار وہ ایسا جملہ کستا تھا کہ آگے والا بندہ لاجواب ہو جاتا تھا اس بار بھی جمشید نے شعیب کو لاجواب کر دیا تھا۔ ایسے حملے کی

شعیب کو جمشید سے توقع نہ تھی۔ شعیب کی تو بولتی ہی بند ہوگئی تھی۔

"سنا بھئی اکشے کمار تمہارے گدھے کہاں ہیں؟" سدرہ نے بھی لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کردی۔

"ڈیئر سسٹر سدرہ تم بھی مولوی صاحب کے ساتھ مل گئی ہو؟" شعیب کی شکل پر بارہ بج چکے تھے۔

☆......☆......☆

"حنیف تم میرے دوست ہی نہیں میرے بھائی بھی ہو۔ جنت کے رشتے کے لیے مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔" نواز صاحب نے لیمن اسکوائش کا دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ آج گرمی زیادہ تھی۔ سدرہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی لیمن اسکوائش کا پورا جگ اِن کے سامنے رکھ کر گئی تھی۔ جو دونوں نے ختم کردیا تھا جبکہ فاطمہ بیگم سے ابھی پہلا گلاس بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"نواز! تم فکر نہ کرو جنت جیسے تمہاری بیٹی ہے ویسے ہی میری بیٹی ہے۔" حنیف صاحب نے نواز کو تسلی دی۔

"بھائی صاحب اگر چائے کی طلب ہورہی ہو تو میں چائے بنادوں؟" خالدہ بیگم خالی گلاس اور جگ اُٹھا کر جانے لگیں۔

"بھابی آپ کہاں جارہی ہیں بیٹھیے آپ سے میں نے ضروری مشورہ کرنا ہے۔" نواز نے خالدہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بھائی صاحب جنت کے رشتے کی تو آپ فکر ہی نہ کیجیے۔ رشتہ تو میری بغل میں ہے۔" خالدہ بیگم تو اِسی انتظار میں تھیں کہ نواز اُن سے جنت کے رشتے کی بات کریں۔

"اِس کی تو دونوں بغلوں میں رشتے ہیں۔" حنیف صاحب نے بھی دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔

"دونوں بغلوں میں رشتے ہیں میں کچھ سمجھا نہیں؟" نواز صاحب حنیف کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔

"مجھے کچھ کچھ سمجھ آرہی ہے۔" فاطمہ حنیف اور خالدہ کی باتوں کو سمجھ رہی تھیں۔

"مجھے بھی کچھ سمجھاؤ۔" نواز صاحب کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آرہا تھا۔

"وقت آنے پر سمجھادوں گی۔" فاطمہ بیگم نے اپنے شوہر کو تسلی دی۔

"حنیف! میں نے اپنی بیٹی کو امریکہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی روایات، اپنے کلچر سے دور نہیں ہونے دیا۔" نواز صاحب دوست کو تفصیل سے ساری بات سمجھانے لگے۔

میری بیٹی امریکہ میں رہتے ہوئے بھی پانچ وقت کی نمازی ہے۔" فاطمہ خالدہ سے مخاطب ہوئیں۔

"باتوں باتوں میں دونوں میاں بیوی نواز اور فاطمہ کو امپریس کررہے تھے۔

☆......☆......☆

"اب مجھے بھی سمجھاؤ تم کیا سمجھتی ہو؟" نواز صاحب نے بیگم سے پوچھا کیونکہ اِس وقت وہ لان میں اکیلے بیٹھے تھے۔

"آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ عورتوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

"خالدہ کی خواہش ہے کہ ہم اپنی بیٹی کی شادی اُن کے کسی ایک لڑکے سے کردیں۔"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟ نواز صاحب کی سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آرہا تھا وہ بزنس مین بندہ تھے۔ ساری عمر اُن کی بزنس میں ہی گزری تھی۔

"آپ نے خالدہ کی بات نوٹ نہیں کی جب وہ بولی تھی۔ بھائی صاحب جنت کے رشتے کی تو آپ فکر ہی نہ کیجیے۔ رشتہ تو میری بغل میں ہے۔ خالدہ کا اشارہ اپنے لڑکے کی طرف تھا۔" فاطمہ نے کھل کر

ساری بات سمجھائی۔" اور پھر حنیف بھائی بھی بولے تھے کہ اس کی تو دونوں بغلوں میں رشتے ہیں۔ اُن کا اشارہ اپنے دونوں لڑکوں کی طرف تھا۔"

"اگر اُن کا یہ ارادہ ہے تو پھر بات گھما پھرا کر کیوں کرتے ہیں؟"

"وہ ہم سے بات کرنے سے جھجکتے ہیں۔"

"اگر تم کو حنیف کے دونوں لڑکوں میں سے کوئی لڑکا پسند ہے تو تم بات کرلو۔"

"آپ رشتہ لڑکے والے مانگا کرتے ہیں لڑکی والے نہیں۔"

"مجھے کیا پتا اِن باتوں کا۔ میری تو خواہش میری بیٹی کا رشتہ اچھی جگہ ہو جائے اور میری ذمہ داری ختم ہو۔"

"بیٹیوں کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی نواز صاحب بندہ ختم ہو جاتا ہے۔"

☆......☆......☆

شعیب چوکی پر نماز پڑھ رہا تھا کہ سدرہ اور جنت وہاں آ گئیں۔ شعیب سلام پھیر چکا تو سدرہ بولی۔

"ڈیئر برادر یہ انقلاب کیسا؟"

"آج میں جب گراؤنڈ میں نیٹ پریکٹس کر رہا تھا تو وہاں پر سعید انور، محمد یوسف اور انضمام الحق آ گئے۔ انہوں نے مجھے نماز کی اہمیت کے متعلق بتایا۔ میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ آج سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں پانچ وقت نماز پڑھا کروں گا۔"

"شعیب صاحب کل سے رمضان کا مہینہ بھی شروع ہو رہا ہے۔" جنت زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"اِس دفعہ انشاءاللہ میں پورے روزے رکھوں گا۔"

"ڈیئر برادر پورے روزے رکھتے رکھتے کہیں خود پورے نہ ہو جانا۔" سدرہ نے چوٹ کی۔

"ڈیئر سسٹر تم کیا سمجھتی ہو میں پورے روزے نہیں رکھ سکتا؟" شعیب نے اپنے مخصوص اسٹائل میں سدرہ کو مخاطب کیا۔

"ڈیئر برادر رکھو گے تو دیکھیں گے۔ اگر تم نے پورے روزے رکھ لیے پھر تو یہ معجزہ ہی ہوگا۔" سدرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ شعیب رمضان کے مہینے میں بڑی مشکل سے صرف جمعہ کا روزہ رکھتا تھا اور افطاری کے وقت اُس کی حالت مریض جیسی ہو جاتی تھی۔

☆......☆......☆

شعیب اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ سدرہ اُس کو اُٹھا رہی تھی مگر وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتا تھا۔

"ڈیئر برادر اُٹھ جاؤ۔ سحری کا ٹائم ختم ہونے میں بیس منٹ رہ گئے ہیں۔" سدرہ شعیب کو پانچ منٹ سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آج تو پہلا روزہ ہے۔" شعیب نے اونگھتے ہوئے کہا۔

"پہلا روزہ معاف تو نہیں ہوتا۔" جنت بولی جو سدرہ کے ساتھ آئی تھی بلکہ سدرہ جان بوجھ کر جنت کو ساتھ لائی تھی کیونکہ سدرہ کو پتا تھا کہ شعیب نے نہیں اٹھنا۔ جنت کو دیکھ کر شعیب آنکھیں ملتا ہوا فوراً اُٹھ گیا۔

"اچھا تو آپ بھی ساتھ ہیں۔"

"ڈیئر برادر میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ اگر میں جنت کو ساتھ نہ لاتی تو تم نے نہیں اُٹھنا تھا۔ اب جلدی سے آ جاؤ، ورنہ سحری کے بغیر ہی روزہ رکھنا پڑے گا۔"

"ڈیئر سسٹر تم میری کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہو۔"

"کمزوری تو تم کو تب ہوگی جب تم روزہ رکھو گے۔ اب جلدی جلدی آ جاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اتنا کہہ کر سدرہ اور جنت چلی گئیں۔ شعیب کو چاروناچار اٹھنا ہی پڑا اور روزہ رکھنا پڑا۔ شعیب نے آخری نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ مسجد میں فجر کی اذان ہونے لگی۔

☆......☆......☆

"بھائی صاحب آپ کے پاس کوئی ایسی دوا ہے جس کے کھانے سے بھوک نہ لگے؟" شعیب عصر کی نماز پڑھ کر میڈیکل اسٹور پر پہنچ گیا تھا۔ بھوک اور پیاس سے اُس کا بُرا حال تھا کیونکہ پہلا روزہ ہی اِس دفعہ جون کے مہینے میں آ گیا تھا۔

"تم انوکھے آدمی ہو جو بھوک نہ لگانے والی دوا مانگ رہے ہو۔ ہمارے پاس تو زیادہ تر لوگ بھوک لگانے والی دوا لینے آتے ہیں۔" سیلز مین حیران ہو رہا تھا۔

"یار میں نے پہلی دفعہ روزہ رکھا ہے۔ مجھے کوئی ایسی دوا دو جس سے بھوک پیاس نہ لگے۔"

"میرے پاس ایسی کوئی دوا نہیں۔" سیلز مین نے صاف جواب دے دیا۔

"روزہ کھلنے میں کتنا وقت رہتا ہے۔" حالانکہ شعیب کو پتا تھا پھر بھی وہ ٹائم پاس کر رہا تھا۔

"ابھی تو میں ظہر کی نماز پڑھ کر آیا ہوں۔ اِس کے بعد عصر کی نماز ہوگی پھر جب سورج غروب ہوگا پھر روزہ کھلے گا۔"

"مجھے لگتا ہے سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میں غروب ہو جاؤں گا۔"

"تم ایسا کرو تم چڑی روزہ رکھ لیا کرو۔" سیلز مین نے شعیب کو مشورہ دیا بلکہ اُس کا مذاق اُڑایا۔

"چڑی روزہ کیا ہوتا ہے؟" شعیب نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"چڑی روزہ ہر نماز کے بعد افطار کر لیا جاتا ہے۔"

"چڑی روزہ رکھنے سے جنت مل جائے گی؟"

"شداد والی جنت مل جائے گی۔"

گھر آ کر شعیب باتھ روم میں گھس گیا پورا گھنٹہ وہ شاور کے نیچے کھڑا رہا جسم پر ٹھنڈا پانی پڑتے ہی شعیب کی جان میں جان آئی۔ ایک ایک منٹ گزارنا اُس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ نہا کر جب وہ باہر آیا تو عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ عصر کی نماز اُس نے گھر میں ہی پڑھی تاکہ جنت اُس کو نماز پڑھتا دیکھ لے۔ نماز پڑھ کر وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا اور کیو ٹی وی لگا لیا یہ سب وہ جنت کو امپریس کرنے کے لیے کر رہا تھا۔

افطار کا ٹائم ہوا تو سب کے ساتھ ہی اُس نے روزہ افطار کیا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ بڑی مشکل سے اُس نے روزہ پورا کیا تھا۔

☆......☆......☆

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سورج کا مزاج بادلوں کی وجہ سے کچھ دھیما تھا ورنہ تو سورج نکلتے ہی آگ برسانا شروع کر دیتا تھا۔ رمضان کا دوسرا عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ جمشید لان میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ جنت کی نظر جمشید پر پڑی تو وہ اُس کے پاس آ گئی۔ جنت کے پیچھے ہی شعیب بھی وہاں آ گیا۔

"آپ اتنا ریزرو کیوں رہتے ہیں؟" جنت نے جمشید سے پوچھا۔

"یہ بارہواں کھلاڑی ہے، اس لیے ریزرو رہتا ہے۔" جمشید کے بولنے سے پہلے ہی شعیب پھٹ پڑا۔

"میں نے آپ سے نہیں پوچھا پلیز آپ خاموش رہیں۔" جنت نے تقریباً شعیب کو ڈانٹ دیا۔

"میں عادت سے مجبور ہوں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" شعیب نے پھر شوخی کی۔

"پلیز لیو می الون۔" جبکہ جنت سنجیدہ تھی۔ شعیب جو بڑا ڈھیٹ تھا اُس نے اپنی بے عزتی محسوس کر ہی لی اور وہاں سے چلا گیا۔

"آپ میں اور آپ کے بھائی میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔" جنت شعیب کے جانے کے بعد بولی۔

"یہ بچپن سے ہی ایسا ہے۔" جمشید نے مختصراً جواب دیا۔

"فارغ وقت میں آپ کے مشاغل کیا ہیں؟"

"اچھی کتب کا مطالعہ، آپ نے مائیکل ہارٹ

کی کتاب "سو عظیم آدمی" پڑھی ہے؟"

"اِس میں کیا خاص بات ہے؟"

"مائیکل ہارٹ نے اِس کتاب میں دُنیا کے سو عظیم آدمیوں کا تذکرہ کیا ہے اور اِس کتاب میں مائیکل ہارٹ نے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو سر فہرست رکھا ہے۔"

"پھر تو میں یہ کتاب ضرور پڑھوں گی۔ آپ کے پاس یہ کتاب ہے؟"

"بالکل ہے آیئے میں آپ کو ابھی دیتا ہوں۔"

☆......☆......☆

"اشاروں اشاروں میں بڑی باتیں ہو گئیں۔ اب آپ نواز بھائی سے دو ٹوک بات کریں۔" خالدہ بیگم سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولیں۔

"نواز اِسے میری خود غرضی نہ سمجھے۔" حنیف ابھی بھی جھجک رہے تھے۔

"آپ نے نہیں بات کرنی تو میں فاطمہ بہن سے بات کروں؟ اب تو وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم فاطمہ بہن سے بات کرلو۔" حنیف نے اُن کو اجازت دے دی۔

"جمشید کے لیے بات کروں یا شعیب کے لیے؟" خالدہ بیگم شوہر سے مشورہ مانگنے لگیں۔

"یہ بات تم فاطمہ اور بھائی نواز پر چھوڑ دو، وہ ہمارے دونوں لڑکوں میں سے جس کو مرضی پسند کرلیں۔" حنیف صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"یہ ٹھیک ہے میری بھی یہی مرضی تھی کہ بال اُن کے کورٹ میں پھینک دوں۔" دونوں کی مرضی مل گئی تھی۔

☆......☆......☆

"دُنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں، اک دلربا ہے جو حوروں سے کم نہیں۔" شعیب لہک لہک کر گا رہا تھا۔ جب اُس نے جنت کو دیکھا تو فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور مظفر وارثی کی حمد

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ وہی خدا ہے۔" پڑھنی شروع کر دی۔ جنت اُس کی ساری سیاست سمجھ چکی تھی۔ مسکراتی ہوئی اُس کے قریب سے گزر گئی جبکہ سدرہ وہاں کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"ڈیئر برادر تم بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو۔"

"میرا رنگ شروع سے ہی گورا ہے، کبھی کوئی کریم نہیں لگائی۔"

"ڈیئر برادر کریم کی نہیں آئس کریم کی ضرورت ہے۔ مجھے آئس کریم کھلا دو میں تمہارا پیغام جنت تک پہنچا دوں گی۔"

"آئس کریم کیا میں تم کو فیئر اینڈ لولی کریم بھی لا دوں گا۔ تم میرا یہ کام کر دو۔"

"ڈیئر برادر یہ بات ہے تو سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔"

☆......☆......☆

خالدہ بیگم نے نماز پڑھ لی تھی جبکہ فاطمہ ابھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ خالدہ فاطمہ کے سلام پھیرنے کے انتظار میں تھیں اور اپنے آپ کو فاطمہ سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی فاطمہ نماز سے فارغ ہوئیں۔ اُن کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھیں تو خالدہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔

"فاطمہ بہن آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

"ہاں کریں کیا بات ہے؟" فاطمہ کو بھی اندازہ تھا کہ خالدہ نے کیا بات کرنی ہے مگر وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی تھیں۔

"آپ لوگ پاکستان جنت کے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ میرے بھی دونوں بیٹے جوان ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ اگر دونوں میں سے کسی کو بھی آپ اپنی فرزندی میں قبول کریں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔" خالدہ بیگم نے آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" فاطمہ خالدہ کی کیفیت کا مزہ لے رہی تھیں۔

"کیا مطلب بہن، کہیں تم نے جنت کا رشتہ کہیں طے تو

نہیں کردیا۔'' خالدہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''نہیں بہن، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نواز سے مشورہ کروں گی پھر آپ کو بتادوں گی۔'' فاطمہ کی بات سُن کر خالدہ بیگم کی جان میں جان آئی۔

☆......☆......☆

''اچھا تو بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔''

''ہاں جی اب آپ فیصلہ کرلیجیے، آپ نے شعیب کو اپنا داماد بنانا ہے یا جمشید کو۔''

''بھئی شادی جنت نے کرنی ہے، وہ جس کو بھی پسند کرے گی مجھے منظور ہوگا۔ اب تم جنت سے اُس کی رائے پوچھ لو۔''

فاطمہ نے جنت سے پوچھا تو جنت شرما گئی اور اُس نے اپنی ماں کے کان میں وہ نام بتادیا جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ خالدہ اور حنیف صاحب بھی کمرے میں آگئے خالدہ بڑی بے چین تھی۔

''فاطمہ بہن پھر آپ دونوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' خالدہ بیگم کمرے میں آتے ہی خاموش نہ رہ سکیں۔

''ہم نے فیصلہ جنت پر چھوڑ دیا ہے۔'' ''ہمیں صرف اور صرف جنت کی خوشیاں عزیز ہیں۔'' نواز صاحب بولے تھے۔

''جنت بیٹی تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔'' حنیف صاحب کی بے صبری بھی دیکھنے والی تھی۔

''انکل میں نے اپنا فیصلہ امی جان کو بتادیا ہے۔'' جنت شرماتے ہوئے بولی۔

''جنت کا فیصلہ میں نے محفوظ کرلیا ہے۔ آج چاند رات ہے۔ صبح عید کا مبارک دن ہے۔ جنت کے فیصلے کا اعلان کل میں عید کے مبارک دن پر کروں گی۔'' فاطمہ ابھی بھی سسپنس ختم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں جبکہ خالدہ اور حنیف کی حالت دیکھنے والی تھی۔

☆......☆......☆

عید کا دن تھا۔ گھر کے سب مرد عید کی نماز پڑھ کر گھر واپس آگئے تھے اور شیر خورمہ کھا رہے تھے۔ شیر خورمہ جنت نے بنایا تھا۔ سب اُس کی تعریف کرر ہے تھے۔ گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس جنت تو جنت کی حور لگ رہی تھی۔ شعیب اُس کے حسن میں کھو گیا تھا۔ سدرہ کی نظریں شعیب پر تھیں جو جنت کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا۔ سدرہ نے شعیب کو کہنی ماری اور شوخی سے بولی۔

''ڈیئر برادر شیر خورمہ کھاؤ۔ یہ جنت نے بنایا ہے۔ جنت نے اب یہیں رہنا ہے۔ اس کو پھر دیکھ لینا'' شعیب شرمندہ ہوگیا اور شیر خورمہ کھانے لگا جب سب شیر خورمہ کھا چکے تو خالدہ سے رہا نہ گیا۔

''فاطمہ بہن اب جنت کے فیصلے کا اعلان کردیں۔'' خالدہ کی بے چینی صاف ظاہر ہورہی تھی۔

''جنت کے فیصلے کا اعلان نواز کریں گے۔'' فاطمہ نے بات نواز کی طرف موڑ دی۔

''آج عید کے اِس پُرمسرت موقع پر میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میری بیٹی جنت نے......''

''ڈیئر برادر تمہارے دل کی دھڑکن کیوں تیز ہورہی ہے۔'' سدرہ شعیب کے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''سدرہ تم خاموش نہیں رہ سکتی ہو۔'' خالدہ نے سدرہ کو ڈانٹ دیا۔ سدرہ خاموش ہوگئی تو نواز صاحب پھر بولے۔

''میری بیٹی جنت نے جمشید سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

سب خوش تھے جبکہ شعیب کے ہاتھوں کے طوطے کیا کبوتر بھی اُڑ گئے تھے اور کوے کائیں کائیں کرر ہے تھے۔

''جمشید بیٹا میرے پاس آؤ۔'' جمشید جب نواز کے پاس گیا تو نواز صاحب نے جنت کا ہاتھ جمشید کے ہاتھ میں دیا اور بولے۔

''جمشید بیٹا یہ میری طرف سے تمہاری عیدی ہے۔''

''عیدی ہو تو ایسی۔'' سدرہ نے نعرہ لگایا اور

جنت کو گلے سے لگالیا۔
"نکاح بھی آج ہی ہوگا۔آج عید کا دن ہے اور ہم عید کی خوشیاں دوبالا کرنا چاہتے ہیں۔" نواز صاحب نے اعلان کیا۔
"پھر مولوی صاحب کو بلوایا گیا جمشید اور جنت کا نکاح ہوگیا۔گھر کے سب افراد خوش تھے۔سوائے شعیب کے۔
"میں نے تو جنت حاصل کرنے کے لیے بڑی نمازیں پڑھی تھیں۔" شعیب نے خود کلامی کی۔
"ڈیئر برادر دکھاوے کی نمازوں سے جنت نہیں ملتی۔" سدرہ شعیب کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔اب وہ بھلا کیسے خاموش رہتی۔

☆......☆......☆

"ڈیئر برادر اُٹھ جاؤ عید کی نماز پڑھنے نہیں جانا،سورج سر پر چڑھ آیا ہے۔" سدرہ شعیب کو اُٹھا رہی تھی مگر وہ تو لگتا تھا گھوڑے بیچ کر سویا ہے۔
"ڈیئر سسٹر سدرہ مجھے معاف کردو۔میں اب دکھاوے کی نمازیں نہیں پڑھوں گا۔" شعیب ہڑبڑا کر اُٹھا۔
"ڈیئر برادر اُٹھ جاؤ آج عید کا دن ہے اور جنت نے اپنے فیصلے کا اعلان کرنا ہے۔"
"جنت کی شادی تو جمشید سے ہوچکی ہے۔اب اُس نے کس فیصلے کا اعلان کرنا ہے؟" شعیب ابھی بھی غنودگی میں تھا۔
"ڈیئر برادر کہیں تم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو؟" سدرہ حیران ہورہی تھی۔
"ہیں یہ خواب تھا یا اللہ میری توبہ! یا اللہ مجھے معاف کردے، آئندہ میں صرف تیری رضا کے لیے تیری عبادت کروں گا۔" شعیب آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اب وہ مکمل اپنے ہوش وحواس میں تھا۔ اُس نے واقعی خواب دیکھا تھا۔
"شعیب بیٹا تمہاری دُعا قبول ہوگئی ہے۔میری بیٹی جنت نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" نواز صاحب جنت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔
اِن کے پیچھے پیچھے حنیف صاحب خالدہ اور فاطمہ بھی شعیب کے کمرے میں آگئیں۔جنت کا فیصلہ سُن کر شعیب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ جنت کے خیالات تو جمشید کے ساتھ ملتے تھے۔
"مجھے یقین نہیں آرہا جنت اتنی سمجھی ہوئی اور میں ایک کھلنڈرا سا نوجوان۔آپ سب مجھ سے مذاق کررہے ہیں؟" شعیب کو واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ جنت اُس سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہوگئی ہے۔
"میری وجہ سے اگر ایک بھٹکا ہوا نوجوان راہِ راست پر آرہا ہے تو میں یہ ثواب کیوں نہ کماؤں؟" جنت نے شعیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو شعیب نے پلکیں جھکالیں۔
"مگر آپ کے خیالات تو جمشید سے ملتے تھے۔آپ کا زیادہ رجحان بھی جمشید کی طرف تھا؟" شعیب نے پوچھا۔
"ہاں یہ سب باتیں سچ ہیں اور میں جمشید سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی مگر جمشید نے ہی مجھے تم سے شادی کرنے پر آمادہ کیا ہے۔جمشید نے کہا میں ہی تم کو راہِ راست پر لاسکتی ہوں۔جمشید کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہے۔جس بندے کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو اُس کی باتیں دل پر زیادہ اثر کرتی ہیں۔جمشید کی باتوں نے میرے دل پر اثر کیا اور میں تم سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئی۔"
"آج تو مجھے جمشید مولوی نہیں جنید جمشید لگا ہے۔" شعیب کی خوشی دیدنی تھی۔
"ڈیئر برادر نکاح کے لیے مولوی بلائیں؟" سدرہ کہاں خاموش رہنے والی تھی۔
"مولوی بلانے کی کیا ضرورت ہے، مولوی تو اپنے گھر میں ہی ہے۔" شعیب پھر اپنی شوخیوں پر اُتر آیا اور پھر عید کی خوشیاں چاروں طرف رقص کرنے لگی تھیں۔

☆☆......☆☆

"اف یہ خواتین بھی نا۔ اپنے پاس کتنی باتیں جمع کر کے رکھتی ہیں۔ جیسے ہی ملاقات ہوتی ہے، جلدی جلدی شیئر کرنے لگتی ہیں؟" سعدی نے نباح کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ دونوں دروازے پر کھڑے ہو کر بھی باتیں بنانے سے......

رشتوں سے مربوط، عید نمبر کا ایک خاص ناول

"نباح۔ او صبا...... کوئی گھر میں ہے بھی یا نہیں ؟ بہو! ارے بہو۔ کوئی اس بڑھیا کی بھی فریاد سن لے" عزیز النساء کی بھاری آواز کمرے سے نکل کر چار سو پھیل گئی۔ دونوں بہنیں جو کچن میں مصروف تھیں، چونکیں۔

"دادو اتنے غصے میں کیوں ہیں؟" صبا جلدی گھبرانے والی لڑکی تھی۔ کام چھوڑ کر بڑی بہن کو حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ نباح نے کاندھے اچکا کر لاعلمی کا اشارہ دیا۔ عزیز النساء کی زبانی گولہ باری میں لمحہ بھر کو توقف آیا۔

"ایسا کرو جلدی سے پانی میں گلوکوز گھول لو" نباح نے برتن کیبنٹ میں سجاتے ہوئے کہا۔ تو بڑی بہن کی ایما جان کر اس نے سر ہلایا۔

"دادو! آتی ہوں" نباح نے ہمت کر کے وہیں سے جواب دیا تاکہ ان کا غصہ کم ہو سکے۔

"ہاں، ہاں! اپنے سارے کام نمٹا لو پھر یہاں آنا۔ میرا تو چیخ چیخ کر گلا خشک ہو گیا، پر کوئی شنوائی ہی نہیں"۔ وہ عزیز النساء تھیں۔ انہیں بھلا کہاں دو گھڑی بھی صبر، دوبارہ بھڑک اٹھیں۔

"معاملہ گڑبڑ ہے" نباح نے چھوٹی بہن کو جلدی کرنے کا کہا۔ گندے برتن سمیٹ کر واپس ٹوکری میں رکھے، جلدی سے ہاتھ دھونے لگی، جن پر صابن لگا ہوا تھا۔ دونوں کچن سے باہر نکل کر دادو کے کمرے کی طرف دوڑیں۔

"بس یہ ہی پوچھ رہی ہوں کہ میری سفید شال پر کتھے کا داغ کیسے لگا؟ کون نگوڑ مارا میری چیزوں کا دشمن بنا ہوا ہے۔ گھڑی بھر کو پڑوس میں کیا گئی، سارے کمرے کا ناس مار کے رکھ دیا" عزیز النساء کو شال کی ایسی درگت بننے کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی چیزوں کے معاملے میں بہت حساس تھیں۔ ان کے کمرے میں رکھی ہر شے سے ان کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی۔ یہ شال بھی ان کے مرحوم شوہر کا تحفہ تھا۔ داغ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جو شروع ہوئیں۔ تو رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔

صحن میں سر ہلا ہلا کر پڑھنے والے اشعر کے کان کھڑے ہوئے۔ شرارت بھی تو اس کی تھی۔ نباح نے فوراً صحن میں کھلنے والی کھڑکی میں سے اشعر کو گھورا صبا کو بچے کی اداس صورت پر ایک دم ترس آ گیا۔

عزیز النساء کا غصے میں ٹہلنا جاری تھا۔ نباح اور صبا نے خوشامد کر کے زبردستی انہیں گلوکوز پینے پر مجبور کیا۔ وہ غٹاغٹ پورا گلاس پی گئیں۔ تازہ دم ہو کر دوبارہ دونوں کو گھورنے لگیں۔

''دادو۔ وہ غلطی سے اشعر آپ کے کمرے میں آ کر پاندان میں سے سونف کھا رہا تھا، میں اس پر چیخی تو گھبراہٹ میں بھاگا شاید اس سے کتھا شال پر گر گیا ہوگا'' نباح سر جھکائے ایسے بول رہی تھی جیسے اس نے خود اپنی مخروطی انگلیوں سے شال پر داغ لگایا ہو، مجبوری تھی۔ جب تک عزیز النساء کے سامنے مجرم کی نشاندہی نہ کی جاتی، ان کا پارہ نیچے نہیں آنے کا نام نہیں لیتا۔

''لو بھلا بتاؤ۔ پہلے ہی تم لوگ میرے سر پر ناچنے کے لیے کیا کم تھے؟، اب محلے کے بچے بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے لگے۔'' اشعر کا نام سن کر وہ ایک دم چیخ اٹھیں۔

''دادو! میں سمجھا دوں گی۔ ابھی بچہ ہے'' نباح نے جلدی جلدی صفائی پیش کی۔ صبا کو اپنی آپی پر ترس آیا، سمجھ گئی کہ اب سورج ادھر ہی آگ برسائے گا۔

''دیکھو بی بی یہ جو تمہیں ٹیوشن پڑھانے کا بخار چڑھا ہے نا، اسے اپنے کمرے یا صحن تک ہی محدود رکھو۔ اگر اس بدتمیز بچے نے نے میرے کمرے کا رخ بھی کیا تو، امید علی سے کہہ کر سارے شوق ختم کروا دوں گی'' عزیز النساء نے ہمیشہ کی طرح بڑے مان سے بیٹے کا ڈراوا دیا، صباہ کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ امید علی ہمارے بھی کچھ لگتے ہیں پر بہن کی وجہ سے چپکی رہی۔

''کتنا بے حیا بچہ ہے۔ جب موقع ملتا ہے میرے کمرے میں گھس جاتا ہے۔ تم لوگ بھی خیال نہیں کرتیں۔ آئندہ کہیں جاؤں گی تو دروازے پر قفل ڈال دوں گی۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح دھمکی دی۔ صبا اور نباح ایک ساتھ مسکرائیں، جانتی تھیں۔ یہ بس خالی خولی دھمکیاں ہی ہیں۔ عزیز النساء کی بڑبڑ جاری رہی۔ ان کا بس چلتا تو وہ اشعر کو ایک زوردار دھپ بھی لگا آتیں۔ ان کی نظر میں وہ عجیب بچہ تھا، مجال ہے جو دو منٹ آرام سے ٹک کر ایک جگہ بیٹھ جائے۔ پر کیا کرتیں، اس کی ماں ثمرین کی زبان سے بہت ڈرتی تھیں، جس کی زمانے میں مثالیں قائم تھیں۔ وہ بدلحاضی کی حد تک صاف گو واقع ہوئی تھی، آگے پیچھے دیکھے بغیر صاف منہ پر ٹکا کر جواب دیتی۔

پورا محلہ عزیز النساء کا بہت لحاظ کرتا پر اس نے تو ان کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ ایک دفعہ عزیز النساء سے محلہ کی ایک تقریب میں وہ منہ ماری ہوئی کہ بس۔ ہمیشہ کی طرح عزیز النساء چار ساسوں کے بیچ بیٹھیں 'آج کل کی بہوئیں' پر ایک لمبا لیکچر دے رہی تھیں۔

محلے کی ساری بہوئیں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے کے باوجود ان کی گوہر افشانیاں مروت میں سن رہی تھیں۔ ثمرین کو کہاں برداشت اس نے ان کے منہ پر 'آج کل کی ساسوں' پر ایسی طویل تقریر کر ڈالی۔ کہ وہ ہائے ہائے کرتی رہ گئیں۔ ان کے تو آگ لگ گئی پر بول کر مزید اس کے ہاتھوں کیا تماشا کیا بنتیں۔ اس وقت تو خاموش ہو گئیں مگر دل میں بیر باندھ لیا۔

اسی دن کے بعد سے انہیں جیسے ثمرین سے نفرت سی ہو چلی۔ انہوں نے تو اشعر کو اس گھر میں

پڑھانے کی بہت مخالفت کی پر بیٹے نے پیار سے ماں کو منا ہی لیا۔ اپنی بیٹی کا اترا ہوا منہ جو برداشت نہیں ہوا۔

اشعر کی پٹائی کے بعد ثمرین کے ہاتھوں اپنا تماشا لگوانے کا سوچ کر ہی انہیں جھرجھری سی آئی ۔سر جھٹک کر بات کو پینے کی کوشش کی، کوئی اور چارہ جو نہ تھا۔ نباح نے دادی کے جھریوں بھرے سرخ و سفید چہرے کے تاثرات بغور دیکھے۔

'طوفان ٹل گیا ہے۔' دل نے سگنل دیا تو کچھ کہے بغیر بیڈ پر سے دادی کی شال دھونے کے لیے اٹھائی۔ اور باہر نکلنے لگی، صبا نے بھی تیزی سے بہن کی تقلید کی۔

نباح نے صحن میں داخل ہوتے ہوئے ہی کڑی نگاہوں سے اشعر کو گھورا۔ وہ گھبرا اٹھا، عزیز النساء کا سارا فضیحتہ اس کے کانوں میں بھی پڑا تھا۔ وہ شرمندہ سا چپکا بیٹھا رہ گیا۔

''اے چھوٹو! اگر آئندہ دادو کے کمرے کے آس پاس بھی نظر آئے تو، آپی سے دوستی کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی ختم۔ آئی سمجھ۔'' نباح نے لحہ بھر رک کر اشعر کو گھورا اور لہجے میں زبردستی کی سختی رچائی۔

''اوکے۔ آپی! اشعر کبھی ایسا نہیں کرے گا'' وہ سر جھکا کر شرمندگی سے بولا کوئی اس کی پیاری آپی کو یوں ڈانٹے۔ اسے بالکل برداشت نہ تھا۔

''اشعی تم کیا جانو کہ ایسی چھوٹی سی شرارت اس گھر کو کیسے بڑے طوفان سے دوچار کر سکتی ہے ''۔اس نے آخری بات دھیرے سے بول کر ٹھنڈی سانس بھری۔ اشعر نے نباح کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا۔ غڑاپ سے اردو کے قاعدہ میں منہ چھپا لیا۔

نباح نے آسمان کی جانب دیکھ کر شکر ادا کیا کہ ماں آپ تو بڑے بھائی فہد کے ساتھ مہینے کا سامان لینے گئی ہوئیں ہیں۔ ورنہ تو یوں کا رخ ان کی طرف مڑتے دیر نہ لگتی، وہ سوچ میں گم ہو گئی۔

''آپی کتنی پیاری لگتی ہیں'' اشعر نے ایک دم چھا جانے والی خاموشی پر کتاب منہ سے ہٹا کر نباح کو دیکھا۔ نیم کے درخت سے چھن چھن کر آتی سورج کی شعاعوں نے اس کے ملیح چہرے کو گرفت میں لے لیا تھا۔ سر سے پاؤں تک چمک اٹھی۔ ایسا لگا جیسے وہ سونے میں ڈھل گئی ہو۔ وہ ایک دم مسکرایا۔ نباح اس کی ڈھٹائی پر جل گئی۔

''اوکے۔ اب کبھی بھی بات نہیں کروں گی، پڑھاؤں گی بھی نہیں۔ آپ کی ماما سے کہہ دوں گی وہ جو کالے گیٹ والے گھر میں بابا جی پڑھاتے ہیں نا۔ اشعر کو بھی وہاں بٹھا دیں''۔ نباح نے پیر پٹخ کر منہ پھلا کر کہا، جانتی تھی رضوان انکل بہت سخت ہیں ،ٹیوشن پڑھنے آنے والے بچوں کی جم کر پٹائی کرتے ہیں، سارے بچے ان کے یہاں پڑھنے کے نام سے بھی بھاگتے ہیں۔ اشعر تو ماں سے ضد کر کے اس کے پاس پڑھنے بیٹھا تھا۔ نباح نے ثمرین کی درخواست پر اسے پڑھانے کی حامی بھر لی ورنہ اس کے پاس وقت کی کمیابی ہی رہتی تھی۔ نباح اس بات سے بھی لا علم تھی کہ اشعر کو یہاں ٹیوشن پڑھانے کے پس پشت ایک اور کی طاقت بھی کارفرما تھی۔ کسی کے پیار کی طاقت......

''سوری آپی! اشعر کو معاف کر دیں۔ مما سے کچھ نہیں بولیے گا۔ اشعر آئندہ ایسا کبھی نہیں کرے گا'' دھمکی کارگر ثابت ہوئی، بچے کی جان ہی نکل گئی ۔اس نے ہونٹ لٹکا کر کان پکڑ کر یقین دہانی کرائی تو نباح مسکرائی۔ اشعر کی جان میں جان آئی۔ وہ کونے پر نصب واش بیسن پر جا کر شال رگڑنے لگی تاکہ داغ صاف ہو جائے۔

'دادی جی......آپ نے میری اتنی پیاری آپی کو

ڈانٹا۔اشعر کو بالکل اچھا نہیں لگا۔آج تو اشعی کو اپنے چاچ سے مشورہ کرنا ہی پڑے گا' اس نے دانت کچکچا کر دادی کے کمرے کی طرف دیکھا اور پینسل کا کونا کترتے ہوئے سوچا۔

''کیا زبردست امتزاج بنا ہے'' نباح کھکھلائی سفید جھاگ میں گھلتا کتھئی رنگ اس کی آنکھوں کو بھایا۔وہ۔ایسی ہی تھی۔کسی بھی بات میں سے خوشی کا پہلو نکالنے والی، منفی باتوں کو بہت دیر تک سر پر سوار نہ کرتی۔دل صاف کر کے لوگوں میں گھل مل جانے والی۔اس کی زندگی میں بہت سکون تھا۔جبکہ اس کی چھوٹی بہن صبا بہت لیے دیے سے رہنے والی لڑکی تھی۔اس کی الگ دنیا تھی۔بڑا بھائی فہد اس کا آئیڈیل تھا تو۔آپی اس کی دنیا۔باقی لوگوں سے اسے کوئی خاص سروکار نہ تھا۔صبا فضول باتوں سے جلد اوب جاتی۔اس کی سرمد سے بھی اسی لیے کم بنتی تھی۔وہ اس سے صرف ایک سال ہی بڑا تھا۔کام کا دل کرتا تو پورا دن لگی رہتی، ورنہ صحن میں بچھے تخت پر سستی سے کتابیں کھولے پڑھنے کی ایکٹنگ کرتی۔ پاؤں ہلاتی پھرکی کی طرح پورے گھر میں ناچتی نباح کو تکا کرتی جو اسے دنیا میں سب سے دلکش دکھائی دیتی۔بے داغ نرم وملائم گول سے چہرے پر چھائی معصومیت، شربتی آنکھوں سے چھلکتی نرمی، اسے دوسروں سے ممتاز بناتی۔نہ وہ چاند چہرہ اور نہ ہی ستارہ آنکھوں کی مالک تھی، نہ ہی اس کا اثاثہ ماورائی حسن تھا۔اس کے باوجود چھوٹے بڑے ہر ایک اس کی سنگت میں سکون پاتے۔۔اس مصائب وآلام کے دور میں لوگوں کے ساتھ ساتھ خود کو مطمئن کرنا ،ایک بڑا مشکل امر ہے۔فی زمانہ یہ بات۔ایک فن کا درجہ رکھتی ہے۔یوں نباح ایک ایسی فنکارہ تھی جو خوش رہنے کے ساتھ، دوسروں کی خوشی کا ذریعہ بھی بنی ہوئی تھی۔سب کے لیے اس کی بے لوث محبت

چہرے کے گرد کشش کا ہالہ سا بنائے رکھتی۔اسی لیے اپنے پرائے اس کی طرف کھنچتے چلے آتے

ایسا ہی کچھ سعدی کے ساتھ ہوا۔اس پر پہلی نظر پڑتے ہی دل دے بیٹھا۔

''تمہیں۔اپنا بنانا ہے......ورنہ۔زندگی میں ایک کمی سی رہ جائے گی''۔سعدی نے اسے دیکھتے ہی سوچا جب وہ پچھلے مہینے ثمرین بھابی سے اپنی قمیض کے دامن پر فیبرک پینٹنگ کروانے گئی تو، واپسی میں اپنے پلو سے سعدی کا دل بھی باندھ لائی۔

☆......☆......☆

سعدی نے اپنی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا تو مسحور رہ گیا۔آسمان سے چاندنی۔لہروں کی طرح بل کھاتی لہراتی اتر کر اسے اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔رات کا فسوں چار سو پھیلا تھا۔چاند اچانک ایک مسکراتے چہرے میں ڈھل گیا، دل پر کسی کی مشکبار یادوں کا قبضہ ہو چلا۔

''اف۔تُو۔تُو گیا کام سے۔سعدی بیٹا۔اب اس کو بھلانا مشکل ہے۔کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا''وہ اپنے نرم سے بستر پر دھم سے گرا اور دل پر ہاتھ رکھ کر نباح کے بارے میں سوچنے لگا۔نرم سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر کسی کو سوچنے کی لذت ناقابل بیان سی ہوتی ہے۔وہ اپنی کیفیت سے بھرپور طریقے سے لطف اٹھا رہا تھا۔ذہن میں ایک فلم سی چل اٹھی۔سارے سین متواتر سے آگے پیچھے چل پڑے۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا بور ہو رہا تھا ابھی دوستوں کی طرف نکلنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔وہ ایک مہذب اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ایسی تاکا جھانکی کو نہایت معیوب حرکت سمجھتا تھا

پر۔ کبھی کبھی دل کی سننے کے چکر میں انسان ایسی باتوں کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اس نے پہلے سوچا بھی نہ ہو۔ سریلی آواز والی کو دیکھنے کی بے چینی میں۔ کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے چھپ کر بھابی کے کمرے میں جھانکا، جہاں خالص زنانہ محفل جمی تھی۔

ڈھلے دھلائے سادہ سے چہرے پر پھیلی شگفتہ سی مسکراہٹ والی وہ لڑکی۔ سعدی کو لگا برسوں سے جو خیال دل میں بسا ہوا تھا۔ وہ جیسے مجسم نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔

نباح سعدی کی اس حرکت اور دلی کیفیت سے نا آشنا مسکرا مسکرا کر ثمرین سے باتیں بگھارنے میں مصروف تھی۔ ساتھ ساتھ چمکتی آنکھوں سے رنگوں کو اپنی قمیص پر سجتے دیکھنے کا لطف اٹھائے جا رہی تھی۔ وہ رنگوں، پھولوں اور خوشبوؤں سے محبت کرنے والی ابھی پیار کے نام سے بھی نا آشنا تھی۔

سعدی کے لیے سب سے حیرت انگیز بات ہٹلر ٹائپ بھابی کا نباح کے ساتھ ایسا خوشگوار رویہ..... کمال ہی ہو گیا تھا۔ ورنہ بھابی تو محلے کی زیادہ تر لڑکیوں کے نخروں سے الرجک۔ ہمیشہ ان سے ایک فاصلے پر رہتی۔ حالانکہ ان کے ہاتھ میں ایک اسمارٹ، پڑھے لکھے، اچھے عہدے پر فائز کنوارے دیور کی بھابی ہونے کی وجہ سے فائدہ اٹھانے کا گولڈن چانس تھا پر وہ۔ کسی کو اتنا منہ ہی نہیں لگاتیں کہ زیادہ آنا جانا ہو۔ وہ ہنستا ہوا کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔

''میڈم آپ میں۔ کچھ تو خاص بات ہے'' سعدی نے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھ بند کر کے اسے دوبارہ سوچا۔ کافی غیر مناسب حرکت کی تھی پر نتیجہ یہ ہوا کہ اسے شادی کے لیے مناسب لڑکی مل گئی۔

''بھائی کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ بھابی کے ساتھ کسی دوسری کا گزارہ مشکل ہے بڑا مشکل ہے۔ پر یہ لڑکی دیورانی بن کر ضرور ان کا دل جیت لے گی'' سعدی کے دل نے گواہی دی۔ وہ گنگناتا ہوا کپڑے چینج کرنے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ خوشبو کا اسپرے کرنے کے بعد وہ مزید تازہ دم ہو گیا گاڑی کی چابی لہراتا ہوا باہر نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ اپنے کمرے کے دروازے پر رکنا پڑا۔ گیلری میں نباح بھابی کے ساتھ کھڑی نظر آئی، اس کی قمیص مکمل ہو چکی تھی۔ اب وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

''اف یہ خواتین بھی نا۔ اپنے پاس کتنی باتیں جمع کر کے رکھتی ہیں۔ جیسے ہی ملاقات ہوتی ہے، جلدی جلدی شیئر کرنے لگتی ہیں؟'' سعدی نے نباح کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ دونوں دروازے پر کھڑے ہو کر بھی باتیں بنانے سے باز نہ آئیں۔ ثمرین نے اسے ایک منٹ وہاں رکنے کو کہا، خود آم کا اچار لینے اندر بڑھ گئی، جو اس نے گھر میں ڈالا تھا۔ نباح ادھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک ایک بے چینی سی محسوس ہوئی۔ ارد گرد خوشبو کا منفرد احساس جاگا، اس نے زرا کی زرا نگاہ اٹھائی، سامنے ہی بلیک جینز پر لائٹ بلو ٹی شرٹ میں دراز قد سعدی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''یہ...... دیکھتے کیسے ہیں؟۔ بندے کی جان ہی نکل جائے'' وہ ہراساں نظر آئی۔ سعدی دلکشی سے مسکرایا۔ پہلی بار اپنی شخصیت کا جادو مزہ دے گیا۔ کچھ تو تھا اس کی بادامی آنکھوں میں ...... نباح کے دل میں جیسے قطار در قطار دیپ جل اٹھے، پلکیں لرزنے لگیں۔ انوکھے جذبوں کی یورش پہلی بارش کی بوندوں کی طرح دل کی کچی زمین کو سیراب کر چلی۔ نباح نے ایک دم نگاہیں چرائیں۔ ثمرین ایک پیالی میں اچار لے کر پلٹی۔

'بھابی۔ کا کیا بھروسا اس کے سامنے ہی بے

عزتی کردیں گی۔' سعدی الٹے پاؤں اپنے کمرے میں واپس گھس گیا۔ نباح نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے ثمرین کا ہاتھ تھام کر شکریہ ادا کیا، تاکہ گھر روانہ ہوسکے۔ اس نے نباح کا نرم سا سنہرا ہاتھ تھاما اور کھینچ کر پیار سے گلے لگا کر جانے کی اجازت دی۔ وہ بغیر پیچھے دیکھے تیز تیز قدموں سے دروازہ پار کرگئی۔ پھر بھی ایسا لگا کہ سعدی کی آنکھیں اس کا پیچھا کررہی ہوں۔

'اس نے بھابی۔ کا دل جیت لیا۔ لڑکی میں۔ دم تو ہے بھئی۔' سعدی نے کمرے میں سے باہر کے منظر پر نگاہ جمائی رکھی۔ بھابی کے التفات دیکھ دیکھ کر وہ بے ہوش ہوا جارہا تھا۔

''چلو میاں۔ سعدی اسے اپنا بنانا ہے۔ اب کچھ تو کرنا ہی پڑے گا''۔ وہ باہر جانا بھول کر سوچ میں پڑ گیا۔

''یہ اشعی کہاں ہے۔؟ تم نے اسے دیکھا۔ میں کہیں مصروف ہوئی نہیں کہ باہر بھاگا۔ مجال ہے جو خود سے پڑھنے بیٹھ جائے۔؟' وہ باہر آیا تو ثمرین نے فوراً ہی اس کی کلاس لگائی۔ بھابی کے سوالات۔ اس کے لیے جواب بن گئے۔ راہ دکھادی۔ وہ ناک کی سیدھ میں چل پڑا۔

''سعدی کہاں کھوگئے ہو؟ میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں'' ثمرین بھنائی۔ اسے رات کے لیے ابھی سالن بگھارنا تھا ویسے بھی اسے ہر کام کی جلدی پڑی رہتی تھی۔

''جی بھابی وہ سفید گیٹ والے سنی کی چھت پر دوستوں کے ساتھ پتنگ اڑا رہا ہوگا'' ہمیشہ بھتیجے کی باتیں راز رکھنے والے چاچ۔ کی وفاداری اپنے دل کے ہاتھوں بک گئی۔

''کیا...... وہ پتنگ اڑانے لگا ہے۔ مجھے خبر بھی نہیں اور تم کیا صرف نام کے چاچا ہو لگاتے نہ دو ہاتھ۔ کان سے پکڑ کر میرے سامنے لاتے۔ میاں جی کہ بڑے پر نکل آئے ہیں۔ اسی لیے مڈ ٹرم میں اتنا خراب رزلٹ آیا ہے'' ثمرین کو پتنگ کا نام سن کر ہی پتنگے لگ گئے۔ چاچ بھتیجے کے ہر راز سے واقف تھا۔ بھابی کے خوف سے یہ بات چھپالی گئی تھی، پر آج تو بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑنا پڑا۔

''بس بھابی روز نہیں جاتا۔ بچہ ہے نہ آج چلا گیا۔ آپ کی یہ بات ٹھیک ہے کہ اس کی پڑھائی کی طرف توجہ پہلے سے کچھ کم ہوگئی ہے۔ اس کا حل ڈھونڈنا پڑے گا'' سعدی نے اشعر کو بچاتے ہوئے ، بنیاد ڈالی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چند دنوں سے میں بھی یہ ہی محسوس کررہی ہوں۔ ایسا کرو اب سے تم اسے ایک گھنٹہ پڑھایا کروارے۔ اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد بھتیجے پر توجہ نہ دو تو کیا فائدہ۔ ویسے دونوں یار غار بنے رہتے ہو۔ کبھی خیال آیا۔ اس گھر میں تو بس جو کرے۔ ثمرین کرے' الٹی آنتیں گلے پڑنے لگیں۔ وہ اس پر ہی بھر گئی۔ سعدی سر تھام کر بھابی کی ڈانٹ سننے لگا۔

''بھابی! او بھابی سنیں تو یہ آج کل کے بچے بھلا گھر میں پڑھنے والے ہیں۔ اتنے ہی سیدھے ہوتے تو شہر میں قائم سارے ٹیوشن سینٹر بند نہ ہوجاتے'' اس نے بوکھلا کر صفائی دی، اور منتظر نگاہوں سے کام میں مصروف بھابی کو دیکھنے لگا کہ اب کیا فرمان جاری ہوتا ہے۔

''ہوں۔ کہتے تو صحیح ہو۔ اشعی ایسا بچہ نہیں جو گھر والوں کے قابو میں آسکے، لیکن ایسے ہی چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ بتاؤ کیا کرنا چاہیے۔'' ثمرین نے کچھ سوچ کر اس سے مشورہ مانگا۔ تو اس کی من کی مراد بر آئی۔

''آپ ایسا کریں۔ اسے کہیں ٹیوشن بٹھادیں''

سعدی نے کچھ سوچ کر ہمدردی دکھائی، پھر ناصح بن کر مشورے سے نوازا۔

"یہ صحیح رہے گا۔ اسے کل ہی رضوان انکل کے پاس پکڑ کرلے جاتی ہوں۔ ان کے یہاں ٹیوشن بٹھا دیتی ہوں" ثمرین نے سامنے رکھے باؤل میں ہرا مسالا کترتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ وہ شامی کباب بنا کر فریز کرنے جا رہی تھی۔ زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی تیز چلانے لگی۔ وہ گڑبڑایا۔

"سوچ لیں۔ سنا ہے بچوں کی بہت ٹھکائی کرتے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے زرا سی بات پر ایک بچے کو اتنی زور سے مارا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا، یہ موٹا گومڑا ابھر گیا" سعدی نے مزے سے ایک بات گھڑی۔

"یہ نہ کروں وہ نہ کروں، پھر آخر کروں تو کیا کروں؟ میاں تم تو مجھے ہولائے دے رہے ہو" ثمرین کا ضبط جواب دے گیا چھری لہراتی وہ سعدی پر ہی الٹ پڑی۔

"بھابی کیا کرنا ہے۔ آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ میں جا رہا ہوں دیر ہو رہی ہے" وہ اتنے سالوں میں بھابی کا مزاج سمجھ چکا تھا۔ مزید کچھ بولنا۔ اپنی شامت کو آواز دینا۔ وہ فوراً بھاگ نکلا۔ ثمرین پیچھے سے اسے پکارتی رہ گئیں۔

"بیٹا چاچو نے۔ بنیاد ڈال دی ہے اب عمارت تو تم ہی کھڑی کرو گے" وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا کہ سامنے سے سنی کے ساتھ ہنستے مسکراتے اشعر کو آتا دیکھ کر سوچا۔ اپنے آپ کو خود ہی شاباش دے دی۔ اسے اشعر کو ہینڈل کرنا آتا تھا۔

"ٹیوشن پڑھوں گا تو صرف نباح آپی۔ سے ورنہ نہیں پڑھوں گا۔ رضوان انکل کے یہاں تو بالکل نہیں جانا"۔ اشعر ماں کے سامنے مچل گیا۔ ثمرین کو بھی۔ اس کی بات معقول لگی۔ وہ ویسے بھی نباح کو بہت پسند کرتی تھی۔ ماسٹر رضوان کی شہرت بچوں کو مارنے کے معاملے میں ویسے ہی خراب تھی۔

ثمرین نے نباح کے گھر جا کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اس سے خصوصی درخواست کی۔ نگار نے بیٹی کو اجازت دے دی۔ نباح نے اشعر کو ایک گھنٹہ پڑھانے کی حامی بھرلی۔

"میں تو کل سے نباح آپی سے پڑھنے جاؤں گا" اشعر نے گھر لوٹتے ہی اپنے چاچو کو خوش خبری سنائی۔ سعدی کے لیے یہ پہلی کامیابی تھی، اسے لگا جیسے ایک پہاڑ سر ہو گیا ہو۔ در محبوب سے ایک چھوٹا سا رابطہ تو جڑا۔ اب چاکلیٹ کی رشوت پر اشعر اس سے اپنی پیاری نباح آپی کے دکھ سکھ بتاتا رہے گا۔ ایسا ہی ہوا۔

نباح ان باتوں سے نا آشنا اپنی ہی دھن میں جیے جا رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ کوئی اس کو پانے کی دھن میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ جب بھی آنکھ بند کرتی تو دو بادامی آنکھیں سپنوں میں چلی آتیں۔ قطار در قطار محبت کے دیپ سے جل اٹھتے۔

☆......☆......☆

"کسی کو میرا خیال نہیں۔ جب گھر والوں کا یہ حال ہے۔ تو دھوبی بہشتی بھلا کیا قدر کریں گے۔ اے میں پوچھتی ہوں بہو۔ اتنے کپڑوں میں اسے پھاڑنے کے لیے میرا ہی کرتا ملا تھا" انہوں نے غصے میں نگار سے یوں سوال کیا، جیسے دھوبی نے یہ کام اس کی ایما پر کیا ہو۔

"اماں جی! یقین کریں میں نے اس کو بہت ڈانٹا، وہ بہت شرمندہ ہو رہا تھا کہ یہ غلطی سے پھٹ گیا، اصل میں پرانا بھی بہت ہو گیا ہے نا" نگار نے حتی الامکان نرم آواز میں ساس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان کی ایک نہ تو سونہ۔

''اے وہ موا کیا جانے کہ کتنا پرانا ہے۔ یہ تو کوئی گھر کا بھیدی ہے جو اس کے کانوں میں ایسی باتیں ڈال رہا ہے۔ سب کو پتا ہے نہ کہ میری سہیلی فیروزہ نے اپنے ہاتھوں سے سی کر بھیجا تھا۔ میں اسے کتنا سینت سینت کر رکھتی ہوں۔ کبھی کبھی جب دوست کی یاد آتی تو نکال کر پہن لیتی۔ بھلا یہ اب کسی قابل رہا ہے؟'' عزیز النساء نے سفید چکن کے کرتے کے سوراخ کا معائنہ کرتے ہوئے افسردگی سے کہا جو دھوبی پھاڑ لایا تھا۔ جب وہ منتقی سوچ رہی ہوں تو کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انہیں مثبت راہ دکھا سکیں۔ سوائے سرمد کے۔ اب وہ اس واقعے کو بھی نگار کا پھوہڑپنا قرار دینے میں لگی ہوئی تھیں۔ سب سر جھکائے سن رہے تھے۔ نباح کا دل ماں کی ہمدردی میں ہمکنے لگا، جو ہمیشہ سے اسی قسم کے حالات سے دوچار تھی۔ اس کے بابا۔ امید علی دادو کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انہوں نے بیوی کو پہلے دن ہی یہ بات اچھی طرح سمجھادی کہ ماں کو خوش رکھو گی تو یہاں رہ سکو گی، ورنہ سامان باندھ کر میکے کا رخ کرنا۔ نگار جو گھونگھٹ میں سر جھکائے سن رہی تھی، تا زندگی ساس کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔

نباح کا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ ماں کی حمایت میں دادو کے سامنے آکھڑی ہو۔ مگر ہمیشہ ماں کی تربیت اور باپ کا خوف آڑے آجاتا۔

''ہائے۔ فیروزہ تُو کتنی خوش قسمت ہے۔ تیری مرضی کے بغیر اس گھر کا پتا بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ تیری بہو تجھ کو پھولوں کی طرح رکھتی ہے۔ یہاں تو میں سب کی نگاہوں میں خار بنی ہوئی ہوں'' عزیز النساء نے باتوں کا رخ ایک نئی لے پر ڈالا۔ وہ بیٹے کے راج میں ملکہ بنی پورے گھر پر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ وسیع اختیارات اپنا الگ ہی نشہ ہے۔ نگار نے صفائی دینے کے لیے دو بار منہ کھولا، پر ساس کا غضب ناک سرخ چہرہ دیکھ کر خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

''دادو! مجھے بڑی اہم بات پوچھنی ہے۔ پلیز ایک منٹ دیں گی؟'' سرمد جو ابھی ٹیوشن پڑھا کر آیا تھا، جوتے اتارنے کے بعد ننگے پاؤں ہی دادی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بڑی سنجیدگی سے یوں گویا ہوا کہ سب متوجہ ہو گئے، عزیز النساء بھی فضیحتہ بھول بھال منہ کھول کر پوتے کو دیکھنے لگیں۔

''اب یہ کیا۔ نیا شگوفہ چھوڑے گا؟'' وہ دل ہی دل میں ہول اٹھیں، کہ پورے گھر میں ان کو ٹوکنے کی جسارت سرمد ہی کر سکتا تھا۔ یہ ہمت بھی ان کے بے جا لاڈ و پیار کا نتیجہ تھی۔

''ایں...... ہاں۔ بول کیا بات ہے؟'' سرمد کے مسلسل ایک ٹک دیکھنے پر وہ کسمسائیں۔ ایک دم بول اٹھیں۔ ورنہ اس سے قبل تو پاکستانی پولیس والوں کی طرح زبردستی بہو سے اپنی بات منوانے پر مصر تھیں۔

دادی اور پوتے کو مصروف دیکھ کر نگار نے ٹھنڈی سانس بھری اور دال چننے لگیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ پچھلی بار یہ کرتا گھر میں دھویا تو کلف نرم لگا۔ اس وقت ساس جی کا بیان اس کے متضاد تھا۔

''میرا اتنا اچھا چکن کا سوٹ دھوبی کو کیوں نہیں دیا۔ لے کے گھر میں دھو کر ناس مار دیا۔ اے بہو۔ مجھ سے ہی ایک سوٹ کی دھلائی لے لیتی''۔ وہ بڑا تاک کر وار کرتیں، سیدھا دل پر جا لگتا۔

''دادو! آپ کیا کہتی ہیں؟۔ مجھے تو لگتا ہے، یہ جو عراق کی جنگ ہوئی ہے نہ اس کے پیچھے بھی اماں کا ہاتھ ہے۔ شاید ڈرون حملے بھی ان کی اجازت کے بعد ہوتے ہیں۔ نہیں؟'' سرمد نے مزے سے دادی کے پاس تخت پر بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ نباح جو ماں کی مدد کروانے کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔

ہاتھ روک کر سرمد کو محبت بھری نظروں سے تکنے لگی۔

''ایں...... شہر جا ابھی بتاتی ہوں۔ دادی کی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ ماں کا سگا'' عزیز النساء پہلے تو گم سم ہو کر پوتے کی بات پر کھو گئیں، پھر اس کی شرارتی سی مسکراہٹ سے سمجھیں۔ جلدی سے اپنی چھڑی اٹھا کر سرمد کی کمر پر لگادی۔

''مار ڈالا۔ ہائے مار ڈالا دادو۔ کیا آپ کا دل۔ اتنے ہینڈسم پوتے کی یوں ٹھکائی لگاتے ذرا نہیں دکھتا؟'' وہ بلاوجہ کا شور مچانے لگا۔ نگار گھبرا کر بیٹے کی طرف بھاگی، عزیز النساء بھی سٹ پٹا کر پوتے کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

''پورا ایکٹر ہے'' فہد جو صبا کو کالج سے لیتا ہوا آیا تھا دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے سعد کو ماں اور دادی سے لاڈ اٹھواتا دیکھ کر ہنسے اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے، سرمد نے دادی سے لپٹے لپٹے ان دونوں کی طرف دیکھ کر اپنی ایک آنکھ بند کرلی اور ہنس دیا۔

''اچھا تو میرا مذاق اڑا رہا ہے'' وہ ایک دم منہ پھلا کر بیٹھ گئیں۔

''دادو اگر آپ نہیں مانیں گی نا، تو میں ان قدموں میں ساری عمر بیٹھا رہوں گا'' سرمد دادی کی آرام وہ کرسی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ ان کے پاؤں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر رونی شکل بنا کر بولا۔

''چل جا۔ میں نہیں ماننے والی'' عزیز النساء کے انداز میں مان تھا۔ تھوڑی دیر تو لاپروائی سے بیٹھی رہیں، پھر کسی کام کی وجہ سے اٹھنے کی حاجت پیش آئی تو پیروں کو پوتے کی قید میں پایا۔ جھٹک کر دور ہٹایا۔ سرمد مسکرایا۔ اب تو صحیح وقت آیا تھا جس کے لیے وہ شرٹ کی آستین فولڈ کر کے ان کو کس کر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ ان کو چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ آخر عزیز النساء کا غصہ کم ہوا۔ مسکرا کر پوتے کے گھنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ماتھے کا بوسہ لیا۔ وہ پان کا داغ ماتھے سے صاف کرتا ہوا ہنس دیا، جوان کے رچے ہونٹوں سے منتقل ہوا تھا۔

''چل ہٹ کیا مجھے بے وقوف سمجھتا ہے؟ تجھے اچھی طرح سے سمجھتی ہوں۔ اچھا مان گئی۔ اب تو چھوڑ دے بچے۔'' وہ ہنس دی۔

''آپی ایک کپ گرما گرم چائے'' سرمد نے ان کو آزادی دینے کے بعد ایک طویل انگڑائی لی اور چلایا۔

جوانی کی طاقت کمزوری میں کیا ڈھلنے لگتی ہے کہ انسانی نفسیات بھی تغیرات کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کچھ بوڑھے لوگ خود ساختہ تنہائی کا شکار ہونے لگتے۔ کوئی ہر وقت محفل سجائے رکھنے کہ خواہشمند ہوتے ہیں۔ عجیب الجھن میں مبتلا سب کی توجہ اپنی طرف مائل رکھنے کے لیے جھگڑتے بلاوجہ شور مچاتے، بیمار بن جاتے یا ماضی کے قصے بار بار دہراتے۔

اس گھر کے لوگ عزیز النساء کی نفسیات سمجھتے تھے۔ ساری عمر اپنے جذبوں کو مارنے اور زبان بند رکھنے پر مجبور بیوہ عورت کو اب آسودگی اور کھل کر آزادی کا احساس ہو چلا تو وہ بھرپور لطف اٹھانے کی ٹھان بیٹھیں۔ امید علی کے ساتھ ساتھ سب ان کے بلاوجہ کے شور شرابے کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود سر جھکا کر ویسا ہی کرتے جیسا وہ ان سب سے امید لگاتیں۔ جن چار دیواریوں میں بزرگوں کو تحفظ کا احساس دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ گھر رہتے ہیں مکان نہیں بنتے۔

محبت بڑی کمال کی چیز ہے۔ اچھی بھلی ماں بچے کے لیے تتلا کر بولنے لگتی ہے تو دنیا کے سامنے سر اٹھا کر چلنے والا باپ بیٹے کی فرمائش پر سر جھکا کر بلا حیل وحجت گھوڑا بن جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اولاد جوان

ہوکر والدین کے لرزتے ہاتھوں کے لیے کتنا بڑا سہارا ہوتی ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جن کی اولادیں زندگی میں ہی ان کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں۔

☆......☆......☆

''چاچو۔ یہ جو آپی کی دادو ہیں نا بہت ہی گندی بچی ہیں۔ اشعر کو بالکل اچھی نہیں لگتیں'' اس نے بطور رشوت مزید ار کینڈی کا ریپر اتار کر منہ میں رکھا اور منہ چلاتے ہوئے بولا۔

''بری بات اشعی بڑوں کو ایسے نہیں کہتے ۔ ویسے انہوں نے کیا کر دیا؟'' سعدی نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ رمضان کی آمد آمد تھی۔ ثمرین ماسی سے چھت کی صفائی کروانے میں مصروف تھی۔

''بس...... ہر وقت تو آپی کو ڈانٹتی رہتی ہیں۔ اشعر کو بہت برا لگتا ہے۔ ویسے ہی جیسے مما آپ پر چیختی ہیں تو مجھے برا لگتا ہے'' ریپر چاٹتے ہوئے وہ کچھ دیر ٹھہر کر سوچتے ہوئے افسردگی سے بولا۔ سعدی نے اپنے ہونٹوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو روکا۔ اسے اپنے بھتیجے کی محبت پر بالکل شبہ نہ تھا۔ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں صاف گو صاف دل اور منہ پھٹ۔ اشعر بھی ایسا ہی معصوم سا بچہ تھا۔ جو اپنے چاچو کے ساتھ ساتھ خود بھی ٹیوشن والی آپی کے عشق میں گرفتار ہو چلا تھا۔

''بس کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ بھائی سے بات کرتا ہوں۔ اوپر کی منزل بنوانے کا انتظام کریں۔ شادی کے بعد نباح کو لے کر اوپر شفٹ ہو جاؤں گا۔ جہاں نہ تمہاری مما ہوں گی نہ ہی نباح کی دادو۔ بس ہم دونوں اپنی چھوٹی سی دنیا میں خوشی خوشی رہیں گے'' سعدی کی آنکھوں میں ایک پیارا سا سپنا ابھرا۔

''جی نہیں......'' اشعر چیخا تو سعدی نے جلدی سے اپنی چوڑی ہتھیلی سے اس کے گلابی ہونٹوں کو بند کر دیا۔ وہ بھابی ثمرین کے غصے سے بہت ڈرتا تھا۔

''او بھائی کیا مروانے کا ارادہ ہے؟ بھابی کے حساب سے میں چکن لینے گیا ہوا ہوں'' سعدی نے اس کو دھیرے دھیرے کہا تو اس نے سر ہلایا۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا اشعر کے بغیر کوئی کہیں نہیں رہے گا'' وہ شرارت سے آنکھیں مٹکا کر بولا تو سعدی نے پیار سے اس کے گالوں کو چوم لیا اور سر ہلاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

''اے چھوٹی! تُو کہاں چلی۔ ادھر تو آ۔ ذرا میرا کمرا سمیٹ دے۔ کتنا پھیلا ہوا لگ رہا ہے'' صبا دادو کو چائے دینے آئی تھی جلدی سے جانے لگی کہ ان کی آواز پر رکنا پڑا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولیں۔

''جی اچھا دادو!'' صبا نے جلدی پرانے اخبارات کی سمیٹنا شروع کر دیے۔ جو کمرے میں کئی جگہوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سب کو دادو کے کمرے میں ہی اخبار پڑھنے کا خبط تھا۔ اس طرح دادو کو بھی کمپنی مل جاتی۔ حالاتِ حاضرہ پر سیر حاصل تبصرہ ان کے دل بہلانے کا سبب بنتا۔

''فیروزہ کا فون آیا تھا وہ یہاں چند دن گزارنے کے لیے آ رہی ہے، اسٹور سے دوسرا پلنگ نکلوا کر میرے بیڈ کے ساتھ اس کے لیے بستر لگوا دینا'' دادو کے مزید احکامات سن کر سدا کی کام چور صبا کی جان ہی نکل گئی۔ ان کا کمرہ صاف کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ کسی بات سے خوش نہیں ہوتی تھیں۔ خاص طور پر جب گاؤں سے ان کی ہم جولی دادی فیروزہ یہاں آ رہی ہوتیں تو انہیں ہر کام میں عیب دکھائی دینے لگتے، ہر بات پر دادی فیروزہ کی

بہواور پوتا پوتی کی سعادت مندی کے قصے سنا سنا کر ایسی ٹھنڈی آہیں بھرتیں، کہ سامنے والے کو ایئر کنڈیشن کے مزے دیتیں۔

"آپ جب کبھی ان کے شہر نہیں گئیں۔ تو آپ کو ان کے گھر کے ماحول کا کیا پتا۔ ایسے ہی تعریفیں کرتی رہتی ہیں" ۔ سرمد اکثر چڑ کر پوچھتا۔

"لو۔ گئی نہیں تو کیا ہوا۔ وہ اپنے دل کی ساری باتیں مجھے ہی تو بتاتی ہے" ان کے لہجے میں اپنی سہیلی کے لیے بچپن کی محبت اور ایک خاص گداز سا آتا، چہرہ روشن ہو جاتا۔ عزیز النساء ہمیشہ سہیلی کو بڑے اہتمام سے خود فون کرتیں۔ دونوں ہم جولیاں ہفتے میں ایک بار فون پر طویل دکھ سکھ کرنے کی عادی تھیں، جس میں دکھ عزیز النساء کے اور سکھ فیروزہ کے ہوتے۔

عزیز النساء کے پُرزور اصرار پر وہ سال چھ مہینے میں یہاں ایک ہفتہ گزارنے آجاتیں۔ مانو عزیز النساء کی عید ہو جاتی۔ بیٹے سمیت پورے گھر کو ایک پاؤں پر نچاتیں۔ جانے کیا بات تھی کہ فیروزہ کے بلانے پر بھی وہ کبھی اس کے گھر نہ گئیں، انہیں شاید اپنی چھوٹی سی یہ راجدھانی بہت عزیز تھی، یہاں سے نکلنا محال تھا۔

"وادو! آپ بھی نا بس" ان کے لہجے میں سمٹا پیار دیکھ کر۔ سرمد چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ بول پاتا۔

☆......☆......☆

"سعدی! یہ کیا چل رہا ہے۔ روزانہ دیر سے گھر آنا مجھے بالکل پسند نہیں۔ کل بھی ایسا ہوا تو دروازہ نہیں کھولوں گی۔" ثمرین نے تیسرے دن بھی دیور کو دیر سے گھر میں گھستے دیکھا تو ابل پڑی۔ جذبات میں کچھ زیادہ بول گئیں۔ اخبار میں محو ہادی کے ماتھے پر شکن ابھری۔ اخبار لپیٹ کر زور سے میز پر رکھا۔

"بھئی ثمو۔ یہ بات کرنے کو کون سا طریقہ ہے؟ صبر کرو ابھی تو گھر آیا ہے، کچھ کھا پی لے۔ پھر آرام سے کلاس لگانا" ہادی نے چھوٹے بھائی کو شرمندہ سا دیکھا تو، بیوی کو قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے سے روکا۔ سارے زمانے پر رعب دکھانے والی ثمرین شوہر کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی۔ کسمسا کر کچن کی طرف بڑھ گئی، تاکہ دیور کے لیے کھانا گرم کر سکے۔

"یار کبھی ہم کو بھی لفٹ کرا دیا کرو۔ یہاں آکر میرے پاس صوفے بیٹھو۔ اشعی جاؤ۔ اپنے چاچو کے لیے پانی لے کر آؤ" ہادی نے چھوٹے بھائی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔ بیٹے کو حکم دیا۔ وہ اندر کی طرف بھاگا۔ سعدی کو بڑے بھائی کی محبت پر فخر سا محسوس ہوا۔ وہ والدین کے بعد اس کے لیے تپتی دھوپ میں گھنا سایہ سا تھے۔

"بھائی، وہ ایک دوست کے ساتھ پارٹنرشپ میں اپنا سوفٹ ویئر ہاؤس کھولنے کا ارادہ ہے۔ بس اسی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ اس لیے دیر سویر ہو جاتی ہے" سعدی نے شرمندگی سے سر جھکا کر صفائی دینی چاہی تو ہادی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروایا۔

"بیٹا مجھے تم پر مکمل اعتبار ہے۔ پتا ہے کہ تم کبھی کوئی غلط کام نہیں کرو گے۔ اگر ترقی کا سوچ رہے ہو تو اچھی بات ہے۔ جہاں میری ضرورت محسوس ہو میں حاضر ہوں" ہادی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ثمرین نے کھانا ٹیبل پر لگاتے ہوئے مسکرا کر ان کی محبت دیکھی۔ سعدی بھابی کی آواز پر کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھونے چل دیا۔

"اے جی! میں کہتی ہوں لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ کچھ شادی وادی کا بھی سوچا ہے یا نہیں" سعدی کھانے کی میز پر بیٹھ گیا تو ثمرین نے شوہر کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے دھیمے سے

کہا، پاس بیٹھے اشعر کی توجہ "ٹام اینڈ جیری شو" سے ہٹ گئی۔

"بھئی تو تم ٹھیک ہو۔ تمہیں بھی رات کو کھانا گرم کرنے سے نجات مل جائے گی۔ تمہارا ایک ہی دیور ہے، وہ بھی نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔ پورے سسرال کے ساتھ رہتی تو جانے کیا ہوتا۔ کیوں اشعی میاں پھر چاچی لائی جائے؟" ہادی نے بھاپ اڑاتی پیالی کو دیکھتے ہوئے کافی سنجیدگی سے کہا۔ انہیں بیوی کا کچھ دیر قبل کا انداز گفتگو بہت ناگوار گزرا تھا۔ یوں جتادیا۔

"کیا آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں؟ سعدی میرے لیے اشعر سے کم نہیں۔ اگر سختی کرتی ہوں تو صرف اس لیے کہ بن ماں باپ کا بچہ بگڑ نہ جائے۔ اے جی۔ آپ تو شروع سے کمانے میں مصروف رہے۔ میں نے اس پر ماں اور باپ دونوں بن کر سختی کی، اس کی توجہ ہمیشہ پڑھائی پر رکھنے کے لیے، اس کے پل پل کا حساب رکھا۔ دوستوں پر نظر رکھی کہ بری صحبت میں نہ پڑ جائے۔ جناب آج سعدی جو ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہے نا" تو اس کے پیچھے میری جان توڑ کوشش کارفرما رہی ہے۔ پر آپ نے تو ایک جھٹکے میں مجھے غیر کر دیا بیٹے کو دیور بنا دیا۔" ہادی کی بات اس کے دل پر کوڑے کی طرح برسی، ثمرین ایک دم روہانسی ہوگئی۔ وہ زبان کی کڑوی سہی دل کی بہت اچھی تھی۔ مزاج کے برخلاف جا کر صفائی دینے لگی۔ سعدی جو کھانا کھا چکا تھا۔ ٹی وی لاؤنج طرف آ رہا تھا، بھابی کی محبت پر دل بھر آیا۔ وہ جو کہہ رہی تھی۔ اس میں۔ رتی برابر بھی جھوٹ نہ تھا۔ بھابی کا ایک ایک لفظ ان کی صداقت کا آئینہ دار تھا۔ ورنہ اماں اور بابا کے جانے کے بعد وہ اتنا ٹوٹ گیا تھا کہ بکھرنے میں لمحہ نہ لگتا پر ثمرین کے خوف سے ہمیشہ خود کو جوڑے رکھا۔

"سوری ثمو۔ وہ شاید میں جذبات میں کچھ غلط بول گیا۔ ورنہ حقیقت ہے کہ اس گھر کی ایک عورت نے ہم تین مردوں کو سنبھالا ہوا ہے، کیوں اشعی، کیوں سعدی۔ میں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا" ہادی نے ثمرین کو محبت سے تھام کر صوفے پر بٹھا کر ان دونوں کو اشارہ کیا۔

"تھینک یو میم ہمیں آپ پر فخر ہے۔" تینوں ایک لائن میں کھڑے ہوئے اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے بڑے پُر وقار انداز میں جھکے۔ ایک ساتھ کئی قہقہوں نے فضا میں جلترنگ بجا دیے۔

"پاپا وہ چاچی والی بات تو رہ ہی گئی" اشعر نے جلدی سے یاد دلایا۔

"میں نے شریف ٹھیکیدار کو بلوایا ہے، اوپر کی منزل بنوا رہا ہوں، سعدی کو شادی کے بعد ایک بڑا پورشن چاہیے ہوگا، اس دوران آپ لڑکی دیکھ لیں۔ سال، چھ مہینے میں یہ نیک کام میں انجام دے دیتے ہیں" ہادی نے جلدی جلدی اپنا منصوبہ ان کے سامنے رکھا، سعدی کی نگاہیں بھائی سے ملیں۔ وہ مسکرایا۔ جو دل سے محبت کرتے ہیں، وہ ہی بنا کہے دل کی بات جان لیتے ہیں۔

"اے جی! کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ کنسٹرکشن کا کام شروع کروا دیں۔ میں لڑکی کے لیے کسی رشتے والی سے رابطہ کرتی ہوں۔ آج کل تو وہ ہی یہ کام کرواتی ہیں" ثمرین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا، سعدی کا دل چاہا کہ دیوار سے سر مار دے، بچی بغل میں ڈھنڈورا شہر میں، پر بھابی کی نگاہیں بچی تک پہنچیں تو۔ وہ ایک دم اداس ہوگیا۔ بڑے بھائی کہ سامنے اپنی پسند کی بات کرنا۔ اسے ایک دم لحاظ آیا۔ مایوسی کی انتہاؤں تک پہنچتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہا تھا۔

"کیوں ماما آپ بھی نا۔ میری چاچی تو صرف

نباح آپی ہی بنیں گی" اشعر کی آواز تھی یا کوئی سریلا گیت وہ مدہوش ہونے لگا۔ثمرین ایک دم مسکرادی۔

"کون نباح آپی؟ وہ ٹیوشن والی مس" ہادی نے بھائی کے چہرے پر ایک دم ابھرنے والی مسکراہٹ سے بھائی کے دل کا راز پالیا۔فوراً ہی دلچسپی دکھائی۔

"اشعی کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔واقعی بڑی پیاری اور گھریلولڑکی ہے۔ہمارے سعدی کے ساتھ جچے گی مگر اس کی دادو" ثمرین نے ایک منٹ میں تانے بانے جوڑے۔پرایک جگہ پرا ٹک گئی۔

"افوہ مما۔چاچ اتنے اچھے ہیں۔بس۔ان کی شادی آپی سے ہی ہوگی" اشعر مصلحتوں اور نزاکتوں سے ناآشنا پیر پٹخ کر بولا۔

"بھئی۔ثمو۔گھر میں بیٹھ کر اندازے نہ لگاؤ۔جا کر بات تو کرو۔جب لڑکی اچھی ہے تو اسے اندیشوں میں پڑ کر کھونا عقلمندی نہیں" ہادی بھائی کے چہرے پر جلتی بجھتی روشنی کو دیکھتے ہوئے مدد پر کمر بستہ ہوئے۔

"اچھا نگار آپا سے بات کروں گی" وہ نیم رضا مند ہوئی۔تو ہادی نے ان کے پیچھے سے وکٹری کا نشان بنایا۔سعدی کے دل نے "یاہو" کا نعرہ مارا۔

"اے جی۔میں کہتی ہوں۔لڑکے سے بھی پوچھیے، سمجھدار ہے، جانے اس کی بھی کوئی اپنی پسند ناپسند نہ ہو" ثمرین نے برتن سمیٹتے ہوئے لہجے بھر رک کر کہا۔

"ثمو۔یہ تو آپ دور کی کوڑی لائی ہیں۔کیوں میاں کیا کہتے ہو۔ابھی بھی وقت ہے۔کوئی پسند ہو تو بتادو؟۔بعد میں یہ نہ کہنا کہ بھائی بھابی نے اپنی مرضی چلائی" ہادی بھائی کے دل کا راز اچھی طرح سے پاچکا تھا، اسی لیے شرارت پر آمادہ ہوا۔مسکراہٹ آنکھوں سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔اشعر منہ

دل سے ملے دل

3 دسمبر 1967ء کو جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن کے گروٹ شور اسپتال میں ڈاکٹر کرسچن نیتھ لینگ برنارڈ نے ایک 53 سالہ شخص کے سینے میں ایک 25 سالہ لڑکی مس ڈینائس ڈارول جس کا انتقال ایک حادثے میں ہوا، کا دل لگا کر سرجری کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا، یہ دنیا میں تبدیلی قلب کا پہلا آپریشن تھا۔تبدیلی قلب کا یہ پہلا مریض لوئی وشکانسکی اس آپریشن کے بعد فقط اٹھارہ دن زندہ رہ سکا۔

پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

"نہیں بھائی جو میری بھابی ماں کی مرضی وہی میری مرضی ہوگی" اس نے ثمرین کے سامنے سر جھکا کر سعادت مندی کی انتہا کردی۔وہ اپنی اہمیت پر خوش ہوگئی، سعدی کی بلائیں لینے لگی۔سہانی خوشی نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆......☆......☆

"ائی بہو۔یہ سالن کیسا پکایا ہے؟ کتنے شوق سے لوکی گوشت پکوایا تھا، ذائقہ ہی نہیں پتا چل رہا، لوکی بھی حلوہ ہوگئی ہے رنگ تو دیکھو" عزیز النساء نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا تو پلیٹ سرکائی اور منہ بنا کر عیب نکالنا شروع کیا۔سرمد انہیں خاموش کراتا ہی رہ گیا۔یہ حقیقت بھی تھی کہ آج سالن کچھ بدمزہ سا تھا، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ نگار کو دو دن سے بخار آرہا تھا، نباح کو بھی اپنی سہیلی کے ساتھ یونی ورسٹی ایڈمیشن کا پتا کرنے جانا پڑ گیا، وہ بھی ماں کی مدد نہ کرواسکی۔صبا

کو ابھی کچن کے کاموں کا اتنا اندازہ نہیں تھا،،۔ یوں گھومتے سر کے ساتھ نگار نے سالن پکایا اور بستر پر جا گری۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھے کہ عزیز النساء شروع ہو گئیں۔

"دادو۔ پلیز کبھی تو خیال کر لیا کریں نہ۔ اماں کی کتنی طبیعت خراب ہے۔ پر آپ کو کیا پروا" سرمد بھنا اٹھا۔ ماں کی حالت کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بول پڑا۔ صبا اور نباح ہکا بکا رہ گئی۔ عزیز النساء پوتے کے یوں چیخنے پر حق دق رہ گئیں۔

"میں کچھ بھی کر لوں۔ کتنی بھی محبت جتا لوں ، ہے تو تو نگار کی اولاد نہ۔ بس اسی کا بن کر رہے گا" عزیز النساء بغیر سوچے سمجھے منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگتیں۔ سرمد ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ دادی کو سمجھانا آسان نہیں۔ بلاشبہ وہ ان سے بے تحاشہ محبت کرتا تھا، پر اسے اپنی نیک طبیعت ماں سے بھی بہت پیار تھا۔ اپنی ماں پر پڑنے والی زرا سی گرم آنچ اسے برداشت نہ ہوتی۔ آخر وہ امید علی کا ہی بیٹا تھا، اس معاملے میں پکا پکا باپ پر گیا تھا۔

امید علی جو آج صبح سے گھر پر ہی تھے نماز پڑھ کر ابھی دروازے سے داخل ہوئے ، ماں کو یوں روتا دیکھ کر ایک دم آپے سے باہر ہو گئے۔ کرسی سنبھالتے ہی چھوٹے بیٹے کو برا بھلا کہنا شروع ہو گئے۔ اس کی سٹی گم ہو گئی ، عزیز النساء نے ہی بیٹے کو خاموش کرا دیا۔ سرمد نے ناراضی سے دادو کو دیکھا ، وہ نگاہیں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ دونوں طرف چوٹ برابر کی تھی۔ سرمد بھی دادی کی طرح اپنے آپ کو صاف گو کہتا، کبھی کبھی ہلکی پھلکی بحث کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ ماں کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر دادو کو جتا بھی دیتا۔

"تازہ چونا کلیا میں انڈیل لاؤں ، کم بخت مارا سوکھ گیا ہے، پان بھی بے مزے لگ رہے ہیں" ایک دم چھا جانے والی خاموشی سے وہ خود ہی شرمندہ ہوئیں۔ زور سے بولیں۔ سرمد سر جھکائے بیٹھا رہا۔ مجال ہے جو نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ہو۔ عزیز النساء کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ ایک دم چھڑی اٹھا کر بیٹے کی طرف بڑھیں۔

"امید علی ہزار بار کہا ہے نا کہ میرے اور سرمد کے معاملہ میں نہ آیا کر پھر تو کیوں شروع ہوا؟ میں نے تجھ سے کوئی شکایت کی تھی بھلا میرے بچے کو دکھی کر دیا۔" ان کا ایسے سوکھے منہ بنا کر بولنے اور سارا قصور بیٹے پر ڈالنے سے امید علی گڑ بڑا گئے۔ سفید بالوں والے باپ کا بچوں کی طرح اپنی ماں کے سامنے جھینپنا...... بڑا ہی دلفریب منظر تھا۔ سرمد کے ساتھ ساتھ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ امید علی بھی کھلکھلا اٹھے۔ ماحول خوشگوار ہوا تو دونوں بہنوں کی جان میں جان آئی۔ نگار نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ حالانکہ یہ گھر کا ایک ایسا ناٹک تھا، جس کی پوری کہانی انہیں ازبر تھی، پھر بھی وہ وقتی تشویش میں مبتلا ہو جاتیں۔

نباح جلدی سے دادی کا پاندان دوبارہ تازہ کر کے لے آئی۔ عزیز النساء امید علی کے لائے ہوئے پانوں کے ٹکڑے کر کے گیلے رومال میں لپیٹنے میں مگن ہو گئیں۔ سرمد مزے سے ناریل کی گری اور سونف منہ میں پھانکتا ہوا بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل جاتا۔ ڈرامے کا خوشگوار اختتام دیکھنے کے بعد پورا گھر سکون کی سانس لے کر اپنے معمولات میں گم ہونے لگا۔ فہد کا آج ہاف ڈے ہوتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر قبل آفس سے لوٹا تھا۔ اسے دوست کی شادی میں جانا تھا۔ وہ کپڑے نکالنے کے لیے صبا کو آوازیں دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بعض لوگوں کے لیے کچھ بھی کر لیا جائے وہ خوش

نہیں ہوتے۔ یا شاید خوش ہونا ہی نہیں چاہتے۔ مگر کچھ لوگ بلاوجہ کی باتوں پر بھی خوش رہتے ہیں۔

☆......☆......☆

''بس فیروزہ کیا کہوں۔ بڑھاپے میں انسان لاچار اور مجبور ہو جاتا ہے۔ خیر تم اپنی کہو کیسی گزر رہی ہے؟'' عزیز النساء نے ٹھنڈی آہ بھری اور اگالدان اٹھایا۔

''نہیں بہن میری بہوئیں اور بیٹے بہت ہی اچھے ہیں۔ مجھے تو وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ وہ سب اتنے سعادت مند ہیں کہ مجھ میری مرضی کے بغیر گھر کا پتا بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا۔'' فیروزہ نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ عزیز النساء ان کی داستان اشتیاق سے سننے میں محو تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں فیروزہ کے بچوں سے اتنی متاثر رہتیں، حالانکہ یہاں بھی سب ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مگر دور کے ڈھول سہانے کے مصداق وہ دوسروں کو ہی اپنے سے برتر سمجھتیں۔

''میرے سارے پوتے پوتی شام ہوتے ہی مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جس بہو کی ہانڈی کی باری ہوتی ہے وہ کھانا تک مجھ سے پوچھ کر پکاتی ہے۔ بیٹے رات کو جب تک میرے پاؤں نہیں داب لیتے مجال ہے جو کمرے میں گھس جائیں۔ میرے سامنے کسی کی آواز نہیں نکلتی'' فیروزہ ایک دم سے شروع ہوئیں اور بولتی چلی گئیں۔ عزیز النساء ایک رشک کے عالم میں انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ نباح جو جگ اور پانی کا گلاس رکھنے آئی تھی، اس نے چونک کر عجیب نگاہوں سے فیروزہ دادی کو دیکھا۔

''اتنی اچھائیاں وہ بھی ایک ساتھ۔ اونچ نیچ تو ہر گھر میں ہوتی ہے۔ وہ گھر ہی کیا، جہاں مسئلے مسائل نہ ہوں؟'' نباح نے لمحہ بھر رک کر فیروزہ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوچا اُسے ایسا لگا کہ فیروزہ دادی کا کا

لہجہ اور چہرے کے تاثرات ایک دوسرے کی عکاسی نہیں کر رہے تھے۔ صبا کے پکارنے پر وہ فضول باتوں سے پیچھا چھڑاتی۔ سر جھٹک کر باہر کی طرف چل دی۔

''ہاں بہن تو بڑی خوش قسمت ہے۔ اللہ جی سب کو ایسی سعادتمندی عطا فرمائے اے لو تازہ پان کھاؤ'' عزیز النساء نے سہیلی کو دعا دیتے ہوئے پان کی گلوری تھمائی، جو انہوں نے منہ میں دبالی۔

''ہاں تو میں جب یہاں آ رہی تھی تو سب منع کر رہے تھے پر میں نے ڈانٹا کہ عزیز میری بہن جیسی دوست ہے، اس کے یہاں جانا تو ضروری ہے نا۔'' انہوں نے سہیلی کا ہاتھ تھاما اور محبت سے بولیں۔

''ٹھیک کہا نا کچھ میرا بھی تجھ پر حق ہے۔ اب تُو یہاں آرام سے کافی دن رہ کر جانا بس میں نے کہہ دیا ہے'' عزیز النساء نے پیار سے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ہاں سوچا تو میں نے بھی یہ ہی ہے۔ اس دفعہ یہاں طویل قیام کروں گی، رحیم یار خان سے کراچی آنے میں میرے جسم کی چولیں ہل جاتی ہیں'' وہ ہاتھ سے کمر دباتے ہوئے کہنے لگیں۔

فیروزہ اپنا سامان سامنے رکھی الماری میں رکھنے لگیں تو انہوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا، ایک کمرہ انسان کی حیثیت کا تعین کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ اس میں رہائش پزیر انسان کی باقی لوگوں کی نگاہوں میں کتنی وقعت ہے، اگر وہ انسان بوجھ لگنے لگا ہے تو، اس جگہ کی حالتِ زار سے اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔ عزیز النساء کا یہ کمرہ کتنا صاف ستھرا تھا، ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ جمی ہوئی۔ دھول مٹی کا نام و نشان تک نہیں تھا، پتا چلتا تھا کہ اس کے مکین کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے کا بھی کتنا دھیان رکھا جاتا ہے۔ یہ پھر بھی

خوش نہیں رہتی۔ بڑی ہی ناشکری ہے۔" فیروزہ نے سامنے قیمتی چکن کے سوٹ میں ملبوس چمکتی جلد والی اپنی بوڑھی ہم جولی کو دیکھا جوان کے برابر ہونے کے باوجود چھوٹی لگنے لگی تھیں۔ ایک سرد آہ منہ سے نکلی، دکھ کے بادل ان کے کمزور چہرے پر منڈلانے لگے۔ وہ جب بھی یہاں آتی ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتیں۔ یہاں رہنے والوں کو ہمیشہ مسرور اور مطمئن پایا۔ ان کے چہروں پر پھیلی خوشی قابل رشک تھی۔ جبکہ ان کے گھر مال و دولت کی فراوانی ہونے کے باوجود بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ایک کھینچا تانی کی کیفیت رہتی تھی۔ ان کے اعصاب پر ایک ایسا بوجھ سا آپڑا کہ وہاں رہنا دوبھر ہو گیا۔

"اوئی تُو پہلے سے کچھ کمزور اور کالی دکھائی دے رہی ہے۔ کھاتی پیتی نہیں ہے کیا؟ گھر میں سب خیر تو ہے" عزیز النساء نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے فکرمندی سے کہا جو اپنی انگلیاں مسلتی ہوئی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"اے چھوڑو بھی تم کو وہم ہوا ہے اچھی بھلی تو ہوں۔ اصل میں یہاں آنے سے ایک ہفتہ قبل ہی بخار سے اٹھی ہوں۔ اس لیے کمزوری ہوگئی ہے۔ اچھا چھوڑو فالتو باتیں یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے دوپٹہ کاڑھا ہے۔ تمہاری پسند کی بیل بنائی ہے۔ یہ اس کا کرتا اور شلوار کا کپڑا ہے اس کے گلے آستین پر بھی میں نے خود کڑھائی کی ہے۔" انہوں نے اپنے بیگ کی زپ کھول کر کچھ نکالا۔ آسمانی سوٹ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے محبت سے کہا، جس پر ہلکے جامنی اور گلابی رنگ کی بیل اپنی بہار دکھا رہی تھی۔

"واہ۔ یہ تو بہت پیارا ہے۔ سچ فیروزہ تُو آج بھی ویسی ہے۔ بالکل نہیں بدلی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتی ہے" ایک عام سے سوتی سوٹ کی اتنی پذیرائی دیکھ کر فیروزہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں عزیز النساء کی محبت پر ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت جیسے دل بھر سا آیا۔ دوپٹہ پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتی عزیز النساء، اپنی بچپن کی سہیلی کو دیکھے گئیں۔

"بہن معذرت میری بہوؤں نے تمہارے لیے الگ الگ قیمتی سوٹ منگوائے تھے۔ بس بڑھاپا برا آیا۔ جلدی میں نکلی۔ سامان والا دوسرا بیگ جانے کیسے گھر میں ہی رہ گیا۔ بس یہ اپنے سامان میں رکھ لیا تو ساتھ لے آئی" بات بتاتی وہ شرمندہ شرمندہ ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ جس پھیرے بھی گھر لوٹتیں، عزیز النساء فرداً فرداً ان کو تحائف دلواتیں۔ خود بھی چار، چھ نئے جوڑے سلوا کر ان کے سامان میں رکھ دیتیں، پر وہ ہمیشہ ایسے ہی خالی ہاتھ جھلاتی چلی آتیں۔

"میرے لیے دنیا میں اس سے قیمتی چیز کچھ نہیں۔ جس کے ایک ایک ٹانکے ٹانکے میں تیرا، خلوص، محبت اور محنت بسی ہے" انہوں نے سوٹ کو سینے سے لگا کر عزت دی، آنکھیں بھر آئیں۔ فیروزہ کو جانے کیا ہوا، ایسی عزت اور مان پر وہ عزیز النساء سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

☆......☆......☆

"دیکھو، ثمرین مجھے اس معاملے میں نباح کے بابا سے بات کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی کوئی جواب دے سکتی ہوں" نگار نے دھیرے دھیرے ثمرین سے کہا، جس نے نباح کے لیے سعدی کے رشتے کی بات کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ابھی ساس کے کان میں یہ بات پڑے۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ آپ سوچ سمجھ لیں، گھر میں مشورہ کر کے بتا دیجیے گا، اس کے بعد ہی میں باقاعدہ رشتہ لاؤں گی" ثمرین ایسی نزاکتوں کو سمجھتی تھی، رسانیت سے بولی۔

"شکریہ! ارے یہ چائے تو پی لو" نگار مزید کوئی بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی، انہوں نے ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر دیکھا، ساس اپنی ہم جولی کے ساتھ پلنگ پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ یہ بات اس کے علم میں اچھی طرح سے تھی کہ عزیز النساء ثمرین سے بہت چڑتی ہیں۔ کچھ سننے سے پہلے ہی انکار کر دیں گی۔ وہ ایسی ہی شدت پسند تھیں جس سے پیار کرتیں بے تحاشا، اگر بیر باندھ لیتیں تو جینا محال کر دیتیں۔ نگار اسی لیے وقت سے پہلے اس بات کی تشہیر کرنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ سعدی جیسے اچھے لڑکے کا رشتہ ہاتھ سے گنوانا عقلمندی تو نہ ہوتی۔

"پہلے ان سے بات کر لی جائے پھر یہ خود ہی اپنے حساب سے معاملہ آگے بڑھائیں۔ تو اچھا رہے گا" نگار کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ سعدی میرا دیور نہیں بیٹا ہے۔ میں اس کی مکمل گارنٹی لیتی ہوں کہ وہ نباح کو اتنا خوش رکھے گا آپ جھولی بھر بھر کر مجھے دعائیں دیں گی" ثمرین نے ان کا ہاتھ تھام کر بڑی لجاحت سے کہا، تو نگار کے دل نے اس کی بات پر یقین کرنے میں لمحہ نہ لگایا۔ خلوص کی اپنی پہچان ہوتی ہے۔

"اتنے اچھے رشتے کے لیے بیٹا ماں کو منا ہی لے گا، اس بار کسی دوسرے کی بیٹی کا نہیں، امید علی کے اپنے خون کا معاملہ جو ٹھہرا۔" نگار دکھ سے سوچتی ہوئی دروازہ بند کر کے پلٹیں تو سامنے ہی نباح گنگناتی ہوئی، پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ انہیں اس پر ایک دم پیار آیا۔

"کل تک گڑیا گڈے کی شادی کرنے والی۔ میری اپنی گڑیا آج اتنی بڑی ہو گئی کہ اس کی ودائی کا وقت قریب آ گیا۔ کل کی ہی تو بات لگتی ہے جب یہ میری گود میں آئی تھی۔ یہ وقت اتنی جلدی کیوں گزر جاتا ہے۔" نگار نے آنسو پونچھتے ہوئے۔ اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

ہائے اماں سچ سعدی بھائی تو اتنے ڈیشنگ ہیں۔ آپی کے ساتھ شادی ہو گئی تو میری ساری دوستیں اتنے ہینڈسم بہنوئی کو دیکھ کر مجھ پر رشک کریں گی۔ بابا سے کہیں نہ اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھے بھالے تو ہیں۔ بس ہاں کر کے شادی کی تیاریاں شروع کریں۔ اماں میں تو غرارہ بنواؤں گی" صبا ایک دفعہ شروع ہوئی تو نگار کو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ وہ لوگ دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ نباح الگ کچن کے کونے میں کھڑی کھیرا کاٹتے ہوئے چھوئی موئی ہوئی جا رہی تھی۔ جب سے اسے ثمرین کی آمد اور رشتے کی بابت پتا چلا تھا، دل قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا، بن مانگے کی خوشی کا عجب عالم تھا، ابھی اس راہ پر چلنے کا سوچا ہی تھا کہ محبت تخیل کے سفر پر گامزن ہو گئی، ایسا لگا جیسے خوش رنگ پھولوں کے بیچ آ کھڑی ہوئی ہو اور مزید نکھر گئی۔ رنگت کا سنہری پن نمایاں ہوا تو گالوں پر گلابی چمک سی آ گئی، آنکھوں سے روشنیاں سی پھوٹ پڑیں، پیا کی محبت کے سارے رنگ اس پر سجنے لگے۔

"بس کرو لڑکی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ابھی تمہاری دادو تک بات نہیں پہنچی ہے، بھنک بھی پڑ گئی تو ہنگامہ مچ جائے گا" انہوں نے بے فکری سے آٹا گوندھتے ہوئے زور سے کہا، ایک دم چھا جانے والی خاموشی پر مڑ کر دیکھا تو جانا کہ پیروں تلے زمین نکلنا کسے کہتے ہیں؟ صبا اور نباح فق چہرہ لیے اپنی دادو کو دیکھ رہی تھیں، جن کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ عزیز النساء کسی کام سے کچن میں داخل ہوئی تھیں، شومئ قسمت ان کے کانوں میں نگار

کی یہ باتیں بڑی زوروشور سے پڑ گئیں۔

"ہاں۔ بھئی۔ ایک دادو ہی بری اس گھر میں۔ باقی تو سب بھلے ہی رہتے ہیں، ارے میں کہتی ہوں گلا گھونٹ دو، ایک ہی دفعہ چھٹکارا مل جائے گا۔ اب مجھ سے باتیں بھی چھپائی جانے لگی ہیں۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگئیں۔ کبھی کبھی ادھوری سنی ہوئی بات سے نتائج اخذ کرنا ایک خطرناک غلطی ثابت ہوتی ہے۔ عزیز النساء اس وقت بدگمانیوں کے آسمان پر جا بیٹھیں، اسی لیے ان کو سارے گھر والے اپنے آپ سے بہت دور دکھائی دے رہے تھے، انہوں گھر والوں کی محبت اور خلوص بھلانے میں ایک لمحہ نہ لگایا۔

"اماں جی...... یہ بات نہیں ہے۔ آپ بالکل غلط سمجھ رہی ہیں" نگار نے ہکلا ہکلا کر اپنی صفائی دینا چاہی۔ مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بہو کو خاموش کرا دیا، آنکھوں کے آنسو رک نہیں رہے تھے۔ نباح سے دادو کی یہ حالت دیکھی نہ گئی، وہ بڑھ کر ان سے لپٹ گئی، وہ پھر بھی بت کی مانند بے حس ہی کھڑی رہیں۔

"بہو...... اگر میں ہنگامہ مچانے والی ہوتی نہ تو اتنے سالوں سے اپنا گھر پکڑ کر نہ بیٹھتی، ور۔ ور پھر کر بلاوجہ کے رونے روتی، پر جوانی سے بڑھاپے تک اپنے مقام سے نیچے نہ آئی۔ شاید میری۔ یہ ہی غلطی ہے۔" وہ نباح سے ہاتھ چھڑا کر کچن سے باہر جانے لگیں، کچھ سوچ کر رکیں اور نگار کے سر پر کھڑے ہو کر افسردگی سے بولیں،

اماں جی!! سنیں تو" نگار پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئیں پر وہ تیزی سے دوپٹہ منہ پر ڈال کر باہر کی طرف چل دیں۔

"خوشی کا ماحول کیسے لمحے میں غم میں بدل گیا" نگار نے ایک آہ بھری اور نمناک نظروں سے بیٹیوں کو دیکھا۔ تینوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا، نگار کے کہنے کا وہ مطلب ہرگز نہ تھا، پر بات تو پکڑ میں آ گئی تھی۔ سالوں کی خاموشی، اپنے نفس پر کی گئی سختی اور طویل تپسیا جیسے اس ایک لمحہ میں بھنگ ہوگئی۔ صبا اور نباح نے بڑھ کر ماں کو چمٹا لیا۔ وہ ایک دم رونے لگیں۔

نگار نے جب شوہر کو سعدی کے رشتے کے بارے میں خوشی خوشی بتایا تو امید علی نے بھی اس پر خوشی کا اظہار کیا، ان کا محلے کی مسجد میں اکثر ہادی اور سعدی سے سامنا ہوتا تھا، دونوں بھائیوں کی شرافت اور نیک اطوار ان کے خاندانی ہونے کی کھلی دلیل تھے۔

امید علی نے بیوی کو نیم رضامندی دے دی، نگار کو یہ ہی صحیح وقت لگا، اس نے بڑے سبھاؤ سے شوہر کو ثمرین کی فیملی کے لیے ساس کی ناپسندیدگی کی بابت دبی زبان میں بتا دیا۔ مدبر علی بیٹے تھے اپنی ماں کی فطرت اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ ان کو اس معاملے کو بڑی تکنیک سے حل کرنا تھا۔ ورنہ بات بگڑ سکتی تھی۔

ابھی اس بارے میں اماں سے کوئی بھی ذکر نہ کیا جائے۔ میں خود خالہ فیروزہ کے جانے کے بعد اکیلے میں اماں کو منا لوں گا" کچھ سوچ کر انہوں نے نگار کو تاکید کی، ان کا خیال تھا، ہفتہ، ڈیڑھ ہفتہ میں جب خالہ اپنے گھر روانہ ہو جائیں گی تو ہی کوئی بات ہو سکے گی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی غیر کے سامنے گھر کا یہ اہم مسئلہ اٹھایا جائے۔ نگار نے اس وقت شوہر کی بات سے مکمل اتفاق کیا۔

مگر اب اچانک جو یہ واقعہ ہوگیا، نگار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ الٹی ریل چلا کر زندگی کی فلم میں سے یہ سین کیسے نکال دے۔

☆......☆......☆

"اماں۔ اٹھیں۔ کھانا کھا لیں" امید علی نے نوالہ ماں کے منہ کے نزدیک کیا مگر انہوں نے منہ

پھیرلیا۔
"فیروزہ ان لوگوں سے کہہ دو، یہاں سے جائیں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے" وہ سہیلی سے مخاطب ہوئیں جو ان حالات میں چارپائی پر گوتم بت بنی سب کو دیکھے جارہی تھیں۔ ساس کے تیور دیکھ کر نگار کے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے لرز اٹھی۔ سرمد کو ماں پر ترس آیا۔ اس نے ماں کو کاندھے سے تھام کر سامنے رکھی کرسی پر بٹھادیا اور خود ٹرے تھام کر دادو کے پاس بیڈ پر جا بیٹھا۔ پورا گھر اٹین شن پوزیشن میں ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا، فیروزہ نے رشک سے یہ منظر دیکھا۔

"اماں ایسا نہ کریں۔ نگار بتا رہی تھی کہ آپ نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اب میں بھوکا سونے نہیں دوں گا۔ بس تھوڑا سا کھالیں" امید علی نے بڑی محبت سے ضد کی۔ پر انہوں خشمگیں نگاہوں سے بہو کو گھورا، امید علی نے ماں کی نگاہوں کا پیچھا کیا۔ نگار کا سر مزید جھک گیا۔ وہ کچھ سکڑ سی گئیں، زندگی میں پہلی بار امید علی کو اس عورت پر ترس آیا، جس نے ان کی شریک حیات ہونے کا حق اپنا دل مار کر ادا کیا۔ وہ ایک دم بیوی کی محبت میں سرتاپا غرق ہوگئے، کہ ماں کی محبت نے اپنی طرف کھینچا۔

"کیوں۔ پریشان کرتے ہو۔ فیروزہ کہہ دو ان سب سے مجھے بالکل بھوک نہیں۔ یہ لوگ یہاں سے جائیں۔ تو ہم سامان باندھیں، صبح نکلنا بھی ہے کہ نہیں" وہ سب کو نظر انداز کیے اپنی ہی کہے جارہی تھیں۔

امید علی کو ماں کی ضد سے زیادہ فیروزہ خالہ کی کمرے میں موجودگی تکلیف دے رہی تھی، ان کی وجہ سے وہ کھل کر کوئی بات بھی نہیں کر پارہے تھے۔ فیروزہ الگ عزیزالنساء کے اچانک رحیم یار خان جانے کی ضد پر بوکھلا اٹھیں، کس منہ سے منع کرتیں۔ وہ تو یہاں دس بار آکر رہ چکی تھیں۔ اب۔ سہیلی نے پہلی بار ساتھ چلنے کا کہا تو کیسے انکار کرتیں۔

امید علی کو نگار نے جیسے ہی فون پر گھر میں ہونے والے فساد کا بتایا، وہ آفس سے جلدی چھٹی لے کر فوری طور پر گھر پہنچے۔ ماں بغیر کھائے پیے کمرہ بند کیے پڑی تھیں۔ سارا گھر اپنی کوششوں میں ناکام ثابت ہوا۔ اس بار تو حد ہی ہوگئی۔ انہوں نے سرمد کی بھی نہ سنی۔

امید علی نے بڑی مشکلوں سے اپنی قسمیں دے کر زبردستی دروازہ کھلوایا۔ ماں کو اپنے کمرے میں لے جاکر سعدی کے رشتے کی پوری بات بتائی۔ یہ بات سنتے ہی وہ تو جیسے توے پر جا بیٹھیں، وہم و گمان میں بھی نہ تھا، بات اتنی بڑی نکلے گی۔

"واہ بیٹا واہ۔ تم لوگوں نے تو مجھے غیر کرنے میں ایک منٹ نہ لگایا۔ امید علی کم از کم مجھے تجھ سے یہ امید نہ تھی۔ بہو تو ہوتی ہی غیر ہے، پر میرا تو بیٹا بھی پرایا نکلا۔ وہ جو مجھ سے اپنی ہر چھوٹی سی چھوٹی بات شیئر کرتا تھا۔ آج، اتنی بڑی بات چھپانے لگا ہے۔ یا اللہ ایسا دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی" عزیزالنساء واویلا کرنے لگیں۔ کسی طرح قابو میں آ ہی نہیں پارہی تھیں۔

"اماں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے مصلحتاً یہ بات چھپائی تھی۔" امید علی نے فیروزہ کو بیٹھا دیکھا تو دبی زبان میں بولے۔ فیروزہ بھی ان لوگوں کے اتنے ذاتی معاملے میں دلچسپی نہیں لینا چاہ رہی تھی، لیکن عزیزالنساء صرف ان سے ہی بات کررہی تھیں۔ ایسے میں ان کا یوں اٹھ کر باہر نکل جانا، غلط ہوجاتا۔

"بس بیٹا رہنے دے۔ رشتہ بھی کون سا...... ثمرین کے دیور کا۔ یہ ہی کمی رہ گئی تھی۔ جس نے

تیری ماں کی بے عزتی کی تو اس سے رشتے داری کرنے کھڑا ہے۔کیا میری دو ٹکے کی بھی عزت نہیں؟بس تم وہاں انکار کردو" انہوں نے ہمیشہ کی طرح احکام جاری کیے۔اس بار امید علی سر ہلا کر تائید کرنے کی جگہ تذبذب میں پڑ گئے۔

"اماں۔اتنا اچھا رشتہ ہے۔لڑکا سوفٹ ویئر انجینئر ہے۔ابھی اس نے ایک بڑے کمرشل ایریے میں اپنا نیا سوفٹ ویئر ہاؤس قائم کیا ہے۔مجھے اس کا مستقبل بہت روشن نظر آرہا ہے۔شکل وصورت کا بھی اچھا ہے،خاندان میں بھی کوئی برائی نہیں۔نباح آپ کی پوتی ہے۔اتنے اچھے رشتے سے یوں انکار؟ اماں میرا دل نہیں مانتا" امید علی نے اپنے طور پر ساری مثبت باتیں رکھیں مگر ان کی منفی سوچیں۔

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔تیرے لیے اب مجھ سے بڑھ کر ساری باتیں ہو گئیں۔چل فیروزہ اپنے گھر لے چل۔اب تیری دوست کا دل یہاں نہیں لگے گا۔"عزیز النساء نے پاندان ایک طرف سرکا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا،جیسے اسی وقت ٹرین میں سوار ہونے جارہی ہوں۔امید علی نے سر تھام لیا۔ ماں خود بچہ بنی جارہی تھیں تو بچہ کس کے پاس فریاد لے کر جاتا۔۔اب فیروزہ خالہ کے ساتھ جانے کی نئی ضد شروع کردی۔نباح اور صبا نے دکھی دل سے یہ سارا تماشا دیکھا۔امید علی کو ماں کی نازک مزاجی کا اچھی طرح سے پتا تھا۔ان کا کہیں اور گزارہ مشکل ہوجائے گا۔اسی وجہ سے وہ جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے،پر عزیز النساء تو جیسے سر پر سامان کی گٹھری دھرے جانے کو تیار کھڑی تھیں......سرمد نے حالات کا بغور جائزہ لیا۔وہ دادو کی کیفیت اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا،اس نے مسئلہ حل کرنے کی ٹھانی۔

"بابا!دادو کو جانے دیں۔ان کے لیے تھوڑی تبدیلی آب وہوا کی ضرورت ہے۔اچھا ہے دوست کے گھر دو چار دن جانے سے بہل جائیں گی"۔سرمد نے کچھ سوچتے ہوئے باپ کو منایا۔فہد نے بھی چھوٹے بھائی کی تائید کی تو امید علی بمشکل راضی ہوئے۔

ایک غلطی امید علی سے ہوئی تو تھی۔انہوں نے ماں کی ہر صحیح اور غلط بات پر سر جھکایا۔گھر والوں کو بھی یہی تاکید کی گئی کہ ان کو کبھی "انکار نہ کیا جائے"۔اب جب کہ ان کا مزاج ایک خاص طرز پر ڈھل گیا۔"ہاں" سننے کی عادت ایسی پختہ ہوگئی کہ اب بیٹے کی "نہ" ان کی برداشت سے باہر ہوئے جارہی تھی۔

انسان کو کبھی کبھی 'نہ' سننے اور سہنے کی عادت ہونی چاہیے،ورنہ صرف 'ہاں' کے ستون پر زندگی کی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی۔

☆......☆......☆

"ہاں بھئی کیا ہوا۔کوئی خاص بات؟" ہادی سے بھائی کی ٹینشن زدہ صورت دیکھی نہ گئی تو انہوں کام میں مصروف بیوی سے خود ہی سوال کیا۔

"ارے ہونا کیا ہے۔اشعر کے کچھ نئے کپڑے لانے ہیں،گوشت بھی ختم ہوگیا ہے،رات میں اسٹو بنانا ہے تو مٹن بھی لیتے آیئے گا۔اور کچھ تازہ سبزی وغیرہ بھی لانی ہے،اس کے علاوہ تو کوئی خاص بات نہیں۔" وہ ڈسٹنگ کرتے ہوئے وہیں سے بولیں۔ ہادی نے فرمائشی پروگرام پر سر پیٹ لیا،چھٹی والے دن باہر نکلنا ایک عذاب لگتا تھا۔سعدی کا منہ مزید لٹک گیا۔

"شمو۔میں سبزی،گوشت کی بات نہیں کررہا ہوں" ہادی چاہ رہے تھے کہ وہ کام چھوڑ کر ان کے پاس آرام سے آکر بیٹھیں تو سعدی کی بات کریں۔ثمرین پھرکی بنی کچن اور ٹی وی لاؤنج کے چکر لگانے میں مصروف تھیں،ذرا سا اندر آئیں تو

ہادی نے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھالیا وہ ایک دم ہنستے ہوئے عدی کی طرف پلٹیں۔

''جی، جیسیں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ مذاق کر رہی تھی۔ صاحب زادے دل چھوٹا نہ کرو، ایسے کاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لڑکی والے ایک دم سے جواب نہیں دیتے۔ امی کے محلے میں تو ایک جگہ سے جواب آنے میں پورا ایک سال لگا، پر لڑکے کی لگن سچی تھی تو وہ انتظار کرتا رہا'' بھابی کی بات پر سعدی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''ایک......سال۔اف کیسے ظالم لوگ تھے'' دونوں بھائی ایک ساتھ چیخے تو وہ ایک دم اچھل پڑیں۔

''سوری! میں نے غلطی سے ایک سال بول دیا۔ ان لوگوں نے پورے ایک مہینے بعد ہاں کی تھی'' ثمرین نے آنکھیں پٹپٹا کر کہا تو وہ لوگ اس کی شرارت کو سمجھے۔ سعدی نے اٹھ کر بھابی کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ شوہر نے آنکھیں دکھادیں۔ تو وہ سنجیدہ ہوئیں۔

''نگار آپا نے کہا ہے کہ وہ صلح مشورہ کر کے جواب دیں گی۔ ویسے ان کو سعدی پسند ہے۔ لڑکی والے ہیں اپنے طریقے سے چھان بین کرنا، ان کا حق بنتا ہے۔ اب تم اپنے نئے بزنس پر توجہ دو، جو ہوگا اچھا ہی ہوگا'' ثمرین نے پیار سے دیور کو تسلی دی تو اس کے بے چین دل کو کچھ قرار آیا۔ ہادی نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں بھائی کو تسلی دی۔

''نباح کے گھر والے جواب دینے میں بھلے کتنے ہی دن لگائیں۔ بس انکار نہیں ہونا چاہیے ،ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا'' سعدی نے سوچا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ہادی کی پُر سوچ نگاہیں بھائی پر جم گئی۔ انہوں نے اکیلے میں امید علی سے بات کرنے کے بارے میں سوچا اور مطمئن ہو گئے۔ پوری امید تو تھی کہ وہ بھائی کی خوشیوں کے لیے انہیں منا ہی لیں گے۔

☆......☆......☆

''او میرے اللہ! یہ کمرہ ہے تیرا۔ اتنا چھوٹا سا۔ ہمارا یہاں گزارہ کیسے ہوگا'' عزیز النساء کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔ پہلا جھٹکا انہیں اس وقت لگا جب ان دونوں کہ یوں اچانک بغیر اطلاع کے پہنچنے پر فیروزہ کی بہوؤں نے منہ بنا کر استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ ساس کو چار باتیں بھی سنائیں کہ مہمان کو ساتھ لانے سے قبل خبر تو کر دیتیں۔ فیروزہ بغیر کوئی جواب دیے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''عزیز! تو شہر میں کرتی ہوں کوئی انتظام'' فیروزہ کی تسلی بھی کھوکھلی سی لگی۔ انہوں نے ایک کونے میں ان کا اور اپنا سامان رکھا۔ تیزی سے اندر کی طرف چل دیں۔

'میں سب سے لڑ کر اتنے زعم میں سہیلی کے ساتھ نکل تو پڑی، مگر یہاں تو ایک گھنٹہ گزارنا بھی دشوار لگ رہا ہے، ایک ہفتہ کیسے گزرے گا؟' گندے سندے سے بے ترتیب کمرے میں کھڑے کھڑے، ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ سنگل بیڈ پر چیکٹ سی لٹکتی چادر، دیوار سے لگا پرانا میل زدہ صوفہ سیٹ جس پر تیل کے داغ بتاتے تھے کہ اسے بطور ڈائننگ ٹیبل بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

شاید کسی بچے نے دال چاول کھا کر پلیٹ وہیں پر لڑھکا دی تھی اس پر چیونٹیوں کے گچھے کے گچھے جمع ہو چکے تھے۔ حالت بتاتی تھی کہ جب سے فیروزہ یہاں گئیں۔ اس کمرے میں نہ جھاڑو دی گئی، نہ ہی ڈسٹنگ ہوئی، اسی لیے ہر شے پر گرد و غبار کا راج تھا ۔بیچوں بیچ الٹا ہوا نشان زدہ پیک دان، اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

عزیز النساء نے لاشعوری طور پر اس کا اپنے کمرے سے موازنہ کیا۔صاف ستھرا کھلا کھلا، جس کی ہر چیز آسمانی رنگ کی تھی، یہ ان کا پسندیدہ رنگ تھا۔نباح اور صبا۔ کتنے سلیقے سے ان کی ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر جما کر رکھتیں۔ کمرے کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی یاد بھی ستائی

ایک دم جی الٹنے لگا۔ زور کا ٹھسکا لگا۔

فیروزہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں لال شربت کا ایک گلاس تھا۔ گرم پانی میں گھولے گئے شربت نے منہ کا مزہ اور خراب کر دیا۔ فیروزہ مجرموں کی طرح کھڑی تھیں۔

''میں نے پوتی کا کمرہ خالی کروا دیا ہے، وہ اس سے کافی بہتر ہے، تم وہاں رہنا'' فیروزہ نے جلدی سے ان کا بیگ سمیٹا اور باہر کی طرف چل دیں۔ انہوں نے ساتھ دیا۔ بڑا سا صحن عبور کیا تو خود کو پہلے کے مقابلے میں قدرے بہتر کمرے میں پایا تو اطمینان کا سانس لیا، جیسے ہی بستر پر بیٹھیں، عجیب سی بُو نے استقبال کیا، پتا چلا یہاں بڑی بہن کے ساتھ سب سے چھوٹا بچہ بھی سلایا جاتا تھا، جس کو سوتے میں بستر گیلا کرنے کی عادت تھی۔ ان کی شروع سے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادت پختہ تھی، وہ پاکی ناپاکی کا بہت دھیان رکھتیں۔ جب تک پوتا پوتی چھوٹے رہے نگار کو خاص تاکید تھی کہ ان کے بستر پر گندگی نہ پھیلا سکیں۔ ایک نئی مشکل......

عزیز النساء کو کراہیت سی محسوس ہوئی ایک دم کھڑی ہو کر سامنے رکھی کرسی پر جم گئیں۔ فیروزہ کو ایک نئے امتحان کا سامنا کرنا پڑا۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ ایک بار پھر بہوؤں کی منتیں کرنے اندر کی طرف چل دیں۔

''ایک تو یہ اماں...... ان کے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔'' ان کی بڑی بہو سکینہ کی پاٹ دار آواز دونوں کے کانوں میں پڑی۔

''لو بھلا بتاؤ۔ بھابی آپ نے اپنی بچی کا کمرہ دے دیا، پھر بھی خوش نہیں ہو رہیں'' منجھلی والی ثروت کا کام ہی آگ لگانا تھا، اس نے تیلی دکھائی۔ فیروزہ نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیے، جہاں سے یہ کمنٹری ڈائریکٹ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یوں بن گئیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ عزیز النساء کا خون کھول اٹھا، پر پرائے گھر میں کیا بولتیں، ہاں ان کا اپنا گھر ہوتا تو بتاتی، پر وہاں کس میں بھلا اتنی جرات تھی۔

''یہ لو اماں یہاں بچھا دوں اور ایک ساتھ ہی جو حکم جاری کرنا ہے کر دو، تیری بہوویں بے فضول میں ہمیں باتیں سنا رہی ہیں'' لمبے قد کا دبلا پتلا سا راجہ سر پر پلنگ اور بغل میں ایک بستر دابے، بے زاری سے کھڑا بول رہا تھا۔

''یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا، راجہ عارف ہے۔ خالہ کو سلام تو کر۔'' فیروزہ نے بیٹے کو آنکھیں دکھاتے ہوئے تعارف کروایا۔ عزیز النساء نے سر ہلایا۔

''اسلام وعلیکم خالہ!'' اس نے جلدی سے بستر بچھاتے ہوئے سلام داغا اور جمائی لیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اب بستر قدرے صاف ستھرا تھا، عزیز النساء بے انتہا تھک چکی تھیں، کافی سالوں بعد اتنا طویل سفر کیا، اس پر ایسا بھدا استقبال...... ان کا تھکن سے جسم چور چور ہو گیا تھا۔ نہا کر جو لیٹیں تو آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر اماں جی اس رشتے پر اتنی خفا ہیں تو میں ثمرین کو انکار کہلوا دیتی ہوں۔ بلا وجہ کسی کو آسرے میں رکھنا مناسب نہیں'' نگار نے امید علی کی اداسی محسوس کی، اسی لیے کچھ سوچ کر

بولنے لگی۔ وہ سب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے، عزیز النساء کو گئے ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا، لیکن وہ سب یوں منہ لٹکائے بیٹھے تھے، جیسے ایک سال گزر گیا ہو۔ ماں کی بات پر نجاح کا دل دھڑکا۔ ایسا لگا جیسے جسم سے جان نکلنے لگی ہو۔ صبا بہن سے لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی بابا کا منہ تکنے لگی۔

"اماں اتنی جلدی نہ مچائیں، سعدی اچھا لڑکا ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ایسے انکار کرنا ٹھیک نہیں ہوگا" فہد نے میز پر پاؤں پھیلا کر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہوں فہد کی بات ٹھیک ہے۔ ابھی منع مت کرو۔ اماں آجائیں تو میں ایک بار پھر ان کو سمجھاؤں گا" امید علی جو بیوی کی بات پر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے تھے، ایک دم صحیح فیصلے تک پہنچ گئے۔ نجاح کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی، صبا نے بہن کو وکٹری کا نشان دکھایا تو اس کے چہرے کی پیاری سی مسکان لوٹ آئی۔ سرمد نے چونک کر بڑی بہن کی طرف دیکھا، کئی رنگ جھلملاتے دکھائی دیے۔

"اوہ تو آپی بھی اس رشتے سے خوش ہیں" اس نے درست تجزیہ کیا۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک اچھا رشتہ ہے۔ دادو کو وقتی غصہ ہے، مجھے پتا ہے کہ وہاں ان کی زرا نہیں بن پائے گی۔ میں کل انہیں لینے جا رہا ہوں" سرمد نے کھڑے ہو کر فیصلہ سنایا تو امید علی نے پیار سے اپنے جوان بیٹے کو دیکھا۔ جوان کے دل کی بات فوراً سمجھ گیا۔ اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

"بس بہن کھا لیا دراصل تھک گئی ہوں نہ تو بھوک نہیں لگ رہی ہے" عزیز النساء نے بے رغبتی سے پلیٹ سرکا دی۔ ڈھب ڈھب شوربے میں تیرتے آلو کے قتلے اور چھوٹے کے گوشت کی بوٹیاں، چنگیر میں دھری تندور کی روٹیاں، جو کڑک ہو جانے کی وجہ سے ان سے چبائی نہیں جا رہی تھیں، اس پر ستم بے ذائقہ سالن۔ دو نوالے کھا کر ہی انہوں نے ہاتھ روک لیے۔

"اے بہن انڈے کا آملیٹ بنوا دوں" فیروزہ بغیر منہ بنائے مزے سے کھانا کھا رہی تھیں، دوست کو یوں بیٹھے دیکھا تو ہاتھ روک کر پوچھنے لگی۔

"نہیں بس کھا لیا۔ اب دل نہیں چاہ رہا" وہ سوچ میں کھو گئیں، نگاران کو بھاپ نکلتی روٹی پکا کر دیتی تھی، اس پر بھی وہ اسے چار باتیں سنانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ کل سے وہ اسی قسم کے کھانے کھا کھا کر پریشان تھیں۔ وضع دار تھیں، دوست سے شکوہ نہ کیا، فیروزہ کر بھی کیا سکتی تھیں، اُن کی تو خود نہیں چلتی تھی۔ پل پل میں بہوویں مٹی پلید کرتیں۔ وہ تو جانے کیوں عزیز النساء کا لحاظ کر جاتیں۔ شاید ان کی شخصیت کا رعب داب یا پیسے کی جھلک تھی۔ اسی لیے ان سے تھوڑا اخلاق برت رہی تھیں۔ مگر ساس کے لیے ان کے پاس کوئی رعایت نہ تھی۔ بیٹے تک ماں سے سیدھے منہ بات نہ کرتے۔ فیروزہ خود ہی پورے گھر کے آگے پیچھے ہوئی جاتیں۔ عزیز النساء کی حیرانی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

فیروزہ نے ان سے "میرا، گھر میری جنت" کے بارے میں جتنی باتیں کیں۔ سب غلط بیانی پر مبنی نکلیں۔ وہ یہاں تو دوزخ کا نمونہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا نشہ دو دن میں ہی ہرن ہو گیا۔ دوست کا بھرم قائم رکھنا ضروری تھا، اسی لیے اپنے مزاج کے برخلاف برداشت کیے چلی جا رہی تھیں۔

"دادو! کیسی ہیں؟ وہ خیالوں میں گم تھیں کہ سرمد کی آواز سنائی دی، دل ایک دم ہمکا۔ راجہ کی راہنمائی میں وہ کمرے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا، عزیز النساء اترے چہرے کے ساتھ کمزور دکھائی

دیں۔

''میرا بچہ میری جان! تُو آ گیا'' وہ چونکیں۔ حقیقت میں ان کا لمبا چوڑا، اسمارٹ سا پوتا سر جھکائے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ بے قراری سے کھڑی ہوئیں اور اس کے گلے سے لگ گئیں۔ فیروزہ نے بھی سرمد کو دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔

''بس میں لینے آ گیا ہوں۔ جلدی سامان باندھیں، خود تو مزے سے کھانا اڑا رہی ہیں۔ اس پاپی پیٹ میں دو دن سے کچھ نہیں گیا'' سرمد نے کمرے کی حالت زار دیکھی۔ کافی باتیں بن کہے جان گیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ فیروزہ کہیں ناراض نہ ہو جائے'' انہوں نے جھجکتے ہوئے دوست کو دیکھا، پر ان کی آنکھوں کی بے چارگی پر دل بھر آیا۔ دو دن میں ان کی مجبوریوں کی داستان کھل کر سامنے آ گئی۔

''نہیں۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ اب جبکہ پوتا آ گیا ہے تو چلی جاؤ'' فیروزہ نے متانت سے جواب دیا تو وہ مسکرا دیں۔

''راجہ! ابھی بچے کو لے جا کر چائے وائے پلواؤ، پھر مجھے کچھ سامان لا دینا، آج میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن اور پوتے کے لیے کھانا پکاؤں گی'' فیروزہ نے اپنی بہوؤں کے رویے کا کچھ ازالہ کرنا چاہا تو چھوٹے اور کنوارے بیٹے کو ہدایت دی، اب بس اسی پر زور چلتا تھا۔ وہ ماں کے دکھوں سے آشنا تھا، سعادت مندی سے سر ہلاتا، سرمد کا بیگ تھام کر اسے اپنے کمرے کی طرف لے چلا۔

''ایک بات پوچھوں؟ اتنا کچھ سہنے کے باوجود تُو نے ہمیشہ اپنے گھر والوں کی تعریفیں ہی کیں، مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی'' عزیز النساء نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''بہن یہ سب جیسے بھی ہیں میری اولاد ہی ہیں نہ تو میں کیوں ان لوگوں کی برائیاں کر کے اپنا بھرم کھو دیتی۔'' اپنے بچوں کو یوں برا بھلا کہہ کر مجھے کیا مل جاتا، لوگوں کی وقتی ہمدردی بس۔ مگر وہ جو ساری عمر کا صبر و شکر تھا وہ چلا جاتا'' فیروزہ نے آنسو دوپٹے میں چھپائے۔

''فیروزہ کیا ان اولادوں کے رویے پر تیرا دل نہیں دکھتا، جن کے لیے تُو نے اپنی جوانی برباد کر دی'' عزیز النساء نے غصے میں باہر کی طرف اشارہ کیا، جہاں ان کا بڑا بیٹا راجہ شاہد اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق میں مگن تھا۔

''عزیز تُو تو جانتی ہے۔ بیوہ ہو جانے کے بعد مجھے کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی مشکلیں سہنے کے بعد آخر ان کو پال پوس کر بڑا کیا۔ میں اس بات کو احسان نہیں سمجھتی۔ اپنا فرض ادا کیا۔ اب جو تھوڑی سی عمر بچی ہے۔ عزت سے گزارنا چاہتی ہوں یوں ہی گناہوں میں پڑ کر ساری عمر کی ریاضت کو اپنے ہاتھوں سے پھونکنے کی روادار نہیں۔۔ نہ بہن مجھ سے یہ نہ ہو گا۔''

عزیز النساء نے فیروزہ کی بھیگی پلکوں کو دیکھا، چہرے پر ایک نور سا پھیلا ہوا تھا۔ ان کی نگاہیں دوست کی عظمت کے آگے جھک گئیں۔

عزیز النساء نے اس چھت تلے گزارے جانے والے لمحوں سے صبر و قناعت کے وہ سبق سیکھے جو ساری عمر گزارنے پر بھی ان کو حاصل نہ ہو پائے تھے۔ انہیں اپنے آپ سے الگ شرمندگی محسوس ہوئی، وہ جو ہمیشہ بیٹے اور بہو سے نالاں رہیں، مگر وہ کتنے فرمانبردار نکلے، ان کا دل فوراً گھر جانے کو مچل اٹھا۔

☆......☆......☆

"فیروزہ دادی آپ سمجھ گئیں نا" سرمد ان کے پاس تخت پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے سرگوشی کرنے لگا، انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ان کی تینوں بہوؤں کو عزیز النساء کے جانے کا سن کر شرم آ گئی۔ فیروزہ کو باہر نکال کر اب وہ کچن میں کسی دعوت کا اہتمام کر رہی تھیں۔ عزیز النساء نے نہا دھو کر دوسرے کپڑے پہنے، اب وہ بال سلجھاتی اس طرف چلی آئیں، سرمد کے اشارے پر فیروزہ نے انہیں آواز دے کر اپنے قریب بلالیا۔ راجہ عارف، سرمد کو باہر کی سیر کرانے لے گیا۔

"میں کہتی ہوں ایک دو دن اور رک جاتی" فیروزہ نے عزیز النساء کے لیے اپنے قریب جگہ بنائی اور بولیں۔

"نہیں فیروزہ!! رمضان شروع ہو رہے ہیں۔ میرے بچوں کے حلق سے تو میرے بغیر افطاری نہیں اترے گی، میں بھی یہ مبارک ساعتیں اپنے گھر میں گزاروں گی۔ پھر آؤں گی" ان کا لہجہ شیشے کی طرح شفاف تھا، یہاں رہنا کچھ اچھا تجربہ نہیں تھا، پر وہ یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر جا رہی تھیں۔ اب دھندلے منظر ایک دم صاف ہو چکے تھے۔

"بہن ایک بات کہنی تھی" وہ بال سلجھا کر لپیٹنے لگیں تو فیروزہ نے بات شروع کی۔

"اے لو تمہیں کب سے تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آنے لگی" عزیز النساء کا موڈ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا، مسکرا کر چھیڑا۔

"ڈرتی ہوں، چھوٹا منہ بڑی بات نہ ہو جائے، کہتے ہیں شیشہ ٹوٹنے کے بعد جڑ جاتا ہے، پر اس پر پڑنے والا بال نہیں جاتا۔ اس لیے میری بات پسند نہ آئے تو دل پر نہ لینا، صاف جواب دے دینا" ان کے انداز پر عزیز النساء کا دل گھبرایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اصل بات تو بتاؤ؟" انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"میں چاہ رہی تھی کہ ہماری دوستی رشتے داری میں بدل جائے، تم اپنی بڑی پوتی نباح کا رشتہ میرے راجہ عارف کے لیے قبول کر لو، ماشاءاللہ۔ اسکول ٹیچر ہے، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یقین کرو اسے اپنی بہو نہیں بیٹی بنا کر رکھوں گی" فیروزہ نے ساری بات یوں بتائی، جیسے لمبے سفر سے آئی ہو، ایک دم ہانپنے لگی، وہ بغور عزیز النساء کے چہرے پر اڑتے ہوئے رنگوں سے دل ہی دل میں لطف لے رہی تھیں۔

"بہن میں ایسے کیسے؟ ایک دم اس بات کا جواب دے دوں" عزیز النساء کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں، عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئیں، دوست کا دل توڑنا نہیں چاہ رہی تھیں، پر آنکھ بند کر کے نباح اور راجہ عارف کو دیکھا تو دونوں کا کوئی جوڑ نظر نہ آیا۔ تیل زدہ بالوں والا تمیں سالہ لمبا سوکھا، قدرے سانولا سا اکھڑ مزاج والا راجہ عارف اور کہاں ان کی بائیس سالہ چھوٹی موٹی سی نازک اندام پوتی...... یہ تو اس کے ساتھ ایک ظلم ہوتا، ایک دم چھم سے اپنی شاندار شخصیت کے ساتھ سعدی نگاہوں میں آ گیا۔ دل کو سکون حاصل ہوا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ فیروزہ کی منتظر نگاہیں، ان پر ہی ٹکی تھیں۔

"اے بہن تمہارے بیٹے میں کوئی کمی نہیں پر وہ نباح کا رشتہ تو سعدی سے طے ہونے جا رہا ہے۔ بہت ہی اچھا بچہ ہے۔ میری پوتی کو ہمیشہ خوش رکھے گا" عزیز النساء کو بروقت سوجھی اور خود کو شاباش پیش کی۔

"ہاں لیکن تم کو تو اس رشتے پر بڑا اعتراض تھا۔" انہوں نے پان پر تازہ کتھا لگاتے ہوئے بے فکری سے پوچھا۔

"ارے نہیں وہ تو بس ایسے ہی غصہ آگیا تھا ورنہ قسمت کی پہلی دستک پر دروازہ کھول دینا چاہیے، نہ بھئی میں یہ کفران نعمت نہیں کر سکتی، بہن برا مت ماننا۔ دیکھنا تمہارے راجہ کو کوئی رانی ہی ملے گی" انہوں نے پان منہ میں دباتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے کہا، پھر دوست کا ہاتھ تھام کر دلاسا دینا ضروری سمجھا۔ تو فیروزہ نے بظاہر افسردگی سے سر ہلایا، پر دل ہی دل میں مسکرادی۔

"دیکھو میں جا رہی ہوں۔ اب یوں اداس نہ ہو نا" عزیز النساء نے دوست کے خود سے لگا کر چونچلا کیا۔

"کوئی بات نہیں تمہیں انکار کا حق ہے" فیروزہ نے سہیلی کو گرمجوشی سے بھینچ کر کہا تو ان کے دل کا بوجھ اتر گیا۔

"واہ بیٹا سرمد کیسے مجھے شامل کر کے، اپنی دادو کی سوچوں کا رخ پھیرا۔ میں تجھے مان گئی" فیروزہ دل ہی دل میں سرمد کی بلائیں لینے لگیں۔

☆......☆......☆

"مبارک ہو بھئی پہلا روزہ۔ تمہارے لیے خوشیوں کی برسات لے کر آیا ہے۔" سعدی جو عصر کی نماز پڑھ کر بہت اداس سا منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوا، بھابی کی چہکتی آواز پر اچھل پڑا۔ ان کے منہ سے مزید کچھ سننے کو بے تاب ہوا پر وہ پکوڑوں کے لیے بیسن گھولنے میں مصروف ہوگئیں۔ کچھ لینے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ بھابی کی اندر باہر کی دوڑ شروع ہوگئی۔ اب معقول جواب کی امید نہ تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اشعر سے اشارے سے پوچھنے لگا۔ وہ سفید کڑ کتے کرتا شلوار میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"چاچو سنیں۔ نباح آپی اب اشعر کی چاچی بنیں گی۔ ابھی مما پاپا کو بتا رہی تھیں" اشعر نے ہمیشہ کی طرح وفاداری نبھائی، ماں سے نظر بچا کر کان میں گھس کر سرگوشی کی تو اس کی تشکرانہ نگاہیں آسمان سے جا ٹکرائیں۔

"میرے مالک بے شک تُو بڑا مہربان ہے۔ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔" سعدی کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ جانے اس کا دل آج صبح سے کیوں بہت اداس تھا۔ روزے میں اس نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعائیں مانگیں، شاید نباح کے لیے اس کی لگن سچی تھی۔ یا محبت کے لیے اس کا اختیار کیا سیدھا راستہ، اس کی سچائی کی دلیل بن گیا، اس کی سن لی گئی۔

"ثمو پلیز ایک جگہ ٹک کر بیٹھو اور صاحبزادے کو خوش خبری تو سنا دو" ہادی کو ہمیشہ سے بیوی کی سسپنس پھیلانے والی عادت سے کوفت ہوتی تھی، اس نے پھرکی کی طرح سے کچن سے صحن تک اندر باہر کرنے پر اسے ٹوک ہی دیا۔

"کیا کروں پہلا روزہ ہے۔ آپ سب کو ٹیبل پر ہر چیز بھی تیار چاہیے۔ اب وہ سب دیکھوں یہ باتیں بھگاروں" ثمرین جواب تیزی سے فروٹ کاٹ رہی تھیں۔ تھوڑا جھنجلا کر بولی پر شوہر کا منہ بنتا دیکھ کر اپنا لہجہ دھیما کرنا پڑا۔

"کچھ خاص بات نہیں بس وہ نباح کی دادی کی واپسی ہو چکی ہے۔ گھر میں صلاح و مشورے ہونے کے بعد اب انہوں نے 'ہاں' کردی ہے۔ بس وہ عزیز النساء خالہ رسمی طور پر تم سے مل کر اپنی تسلی کرنا چاہتی ہیں۔ کل نگار نے ہم سب کو افطار کی دعوت دی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ تم دونوں کی باقاعدہ رسم عید کے بعد دھوم دھام سے کی جائے" ثمرین نے بہت عام سے انداز میں خاص باتیں بتائیں۔ سعدی کا دل بھنگڑا ڈالنے کو بے قرار ہوا پر روزے کا احترام ضروری تھا۔ نباح کی شرمائی ہوئی صورت نگاہوں

میں کیا گھومی، ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکان چھا گئی۔

''جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ عزیز النساء خالہ کو بھی ماننا ہی پڑا'' ثمرین نے زور سے خود کلامی کی تو ہادی اور سعدی نے ایک دوسرے کو ایک دم سے دیکھا اور مسکرا دیے۔ اشعر اپنے چاچو سے لپٹ گیا۔

☆......☆......☆

''دادو! یہ آپ کی نماز کا سفید دوپٹہ میں نے دھو کر نیل لگا دی ہے'' عزیز النساء روزہ کھول کر اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں کہ نباح ہاتھوں میں ان کے ململ کا دوپٹہ تھامے داخل ہوئی۔

''میرا بچہ رہنے دیتی ماسی دھو دیتی۔ ویسے ہی تم لوگ افطاری کی تیاری میں پورے دن سے لگی ہوئی تھیں، میں امید علی سے کہوں گی، بس کل سے ایک آدھ چیز پکائی جائے۔ اتنی تلی ہوئی مرچ مسالے کی اشیاء بنا دی جاتی ہیں، عام دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پیٹ بھر کر کھا لیا جاتا ہے، بھلا بتاؤ روزے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ معدے کو الگ مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تبھی کل سے مغرب میں فروٹ چاٹ بنا لیا کرو اور نماز کے بعد سادہ کھانا کھا لیا کریں گے، عبادت کا مہینہ ہے۔ عبادت تو کرو، باورچی خانے کا کام تو سارا سال چلتا ہی رہتا ہے'' نباح کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

'یہ دادو کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے یہ کیا کیا کہہ دیا؟ ماسی سے اپنے کپڑے دھلوانے پر وہ کتنا نالاں رہتی تھیں۔ پورے رمضان کئی قسم کے پکوان دسترخوان کی زینت بنانے کی ان کی ضد کے آگے سب سر جھکاتے آئے تھے، ورنہ نگار تو سادہ کھانا پکانے کے حق میں تھیں۔'' نباح کی بے یقین نگاہوں نے انہیں شرمندگی میں مبتلا کر دیا۔

''نباح بچے! ذرا یہاں تو آؤ ایک بات پوچھنی ہے'' انہوں نے پوتی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔ وہ ایک دم چونکی۔ وہ آج کل کتنی پیاری ہو رہی تھی۔ چہرے کی دلکشی، دل میں امڈتی خوشیوں کا پتا بتا رہی تھی۔ پھر بھی اپنا فرض سمجھتے ہوئے انہوں نے بات کرنے کی ٹھانی۔

''جی دادو پوچھیے۔'' وہ ایک دم گھبرا گئی، سر پر رکھا گلابی دوپٹہ ٹھیک کیا، مومی انگلیوں کو آپس میں مسلتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''یہ بتا کہ تُو سعدی کے رشتے پر خوش ہے نا؟ اس سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا۔ وہ بہت اچھا اور سمجھدار لڑکا ہے۔ تجھ سے پوچھے بغیر ہاں کر دی ہے کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ وہ تجھے بہت خوش رکھے گا'' عزیز النساء نے پوتی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا، جس کے گالوں پر قوس وقزح کے ساتوں رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ نباح نے شرما کر سر ہلا دیا اور جلدی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

عزیز النساء کے چہرے پر طمانیت سی پھیل گئی۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹیں تو سکون کی لہریں ان کے اندر جیسے سمائی چلی گئیں، پتھر بھی اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔ وہ تو پھر باشعور انسان تھیں۔ اپنے گھر اور ان سے منسلک رشتوں کی اہمیت کا اندازہ انہیں فیروزہ کے گھر گزارے جانے والے تین چار دنوں میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ چار دن صدیوں کی طرح لگے۔ ان کی آنکھیں نیند سے بند ہوتی چلی گئیں۔

گھر اینٹوں سے نہیں بنتا بلکہ رشتوں سے مربوط ہوتا ہے۔ یہ رشتے جڑنے کے بعد ہی ایک مضبوط عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا جیسے مکان کے پورے ڈھانچے کو زمین بوس کرنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ گھروں کو وہاں رہنے والوں کی چہکار اور قہقہے ہی توانائی بخشتے ہیں۔

☆☆......☆☆

خواہشوں، امیدوں اور ہر پل رنگ بدلتی زندگی سے آباد، ناول کی اٹھارہویں قسط

خلاصہ

رفیق احمد اور نفیس احمد دو بھائی ہیں جن کے درمیان بہت محبت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ رفیق احمد کے دو بچے عرفان اور زرقون ہیں، جبکہ نفیس احمد کے دو بیٹے احمر، فراز اور ایک بیٹی مریم ہے۔ مریم ایک سلیقہ شعار اور درمیانی صورت و شکل کی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مریم کی منگنی عرفان سے ہوگئی ہے۔ عرفان سے مریم بے انتہا محبت کرتی ہے، جبکہ زرقون، جو بے حد خوب صورت، خوش اخلاق اور زندہ دل لڑکی ہے، یونیورسٹی سے ماسٹر کررہی ہے۔ اس کا رشتہ اپنا تایازاد فراز کے ساتھ طے ہے۔ فراز اور زرقون ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ رفیق احمد کی بیوی فہمیدہ بیگم ایک سلجھی ہوئی خدمت گزار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے میکے پر بے حد جان چھڑکتی ہیں۔ میکے میں اُن کی بھاوج رقیہ بیگم بے حد حسین عورت ہیں۔ رقیہ بیگم کو ہمیشہ سے اپنی نند، فہمیدہ بیگم سے حسد ہے کہ وہ کس قدر آسودہ اور پُر تعیش زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کے میاں انہیں کس قدر چاہتے ہیں لیکن وہ اپنا حسد کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔ حالات خراب ہونے کے باعث عرفان چند دن رقیہ بیگم کے گھر میں گزارتا ہے، جہاں وہ ثمینہ (جو اُس کی ماموں زاد ہے) کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مریم سے منگنی توڑ دیتا ہے۔ مریم کو منگنی ٹوٹنے کا گہرا صدمہ ہوتا ہے اور وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ ثمینہ سے شادی کے لیے فہمیدہ بیگم، بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے رفیق احمد کے دل میں بیوی کی طرف سے بال آجاتا ہے۔ فہمیدہ بیگم کو اُمید ہوتی ہے کہ اُن کی بھتیجی آکر سب کا دل جیت لے گی۔ فطرتاً وہ دل کی نرم ہوتی ہیں، اس لیے انہیں مریم کی تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ دل میں عہد کرتی ہیں کہ وہ مریم کے لیے اچھا سا رشتہ خود تلاش کریں گی۔ جہاں آرا بیگم جو نفیس احمد کی بیوی ہیں، مریم کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد رفیق احمد اور اُن کے گھروں سے سخت ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثمینہ اور عرفان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عرفان بہت خوش، فہمیدہ بیگم مطمئن اور رفیق احمد اور زرقون اُداس ہوتے ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب زرقون اپنی کزنز کے ساتھ دلہن کو لینے جاتی ہے تو رقیہ بیگم، ثمینہ کو بھیجنے سے انکار کردیتی ہیں۔ نفیس احمد اس بات کو سُن کر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم چاچی زلیخا کے ساتھ ثمینہ کو لینے جاتی ہیں، جہاں اُن کو رقیہ بیگم ایک دوسرے ہی روپ میں ملتی ہیں۔ چاچی زلیخا یہ خبر جہاں آرا بیگم کو سُنانے پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم ایک رات کی دُلہن کے میکے بیٹھ جانے کا سُن کر دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران رہ جاتی ہیں۔ زرقون کو اپنی ماں کے رویے کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُس کے دُکھ پر فراز محبت کے پھاہے رکھتا ہے۔ آفتاب احمد جو ایک بہت بڑی کمپنی کے ایم ڈی ہیں، وہ نرگس جو زرقون کی دوست ہے اور جس کا مڈل کلاس سے تعلق ہے، اُس کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن نرگس اُن کی پسندیدگی سے ناواقف ہے۔ عرفان اور ثمینہ کی شادی سے رفیق

احمد ناخوش ہونے کے باوجود زرقون کو سمجھوتہ کرنے کو کہتے ہیں۔ رفیق احمد ایک رکھ رکھاؤ والے خاندانی آدمی ہیں۔ اُن کے گھر کے کچھ اصول ہیں۔ ثمینہ اُن اُصولوں کی پروا نہیں کرتی۔ جس پر اُن کو اعتراض ہوتا ہے۔ ثمینہ پھوپو کے گھر کو سسرال ہی سمجھتی ہے۔ اور وہ سسرال والوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ مریم روز...... روز کے رد کیے جانے کی وجہ سے چڑچڑی اور بیمار رہنے لگی ہے۔ نفیس احمد اور جہاں آرا بیگم بیٹی کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ نفیس احمد دیکھ رہے ہیں کہ حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں، لہٰذا وہ زرقون کا جلد از جلد فراز کے ساتھ بیاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ فراز، زرقون کو بے حد چاہتا ہے۔ رقیہ بیگم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر فہمیدہ بیگم سے سوال جواب کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسے موقعوں پر ثمینہ مظلومیت کی شاندار اداکاری کرتی ہے۔ عرفان، ثمینہ کا دیوانہ ہے۔ اُن دنوں جب عرفان کے سر پر ثمینہ کی محبت سوار ہوتی ہے، ایک خوب صورت، خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر کا عرفان کی دکان پر آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ ثمینہ نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ اُس کو فراز اور زرقون سے عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا ہے۔ جہاں آرا کے مزاج میں رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں کا لیے تلخی بڑھ رہی ہے۔ وہ فراز کو اُن کے گھر جانے سے منع کر دیتی ہیں۔ رفیق احمد کی آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا ہے۔ اُن کی آنکھوں کا آپریشن ناکام ہو جاتا ہے۔ عرفان ڈاکٹر تابندہ کو کاروبار کے لیے سونا دے دیتا ہے۔ مریم بہت ساری نفسیاتی اُلجھنوں سے نکل کر آخر زندگی کی طرف قدم بڑھا دیتی ہے۔ زرقون آفتاب کا نمبر حاصل کر کے اُس کو فون کرتی ہے۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آیا وہ نرگس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جہاں آرا بیگم نے کھل کر رفیق احمد کے گھرانے، زرقون اور فراز کے رشتے کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ اس ساری صورت حال سے فراز بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ زرقون سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ لیکن اُس کو سوائے اللہ کے آگے گڑگڑانے کے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اِدھر ثمینہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد الگ ہو جائے۔ مریم کا رشتہ ایک متوسط طبقے سے آتا ہے۔ جہاں آرا بیگم مریم کے رشتے سے بہت خوش ہیں لیکن زرقون اور رفیق احمد کے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت سرد ہو جاتا ہے۔ وہ فراز کو رفیق احمد کے گھر جانے سے منع کرتی ہیں۔ فراز بہت پریشان ہے لیکن نفیس احمد اُس کو حالات کو سنبھالنے کی اُمید دلاتے ہیں۔ زرقون جہاں آرا بیگم کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہے۔ ثمینہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ ثمینہ اور رقیہ بیگم نے سارے خاندان میں بدگمانیاں پھیلا دی ہیں۔ فہمیدہ بیگم کے سارے رشتے دار اُن کی مخالفت کر رہے ہیں، جس کا اُن کو بہت صدمہ ہے۔ عرفان نے ثمینہ کو بہت جلد الگ گھر لینے کی اُمید دلائی ہے۔ مرتضیٰ اور شیری کے جھگڑے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شیری ایک مکمل امریکن عورت کا روپ دھار رہی ہے اور مرتضیٰ اس بات سے سخت نالاں ہے۔ وہ چاہتا ہے اللہ اُس کو اولاد دے دے۔ شاید اس طرح شیری کو گھر داری کا شوق پیدا ہو جائے۔ آفتاب اور نرگس کی محبت خوب صورت جذبوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن زرقون اور فراز کی محبت تیز آندھیوں کی زد میں ہے۔ اللہ نے ثمینہ کو بیٹے سے نوازا ہے، فہمیدہ بیگم بہت خوش ہیں لیکن رقیہ بیگم ثمینہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں اور روک لیا۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ ثمینہ کو الگ گھر لے کر دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ فہمیدہ اپنا برسوں کا بسا بسایا گھر بیچ کر عرفان کو ورثہ دے دیں۔ فہمیدہ بیگم ان کے مطالبے سے بہت پریشان ہیں، رقیہ بیگم نے ان کے اور ان کے تمام گھر والوں کے خلاف پورے خاندان والوں کو بدگمان کر دیا ہے۔ جس کا فہمیدہ بیگم کو بہت صدمہ ہے۔ مریم کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ جہاں آرا بیگم جہاں مریم کے رشتے سے خوش ہیں وہیں پرانے طے کردہ رشتوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ چکی ہیں۔ فراز جہاں آرا بیگم کے رویے کے بارے میں پریشان ہے لیکن نفیس احمد اس کو تسلی دیتے ہیں کہ جہاں آرا کا غصہ وقتی ہے۔ لیکن فراز مطمئن نہیں ہے۔ زرقون کے دل کو بھی اپنی تائی اماں کے سرد رویے کی وجہ سے عجیب سی بے چینی ہے۔ وہ فراز سے کہتی ہے، لیکن فراز اُس کو اطمینان دلاتا ہے۔ مریم اب بہت بدل گئی ہے۔ اُس میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیاں جہاں آرا بیگم کے لیے اطمینان کا باعث ہیں۔ فہمیدہ بیگم اپنے میکے والوں کے رویے پر بہت دل برداشتہ ہو جاتی ہیں وہ زرقون اور مریم سے اپنے دل کی حالت بیان کرتی ہیں اُن کی باتوں کا کچھ حصہ رفیق احمد بھی سن لیتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوتا ہے انجانے میں وہ بھی فہمیدہ بیگم کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں وہ دل ہی دل میں فہمیدہ بیگم کو معاف کر دیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ بھی اُن سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن کسی معافی تلافی کے بغیر فہمیدہ بیگم ایک رات جو سوتی ہیں تو سوتی ہی رہ جاتی ہیں...... وقار...... کو جہاں آرا بیگم کاروبار کے لیے پیسا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے لیے شوہر خرید لیے، لیکن وقار کا شکی مزاج مریم کو ہر وقت ڈستا رہتا ہے اور مریم کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے...... اِدھر آفتاب نرگس کے لیے اپنے والدین سے بات کرتا ہے...... اُس کے والد کہتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے رشتے کے لیے اپنے دوست جنید سے اُن کی بیٹی حیا کے لیے بات کر رکھی ہے۔ آفتاب یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے...... جہاں آرا بیگم کے ساتھ ساتھ مریم بھی فراز کے ساتھ زرقون کی شادی کے خلاف ہے کیوں کہ مریم کا خیال ہے اگر اس کی شادی عرفان سے ہو جاتی تو اُس کو دن رات وقار کے طعنے تو سننے کو نہ ملتے...... زرقون کے لیے فراز کی محبت سے اُس کو حسد ہونے لگتی ہے۔ جہاں آرا بیگم نے زرقون کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ مریم نہیں چاہتی زرقون کی شادی فراز سے ہو۔ زرقون اور فراز بدلتے حالات

کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زرقون فراز سے کہتی ہے کہ وہ وعدے کرے کہ وہ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تو وہ ساری زندگی اُس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہے۔ رفیق احمد، رقیہ بیگم سمیت لمیدہ بیگم کے سارے خاندان کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمینہ اور عرفان پر کوئی پابندی نہیں وہ جب جس کے گھر جانا چاہیں جا سکتے ہیں، لیکن اُن کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مرتضیٰ اپنی ماں کے سمجھانے پر شیری سے ایک بار پھر سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آفتاب حیا کو نرگس کے بارے میں بتاتا ہے وہ چاہتا ہے حیا اس رشتے سے انکار کر دے۔ وہ حیا کو چائے پر لے کر جاتا ہے لیکن حیا کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ثمینہ کو لمیدہ بیگم کے بعد بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری سپرد کی جاتی ہے۔ لیکن وہ حد سے زیادہ لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یوں اُس کا اور زرقون کا پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''خیریت میڈم آج تو آپ تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔'' ایس پی ہمایوں عباس نے ہاتھ کے اشارے پر اُس کی گاڑی رُکتے ہی کھڑکی میں مُنہ ڈال کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''تم...... تم ہمایوں؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا تم ٹریفک پولیس میں آ گئے ہو یا کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر سڑکیں ناپ رہے ہو۔'' حیا نے گلاسز کو سر پر جماتے ہوئے اپنے اندر کی گھٹن کو سینے میں دباتے ہوئے شائستہ سے لہجے میں اپنے پُر وقار فرسٹ کزن کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اگر کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہونے ہی کی بات ہے تو پھر سڑکوں پر مٹر گشت کرنے کے بجائے میں اُس لڑکی کے گھر میں بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھار لسی پیتا، جیسے کہ پی رہا ہوں۔''

اب وہ دونوں حیا کے گھر آ چکے تھے اور ہمایوں عباس مزے سے سینٹر ٹیبل پر پیر رکھے۔ لسی کے جگ میں سے لسی کا دوسرا گلاس بھرتے ہوئے اُس کو چھیڑ رہا تھا۔

''چپ رہو...... تم پولیس والے۔'' حیا نے دانت کچکچائے۔

''کیا پولیس والے؟ ارے میڈم ہم سے نہ اُلجھنا۔ ہم ایش ٹرے میں سے لاش نکال سکتے ہیں۔ تم کو ہیروئن کی اسمگلر ثابت کر سکتے ہیں۔ تمہارا شناختی کارڈ جعلی ثابت کر سکتے ہیں۔ تمہارا پاسپورٹ ضبط کر سکتے ہیں۔ تم کو ہتھکڑی لگوا سکتے ہیں...... اور۔''

''توبہ ہے، چپ کرو ہمایوں! تم کس قدر باتیں کرتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ تم نے سول سروس کے امتحان میں پوزیشن لی تھی اور تم ایس پی کے انتہائی حساس عہدے پر تعینات ہو۔'' حیا ہنسی۔

''ارے میری پیاری سی نک چڑھی سی کزن! ایک بات تو تم سُن ہی نہ سکیں، روایتی عورتوں کی طرح مجھ کو بیچ میں ہی ٹوک دیا اور تم جانتی ہو نا مردوں کو بیچ میں ٹوکنا بدشگونی ہوتی ہے۔'' ہمایوں عباس ہنسا۔

''اچھا...... یہ کس نے کہا ہے؟'' حیا نے تیوری پر بل ڈالے۔

''یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے...... اور جو میں کہہ دوں وہی قانون ہے۔''

''کیونکہ تم پولیس والے ہو۔'' حیا نے جل کر کہا۔

''Oh Yes۔'' ہمایوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''خیر چھوڑو میری باتیں، میری تو کیا بات ہے۔ تم بتاؤ کیا بات ہے؟ کس بات پر اتنا موڈ خراب تھا کہ تم نے ٹریفک سگنل توڑ ڈالا تھا۔ وہ تو میں نے تم کو دیکھ لیا تھا۔ تمہارے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ماتھے کے بل بتا رہے تھے تم ڈسٹرب ہو اور جب میں نے، تمہاری اسپیڈ دیکھی تو سوچا شاید تم کو میری ضرورت ہے اور میں جو گھر جا رہا تھا۔ تمہارے راستے میں آ کھڑا ہوا کہ شاید تم کو میں نظر آ جاؤں۔'' ہمایوں عباس جو حیا کا فرسٹ کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا

مزاج آشنا بھی تھا۔ایک ذومعنی بات بہت سنجیدگی کے لبادے میں لپیٹ کر کہنے کے بجائے ہلکے پھلکے انداز میں کہی۔

''ممی!! میں آفتاب سے شادی نہیں کر سکتی۔'' مسز روحی جنید آفندی جو ڈنر کے بعد بیٹھی ٹی وی پر آنے والا ایک ٹاک شو بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔حیا کی آواز پر چونکیں۔

''کیا کہہ رہی ہو حیا۔'' انہوں نے ریموٹ اُٹھا کر پہلے ٹی وی کی آواز ہلکی کی اور پھر بند ہی کر دیا۔

''ممی میں ایک سمپل سی بات کر رہی ہوں۔ میں آفتاب سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔آپ پلیز اُن لوگوں کو منع کر دیں۔'' حیا نے ضبط کی انتہاؤں پر کھڑے ہو کر ایک سرسری سے انداز میں کہا۔

وہ آفتاب سے محبت کرتی تھی۔لیکن وہ محبت کے معنوں کو سمجھتی تھی۔وہ جانتی تھی کہ محبت دینے کا نام ہے۔محبت چھینی نہیں جا سکتی۔محبت تو دو دلوں کے درمیان ایک رابطے اور ایک مقناطیسی کشش کا نام ہے، جس کے تحت دو مختلف پولز پر رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں اور عورت تو محبت میں صرف وان کرتی ہے۔

پامال ہوتی ہے۔

مٹی میں رُل جاتی ہے۔

محبوب کے قدموں میں بیٹھ کر اُس کے قدموں کی جنبش سے اُس کی خوشی کا اندازہ لگاتی ہے اور پھر اُس کے پیروں میں بیٹھ کر اُس کی خوشی کے لیے اپنی ہر خوشی بھول جاتی ہے۔اُس کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ آفتاب سے محبت کرتی ہے اور محبت بھی محبت جیسی......

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔'' روحی نے غصے سے کہا۔''ابھی چند دن پہلے تمہارے پاپا نے ہاں کی ہے۔قریبی دوستوں کو ہم لوگ ٹریٹ بھی دے چکے ہیں اور یہ سب تمہارے علم میں ہے۔ابھی چند گھنٹے پہلے تک تم اپنی دوستوں کو ٹریٹ دینے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔اِن چند گھنٹوں میں کیا ہو گیا ہے کہ تم کھڑی کہہ رہی ہو کہ ہم رشتے سے انکار کر دیں۔شادی بیاہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتا، ہم کتنے ہی ماڈرن ہو جائیں۔ہم اپنی روایات سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ہماری ثقافت ہے، ہمارا کلچر ہے،لوگ مڈل کلاس کی طرح ہم سے بھی سوالات کریں گے۔تم دونوں بہن بھائیوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے زندگی کے بہت سارے باب میں تم کو نہیں پڑھا سکی ہوں یہی وجہ ہے کہ زندگی کی کچھ تلخیاں اور حقیقتیں تم لوگ فراموش کر رہے ہو۔مکان اور گھر میں فرق ہوتا ہے۔یہ جملہ میں مرتضیٰ کو بھی سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی ہوں۔زندگی میں بعض اوقات گھر مر و بساتے ہیں۔وہ قربانیاں دیتے ہیں۔'' روحی نے عجیب دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھیے ممی! مرتضیٰ بھائی کا معاملہ بہت مختلف ہے۔شبانہ ایک احساس کمتری کا شکار معمولی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔میری تو سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ نے شبانہ جیسی لڑکی کو مرتضیٰ بھائی کے لیے کیسے منتخب کیا تھا، وہ مرتضیٰ بھائی کو کبھی نہ خوش رکھ سکتی ہے اور نہ ہی رکھے گی۔بہر حال اِس وقت موضوع مرتضیٰ بھائی اور شبانہ نہیں ہیں۔موضوع ہے میرا اور میں آپ سے درخواست کر رہی ہوں کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ پلیز اسد انکل سے اور آنٹی سے معذرت کر لیں۔میں یہ رشتہ کرنا نہیں چاہتی، میں آفتاب کے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔'' حیا کی آنکھوں میں بار بار اُمڈتی نمی اُس کی ماں کی جہاندیدہ آنکھوں سے چھپی نہ رہ سکی۔

وہ ماں تھیں، بیٹی کو جانتی تھیں۔وہ جانتی تھیں وہ اِس رشتے سے بہت خوش تھی لیکن ایسا کیا ہوا تھا کہ چہرے پر بلا کی سنجیدگی ہے لیکن آنکھوں میں پھیلی نمی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی اُن کی لاڈلی بیٹی اِنکاری تھی۔

"کیا تم آفتاب کے بغیر خوش رہ لو گی؟" مسز روحی جنید کا سوال حیا کو بہت چبھا۔
"ممی خوشی کیا ہے، خوشی کی انتہا آزردگی ہے، خوشی Per Suit کا نام نہیں ہے، تعاقب کا نام نہیں ہے۔ بلکہ خوشی ٹھہرنے کا نام ہے۔ رُک جانے کا نام ہے۔ ہم جس چیز کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ خوشی نہیں ہوتی وہ ہمارا واہمہ ہوتی ہے یا ضد ہوتی ہے۔ خوشی قبول کرنے کا نام ہے۔ خوشی حالات کا نام نہیں ہے بلکہ حالتِ دل کا نام ہے۔ ہمارے اندر کے حالات اور Conditions کا نام ہے۔ اِنسان اگر حالات سے سمجھوتا کرے۔ کالے اور سفید کے فرق کو مان لے۔ Grey ایریا کی ضد نہ کرے تو وہ خوش رہ سکتا ہے ورنہ ساری زندگی صرف فریاد کرتے اور روتے بسورتے گزر جاتی ہے۔ میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ میں اپنا آپ کیسے قبول کرواؤں اور ویسے بھی قبول کروانے کی کوشش نقلی کوشش ہے۔ اصل کوشش اصل خوشی قبول کرنا ہے۔ مجھے محبت چاہیے۔ مجھے خوشی چاہیے لیکن میں محبت اعزاز کی طرح وصول کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی تھالی میں رکھ کر اپنا دل پیش کرے۔ میں زبردستی محبت نہیں مانگتی کہ وہ مجھ سے جبراً تعلق رکھے۔ یہ میری اور میری محبت کی تذلیل ہے۔ لفظ 'محبت' ایک لفظ نہیں بلکہ ایک کائنات ہے۔ میں محبت بھیک میں نہیں لوں گی اور میں محبت مانگ بھی نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں محبت مانگنے والی شے نہیں ہے۔ محبت دینے والی شے ہے۔ اگر آپ واقعی محبت کرتے ہیں تو آپ محبت میں دینے کا معاملہ رکھیں۔ خوشی دینے سے ملتی ہے اور محبت بھی دینے سے ملتی ہے۔ محبت اور خوشی مانگنے سے نہیں ملتیں محبت میں Investment ہوتی ہے۔ محبت کو پھیلانا چاہیے۔ محبت میں Invest کرنے والا ہی محبت حاصل کرتا ہے اور محبت میں Command کرنے والا کبھی بھی محبت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی خوشی......اور۔"
"حیا! میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا لیکن تم نہ جانے بقراط بنی خلاؤں میں کیا گھور رہی ہو۔ حد ہوتی ہے میں پوچھ رہی ہوں کیا تم اِس رشتے کو ختم کرنے کے بعد خوش رہ لو گی؟" روحی نے دوبارہ ایک ایک لفظ جما جما کر ادا کرتے ہوئے بیٹی سے پوچھا۔ جس کا چہرہ کچھ اور کہہ رہا تھا اور لفظ کوئی اور داستان بیان کر رہے تھے۔
"جی!" حیا کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔
روحی نہ جانے کیوں چُپ سی ہو گئیں۔ اُن کو ایسا لگا جیسے اب کچھ کہنے کے لیے باقی نہ بچا ہو۔

☆......☆......☆

سُنبل اور احمد کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بہت جلد معمولی دھوکوں میں بدل گئیں اور پھر دھوکے کس طرح فراڈ میں تبدیل ہوئے اُن دونوں کو اِحساس تک نہ ہوا۔ لیکن ہاں روز بروز بڑھتا بینک بیلنس اُن کو حد درجہ مطمئن کر رہا تھا۔ سُنبل اور احمد ایک تعلیم یافتہ ذہن رکھتے تھے۔ زندگی بدل رہی تھی لیکن سُنبل کے خواب بہت اونچے تھے۔ وہ بہت اچھی پلانر تھی۔ حُسن اور ذہانت کا حسین امتزاج تھی سُنبل۔
وہ ذہانت کو تو کیش کر ہی رہی تھی۔ لیکن جہاں جہاں حُسن کا استعمال ضروری ہوتا وہ اپنے حُسن کا فائدہ اٹھاتی اور یہ حُسن ہی تھا کہ کلفٹن کا ایک بہت خوبصورت فلیٹ اُس کے بوڑھے مالک نے بغیر ایڈوانس کے اور معمولی کرائے پر دے دیا۔
"کیا ہوا بڈھے کو دیکھ کر صرف مسکرانا ہی تو پڑتا ہے اور کبھی کبھی شرمانا بھی پڑ جاتا ہے۔" سُنبل نے ہنستے ہوئے اپنی دیرینہ دوست فرح سے کہا۔
"لیکن سُنبل احمد بُرا نہیں مانتا۔" فرح حیران سی تھی۔

''نہیں احمد بُرا نہیں مانتا، اُس کو بُرا ماننا بھی نہیں چاہیے اور مائی ڈیر زندگی اگر سیدھے رستے پر چلتے ہوئے کامیابی کا دروازہ کھول دے تو ہم جیسے معصوموں کو کیا ضرورت ہے ٹیڑھے رستوں پر چلنے کی یہ احمد جانتا ہے۔ اور میں جو کچھ کرتی ہوں احمد کے مشورے سے کرتی ہوں اور ویسے بھی بڈھے کے تو کوئی آگے پیچھے ہے نہیں۔ اکیلا رہتا ہے اب تو گاڑی اور ڈرائیور میرے ہی استعمال میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اُس کو کہیں جانا ہو تو مجھ سے ایسے اجازت مانگتا ہے جیسے میں مالک ہوں۔'' سُنبل نے ہنستے ہوئے فرح کو تفصیلات بتائیں۔

''اور تمہاری امی...... تمہاری امی۔ کچھ نہیں کہتیں۔'' فرح کو اچانک خیال آیا۔

''ہاں امی تھوڑا ناراض ہوتی ہیں لیکن بھئی امی کی سُنتا کون ہے۔ امی کی نصیحتوں اور مشوروں پر عمل کرتی تو آج تک اُس تنگ گلی کے دو کمروں کے گھر میں رہتی۔ 20، 20 روپے کی دوائیاں دیتی اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود ڈیزائنرز کے کپڑوں کی Copies ڈھونڈتی پھرتی۔''

''ہاں تم صحیح کہہ رہی ہوگی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔'' فرح حیران سی تھی۔

''مائی ڈیئر فرح! زندگی بہت تلخ ہے، لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں۔ تم لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہو۔ آٹا ختم ہو جائے تو کیک کھاتے ہو۔ تم کو کیا پتا بھوک کیا ہوتی ہے؟ بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر ہوس زدہ نظروں کو سہنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مالک مکان کی دھمکیاں سُنتا کتنا بُرا لگتا ہے۔ ہر مہینے بجلی کا کٹ جانا اور پھر بل کی قسطیں کروانا کتنا مشکل کام ہے۔ تم حیران ہو رہی ہو۔ اُلجھ رہی ہو۔ تمہارا قصور نہیں ہے قصور ہے کلاس کا۔'' سُنبل نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں زندگی کی تلخیاں فرح سے بیان کیں۔

فرح جو ایک بیوروکریٹ کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ سُنبل کی ایک دوست بھی تھی۔ وہ اکثر سُنبل کی تلخ باتیں سُنتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ لیکن اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر وہ امیر ہے تو اِس میں اُس کا کیا قصور......

لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ہر امیر شخص سُنبل کو اُس وقت تک بُرا لگتا رہے گا جب تک وہ خود اُس صف میں نہ آ کھڑی ہو۔

وہ جو سُنبل کو اپنی صرف ایک دوست سمجھتی تھی اُس کو نہیں معلوم تھا کہ سُنبل کسی کی دوست نہیں ہے اور وہ بھی سُنبل کے لیے صرف ایک سیڑھی ہے۔ وہ اکثر اُس کی گاڑی اور اُس کا گھر اِس چالاکی سے استعمال کرتی تھی کہ فرح کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو پاتا تھا۔

اور سُنبل کی زندگی میں صرف فرح ہی نہیں تھی اُس نے زندگی میں ہر موقع اور ہر جگہ پر مختلف لوگوں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا اور مطلب نکل جانے کے بعد وہ اُس سیڑھی کو لات مار کر گرا دیتی تھی۔

اِس وقت وہ دونوں 26 اسٹریٹ پر واقع KFC میں مزیدار چکن سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ گلاس کے اُس پار برستا پانی اور پانی میں سے گزرتی گاڑیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ آج سُنبل کی برتھ ڈے تھی اُس نے فرح اور احمد کو بُلایا تھا۔ فرح اپنے مقررہ وقت پر آ گئی تھی لیکن احمد نہ جانے کہاں رہ گیا تھا، سو اِس وقت برستی بارش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ فرح کے ساتھ مصروف تھی۔

فرح ایک سادہ طبیعت کی لڑکی تھی کبھی کبھی اُس کو سُنبل ایک ڈیپریسڈ اور فرسٹڈ لڑکی لگتی لیکن وہ نظر انداز کر دیتی۔ کیونکہ اُس کو کبھی بننا سخت ناپسند تھا۔ کبھی ہمیشہ گندگی پر بیٹھتی ہے وہ ہمیشہ تصویر کا اچھا رُخ دیکھتی تھی۔ سو سُنبل کی اِن عادتوں کے باوجود وہ سُنبل کی دوسری اچھی عادتوں کو بے حد پسند کرتی تھی اور سُنبل اُس کے اسٹیٹس کی وجہ سے اُس سے جڑی رہتی تھی۔ وہ اپنے حلقے میں ایسے لوگوں کو شامل رکھتی تھی جن کا نام اور پس منظر وہ مختلف

جگہوں پر حوالے کے طور پر استعمال کر سکتی تھی اور کرتی تھی۔
''اوکے سنبل، احمد تو آیا نہیں ابھی تک مجھے آج شام پاپا کے ساتھ لندن کے لیے نکلنا ہے ورنہ میں تھوڑی دیر اور بیٹھ جاتی۔'' فرح نے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے باہر پارک ہوتی گاڑی کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔
''لندن جانا ہے، ایسے کہہ رہی ہے جیسے کریم آباد جانا ہے۔ واہ اللہ میاں آپ کی تقسیم بھی خوب ہے۔'' سنبل دل میں کھول کر رہ گئی۔
''کوئی بات نہیں تم جاؤ۔ احمد آتا ہی ہو گا۔ دراصل ابھی اُس کا SMS آیا ہے، راستے میں اُس کی بائیک خراب ہو گئی ہے۔'' سنبل نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔
''یار اب احمد سے کہو، اُس کھٹیچر 70 کا پیچھا چھوڑے اور کوئی گاڑی لے لے۔'' فرح نے لاپروائی سے کہا۔
''تم نے پھر وہی کیک اور آٹے والی بات کر دی۔'' سنبل بے ساختہ ہنسی۔
''اچھا سنبل تم اکثر اِس کیک اور آٹے کی مثال دیتی ہو۔ تم پہلے مجھے اس جملے کا بیک گراؤنڈ بتاؤ، میں پھر جاؤں گی۔'' فرح نے اُس کی مثال میں اُلجھتے ہوئے پوچھا۔
''چلو پھر کبھی، آج تم کو دیر ہو رہی ہے تم کو لندن جانا ہے بیوقوف۔'' سنبل نے اُس کو ٹالا۔
''لندن کون سی بڑی جگہ ہے سامان پیک ہے، تم پہلے مجھے بتاؤ۔ تم ہمیشہ میرے لیے یہ بات کرتی ہو۔'' فرح نے ضد کی۔
''ایک بادشاہ تھا، بہت ظالم تھا ایک دفعہ اُس کے درباری اُس کے پاس آئے اور کہا۔
جہاں پناہ ملک میں قحط کا سماں ہے۔ گندم کی فصل تباہ ہو گئی ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ روٹی کھانے کو نہیں ہے۔ بادشاہ جو اپنی دُنیا میں مگن رہتا تھا۔
اُس نے اپنے وسیع و عریض دسترخوان پر نگاہ ڈالی جس پر دُنیا کی ہر نعمت سجی تھی اور پھر آرام سے کہا۔
لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔
اگر روٹی نہیں مل رہی تو کیک کھالیں۔
''تو میری جان تم کو کیا معلوم روٹی کیا ہوتی ہے۔'' سنبل نے کہا۔ اور فرح سر ہلانے لگی۔
''تم جاؤ فرح تم کو دیر ہو رہی ہے میں احمد کا انتظار کروں گی۔'' سنبل نے کھڑے ہو کر فرح سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔
''تم اِتنی دیر سے آئے ہو، حد کرتے ہو۔ فرح بھی انتظار کرتے کرتے چلی گئی۔'' سنبل نے پانی کا گلاس پیتے احمد سے کہا۔
''چھوڑو، یار خواہ مخواہ اُس کی لمبی سی گاڑی دیکھ کر ایک عجیب سی فرسٹریشن ہوتی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر فرح کو Avoid کیا ہے آج۔'' احمد نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔
''کیا کہہ رہے ہو احمد اگر اپنی حیثیت سے زیادہ بڑے لوگوں میں نہیں بیٹھو گے تو ہماری جدوجہد کمزور پڑ جائے گی۔ کیونکہ اپنی کلاس یا ہم سے کمتر کلاس ہم کو کچھ کرنے کے لیے نہیں اُکساتی بلکہ ہم کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ برابر والوں کے ہاں UPS ہے تو ہمارے ہاں جنریٹر ہے۔ ہم ایک عجیب سے کنوئیں کے مینڈک بن جاتے ہیں لیکن جب ہم اپنے محور سے نکل کر اِن بڑے لوگوں کے سرکل میں پہنچتے ہیں تو پتا چلتا ہے ہم تو بالکل خالی ہاتھ ہیں اور پھر ہاتھ بھرنے کے لیے کوئی کوشش کریں نہ کریں میں ضرور

کرتی ہوں فرح کی V8 مجھے اُکساتی ہے۔

میرا منہ چڑاتی ہے اور پھر میں اپنے آپ سے کہتی ہوں وہ دن دور نہیں جب تیرے ایکسیلیٹر پر میرا پاؤں ہوگا۔"

"چھوڑو یار...... تم تو جذباتی ہوگئیں میں نے تو ایک بات کردی تھی۔ جس طرح تم ترقی کرنا چاہتی ہو، میں بھی چاہتا ہوں۔" احمد نے سنبل کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے مشن کا کیا ہوا۔ لندن کی فلائٹ کب کی ہے۔"

"انشاءاللہ ہفتہ کی شام کی ہے۔"

"کیا رہا۔" احمد پُرتجسس تھا۔

مال تو بہت ہے، منافع بھی بہت ہے لیکن احمد یہ منافع ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ سنبل کا لہجہ پُرسوچ تھا۔

تم کیوں اِس قدر ہلکان ہوتی ہو۔ میں بھی تو لگا ہوا ہوں دیکھو یہ پکچرز۔" احمد نے لفافے میں سے تصویریں نکال کر رازدارانہ انداز میں سنبل کو دکھائیں۔

"Oh My God احمد یہ تو کروڑوں کی تصویریں ہیں۔ یہ تم نے کیسے لے لیں، کیا سحر کو پتا ہے؟"

تصویریں دیکھ کر سنبل جیسے اپنی جگہ سے اُچھل ہی پڑی۔

"ایک سحر کیا، نتاشا اور زوبیہ سب کی اِس سے زیادہ خراب حالات میں کھینچی گئی تصویریں ہیں میرے پاس اور جہاں تک تمہارا یہ سوال کہ یہ میں نے کیسے لے لیں تو مائی ڈیئر اب تمہارا احمد اتنا ہینڈسم تو ہے کہ اُس کے لیے لڑکیاں اپنا "سب کچھ" آنکھیں بند کر کے لٹانے پر راضی ہو جائیں۔" ڈاکٹر احمد جمال نے قہقہہ لگایا اور سنبل اُس کو گھورتی رہ گئی۔

اِس خفگی میں ایک خوشی تھی کیونکہ......

☆......☆......☆

"اماں یقین کرو میں بہت خوش ہوں۔ دل چاہ رہا ہے ناچوں، میرے سُسر نے کہہ دیا ہے کہ میں چاہوں تو الگ ہو سکتی ہوں۔" ثمینہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے رقیہ بیگم سے کہا۔ آج کل عبداللہ کی طبیعت ٹھیک نہیں چل رہی تھی سو اکثر وہ سارا سارا دن کے لیے ماں کے گھر آجاتی تھی۔

"تو اس میں اس قدر خوشی کی کیا بات ہے جو تم باؤلی ہوئی جارہی ہو؟" زرینہ نے چیخ کر کہا۔

"ہاں خود تو شروع سے ہی الگ چولہا ہانڈی کیے بیٹھی ہو۔ آج جب اللہ نے مجھے یہ دن دکھایا تو تم کو آگ لگ رہی ہے۔ حد ہوتی ہے زرینہ! بہن تو خوش ہوتی ہیں کہ ہماری بہن کی ساس نندوں سے جان چھوٹی اور ایک تم ہو، وہاں ہماری سُسرال میں زرقون اور اُس ایری غیری میں ایسا بہناپا ہے کیا سگی بہنوں میں ہوگا۔ اماں میں تم کو کیا بتاؤں، دونوں میں ایسی گھنٹی ہے کہ میرے تو سینے میں رات دن ایک آگ سی لگتی رہتی ہے اور یہ میری بہن ہے۔ لعنت ہے مجھ پر اور میری قسمت پر۔" ثمینہ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی۔

"اری اس میں رونے کی کیا بات ہے زرینہ صحیح تو کہہ رہی ہے۔" رقیہ بیگم نے ثمینہ کی آنکھوں پر سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ثمینہ نے حیرانگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ، گھر سے الگ ہوگی تو یا تو کرائے کے مکان میں جائے گی یا پھر چھوٹا موٹا دو کمروں کا فلیٹ خریدے گا تیرا میاں، اور وہ جو ڈھائی سو گز پر دو منزلہ اوپر سے نیچے تک سجا سجایا، بسا بسایا گھر ہے وہ زرقون کو مل جائے گا۔ بیوقوف بڈھا بہت چالاک ہے۔ وہ تجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینکنا چاہتا

ہے۔ تیری پھوپی زندہ ہوتی تو میں کہتی چل اِس کا بیٹا چھین لے اور الگ گھر بسا لے۔ لیکن وہ تو مرگئی۔ بڈھا کتنے دن کا اور اُس کی بٹی کتنے دن کی۔ کچھ ہی عرصے میں سارا گھر تیرا ہوگا اور تُو راج کرے گی۔ میں نے شاہ صاحب سے بات کی تھی کہ تیرا سُسر بہت گھر کے معاملات میں بولنے لگا ہے کہنے لگے تو چندی جمعرات کو آنا ایسا تعویز لکھ کر دے دوں گا کہ چپ لگ جائے گی اُس کو۔ بس ذرا صبر سے کام لے۔ اُن کے گھر میں رہ اور اُن ہی کے سینوں پر مونگ دلتی رہ۔ عیش کر اور اُن کو سانس نہ لینے دے۔ ہماری بڑی بے عزتی کی ہے رفیق احمد نے، بہت بٹی کا حمایتی بن کر کھڑا ہوا تھا۔ ساری زندگی اُس کی بٹی کو اُس کی دہلیز پر نہ بٹھایا تو میرا نام بھی رقیہ بیگم نہیں۔ اور یہ عبداللہ اِس قدر کمزور کیوں ہو رہا ہے۔" رقیہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی اور موضوع بدلنا چاہا۔

"خیر اماں تمہاری سیاستیں اور تمہاری چالیں میری تو سمجھ میں نہیں آتیں لیکن ہاں میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اگر میں سیر ہوں تو تم سوا سیر بلکہ ڈھائی کلو ہو، بس یہی سوچ کر خاموش ہو جاتی ہوں لیکن شاہ صاحب سے اِس بات کے لیے بھی تعویز لینا کہ وہ گھر کسی بھی طرح میرے نام ہو جائے۔ اپنی ملکیت کی بات ہی الگ ہے۔" ثمینہ نے ماں کی بات مانتے مانتے اُن کے پلان میں ایک پھول اور جڑا۔

"ہاں...... ہاں وہ بھی ہو جائے گا لیکن یہ تو بتا یہ عبداللہ اِس قدر کمزور کیوں ہو رہا ہے؟" رقیہ بیگم نے فکر مندی سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس کیا کروں۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، ذرا سا کھیلتا ہے تو بخار چڑھ جاتا ہے۔ ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔" ثمینہ نے فکر مند لہجے میں ماں کو بتایا۔

"ڈاکٹر کو دکھایا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"کیوں ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤں گی میں۔ میری اولاد نہیں ہے یہ۔" ثمینہ نے کھردرے لہجے میں زرینہ کو جواب دیا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔" زرینہ نے جل کر کہا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے ثمینہ، بڑی بہن ہے۔ اس طرح بات کرتے ہیں۔" رقیہ بیگم نے باہر جاتی زرینہ کو دیکھتے ہوئے ثمینہ کو ڈانٹا۔

"اوہو اماں تم تو ایسے بڑے چھوٹے کی تمیز سکھا رہی ہو جیسے ہمارے گھر کا ماحول بہت مہذبانہ ہے۔ تم خود سوچو کس قدر بے تکا سوال تھا۔ ارے بھئی ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤں گی تو کیا کسی 'دائی' کو دکھاؤں گی میں بچے کو۔"

"واقعی ثمینہ بہت زبان دراز ہے اُس کو شہ دیتے وقت میں یہ کیوں بھول گئی تھی کہ میں اُس کو چھری بنا رہی ہوں اور چھری کا کام ہے کاٹنا۔ وہ تو سب کو ہی کاٹے گی، رقیہ بیگم نے ثمینہ کی بات پر تلملا کر سوچا۔

"ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اُس نے طاقت کی دوائیاں لکھیں ہیں۔ وہ دے تو رہی ہوں۔ اللہ میرے بچے کو صحت اور زندگی دے۔" ثمینہ نے برابر رکھے گلاس میں سے گھونٹ بھر پانی پیا اور پھر اپنی بات مکمل کی۔

"خیر تُو اِس بچے کا خیال رکھ بہت کمزور ہو رہا ہے۔" رقیہ بیگم نے فکر مندی سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے ثمینہ کو تاکید کی۔

"آج کل خالہ بُو نظر نہیں آ رہیں۔ اماں کہیں اُن سے تمہاری لڑائی تو نہیں ہو گئی ہے۔ ویسے ایک بات ہے۔ ہیں تو دبلی پتلی، چھوٹی سی لیکن زبردست چیز ہیں۔" ثمینہ نے خالہ بُو کی غیر حاضری کو نوٹ کرتے ہوئے رقیہ بیگم سے پوچھا۔

''ارے وہاں دبئی میں اُن کا بیٹا بہت پریشانی میں ہے۔ بیمار ہے اس لیے وہ آج کل کافی پریشان ہیں۔ اپنے گھر گئی ہوئی ہیں۔ میں نے بہت روکا تو کہنے لگیں، میرا دل گھبرا رہا تھا، ویسے پیسوں کی طرف سے بھی پریشان تھیں کہنے لگیں کہ جا کے اپنے جیٹھ سے بات کرتی ہوں تا کہ کچھ بندوبست ہو تو بیٹے کو بھیجوں۔'' رقیہ بیگم نے ہمدردانہ لہجے میں خالہ بڑو کا مسئلہ بتایا۔

''اللہ خیر کرے! اُن کا ایک ہی بیٹا ہے نا اماں۔'' ثمینہ نے پوچھا۔

''ہاں! ایک ہی تو ہے۔ چھ مہینے کا تھا تو باپ مر گیا تھا۔ ساری زندگی خالہ بڑو نے تیری میری چاکری کر کے اس بیٹے کو پالا ہے۔ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ اب بہار دیکھنے کے دن آئے تو...... بے چارہ لڑکا بیمار ہوگیا۔'' رقیہ بیگم، خالہ بڑو کے لیے حقیقتاً پریشان تھیں۔

☆......☆......☆

''کبھی کبھی سوچتی ہوں اس سارے فسانے میں زرقون کا کیا قصور ہے۔ وہ بچی تو بے موت ماری جا رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ مریم کے قدم سسرال میں جم رہے ہیں۔ اللہ اُس کی گود بھر دے تو میری بچی کے قدم اور مضبوط ہو جائیں گے۔ کیسی ہنستی مسکراتی رہتی تھی زرقون۔ اب تو ایک چپ سی لگ گئی ہے۔ یہ سب لوگ باتیں بنا رہے ہیں، وہ تو میری گود میں کھیل کر بڑی ہوئی ہے۔ اب چند برسوں میں وہ اتنا بدل جائے گی۔ دل نہیں مانتا لیکن پھر وہی بات کہ پاس پڑا جانے یا ساتھ بسا جانے۔ لیکن اُس کی مامی تو بہت عجیب سی باتیں کر رہی تھیں۔ اُف!''

''بس بہن آپ کو کیا بتاؤں! ہم تو انسانی ہمدردی کے تحت آپ کے پاس آئے ہیں۔ ورنہ مجھے تو آپ کے گھر کا پتا بھی نہیں معلوم تھا۔ بڑی مصیبت سے معلوم کیا ہے، میں نے سوچا ایک بیٹا تو آپ کا ملک سے باہر رہتا ہے اور دوسرا...... دوسرا تو اُس لڑکی کا بے دام غلام ہے۔ چلو بھئی مانے لیتے ہیں جوانی میں تو سارے ہی غلام ہوتے ہیں لیکن بھائی آپ کا بیٹا تو بے نکاح کا بے دام غلام ہے۔

باپ کو تو زری نے ایک کونے میں بٹھا دیا ہے اور سارے گھر کی اماں بنی پھرتی ہے۔ کیا 'پیا ہی' نیندیں تنگ کریں گی۔ جو اُس کنواری نند نے میری بیٹی کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ زبان تو اُس کی کندھوں پر پڑی رہتی ہے۔ کیوں خالہ بڑو۔'' رقیہ بیگم نے کہتے کہتے اپنی چچی خالہ بڑو سے تائید چاہی۔

''اور کیا رفیق احمد کو تو کچھ بیٹی کے علاوہ نظر ہی نہیں آتا، وہ تو اُس بدزبان کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اُسی بدزبان کے کانوں سے سنتے ہیں۔ جو ہماری بچی دن میں کمرے کا دروازہ بند کرلے تو آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ لات مار کر دروازہ کھولتی ہے۔ مجال نہیں ہے اُس ''پیا ہتا'' کی کہ دن میں کسی وقت نیند پوری کر لے۔ جب تک فہمیدہ بیگم زندہ رہیں انہوں نے بیٹی کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی۔ ارے اب تو ایسی بے مہار ہوگئی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔'' خالہ بڑو نے رقیہ بیگم کی باتوں میں پھول ٹانکا۔

''یقین نہیں آتا، لیکن پھر بھی آپ لوگ یہ باتیں مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔'' جہاں آرا بیگم نے کچھ اُلجھے اُلجھے لہجے میں ایک غائب دماغی کی کیفیت میں اُن دونوں سے پوچھا۔

''ارے بہو تم تو بہت ہی سیدھی ہو۔ خود سوچو، ہم جو تمہارے گھر کبھی آئے نہیں۔ لیکن آج آئے ہیں تو کوئی تو مقصد ہوگا۔ بس بہن آج تمہاری بات سن کر یقین ہوا کہ اللہ اپنے معصوم اور سیدھے سادے بندوں کی کس

کس طرح مدد کرتا ہے۔" رقیہ بیگم نے خالہ بنو کی بات بیچ میں سے کاٹتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا۔
جہاں آرا کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہیں۔
"دراصل" خالہ بنو نے پان کا ٹکڑا دائیں کلّے میں رکھا اور پھر کہتے میں "مسّی" ہوئی انگلیاں سر پر پھیر کر صاف کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو جہاں آرا بیگم نے جلدی سے تخت کے نیچے سے اُگالدان نکال کر اُن کے سامنے رکھا۔ دراصل خالہ بنو نے پیک اُگالدان میں تھوک کر دوپٹے کے پلو سے ہونٹوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔
"تو یہ ہے، اب اِن کی ریل گاڑی دراصل پر ہی اٹک گئی۔ کتنا سمجھا کر لائی تھی اِس ننگی بھوکی کو کہ کھانے پر نہیں ٹوٹنا بلکہ جو بات سوچی ہے اُس کو تکمیل کرنا، لیکن یہ عورت...... لعنت ہے اس پر۔" چہرے پر مسکراہٹ سجائے بیٹھی رقیہ بیگم نے کھولتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔
"جی...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" جہاں آراء بیگم بھی اُلجھیں۔
"دراصل بنو میری بات یہ ہے کہ تم اپنے بیٹے کو بچاؤ۔ رات دن وہاں پڑا رہتا ہے۔ زری کے آنکھ کے اِشارے پر چلتا ہے۔ باپ تو باپ اُس نے تو آپ کے بیٹے کو بھی اپنا بے دام غلام بنا رکھا ہے۔ ہم پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا بیٹا اُس سے شادی کرے یا آپ خوشی سے یا مجبوری سے اُس کو اپنی بہو بنا کر لائیں۔ لیکن بہن انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آپ نے تنکا تنکا جوڑ کر یہ گھر بنایا ہے۔ اب اِس گھر کو اُس لڑکی سے بچائیں جو آپ کے گھر کو بھسم کر کے رکھ دے گی۔" خالہ بنو نے رقیہ بیگم کے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔
"اور ویسے بھی بیٹوں کی دل چڑھی اور منہ چڑھی لڑکیوں کو دور...... ہی رکھنا چاہیے۔" رقیہ بیگم نے جہاں آرا بیگم کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔
"ہاں...... یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ میں نے بہت سارے بسے بسائے گھر، صرف خراب لڑکیوں کے آنے کی وجہ سے، برباد ہوتے دیکھے ہیں۔ ہماری ساس کہا کرتی تھیں کہ بیٹیوں کے اچھے نصیب کی تو سب ہی دُعا کرتے ہیں لیکن بیٹوں کے اچھے نصیب کی بھی دُعا کرنی چاہیے کہ اگر بیٹوں کا ہاتھ پکڑ کر خراب لڑکیاں گھروں میں داخل ہو جائیں تو خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، اور اِس بات کا مشاہدہ میں نے اپنی زندگی میں کیا ہے اور اللہ پھر نہ دکھائے۔" جہاں آراء بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں رقیہ بیگم اور خالہ بنو کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کمبخت بدنصیب کیسے باتیں سُنا رہی ہے، سمجھ رہی ہے جیسے میں اِس کی بات نہیں سمجھ رہی ہوں، ارے سب سمجھتی ہوں۔ اِس کے تو آج تک آگ لگی ہوئی ہے کہ اِس کی کالی کلوٹی بیٹی کی جگہ، میری بیٹی بیاہی گئی۔ ارے میں کون سا اِس رشتے سے آج خوش ہوں۔ ہائے...... اندازہ ہوتا کہ بازی پلٹ جائے گی۔ شطرنج کے مہرے اپنی ترتیب بدل دیں گے۔ تو میں کاہے کو اپنی بیٹی بیاہتی، لیکن جو بھی ہو کم از کم اِس گھر میں، میں اپنی جیتی زندگی میں زرقون کو نہیں آنے دوں گی۔ میں فہمیدہ بیگم کی بیٹی کے دل کی خوشی چھین لوں گی۔ ایک ایسی کسک جو ساری زندگی میرے دل میں چبھتی رہی۔ وہ اُس کی بیٹی کے دل میں رہے اور فہمیدہ اپنی قبر میں بھی بے چین رہے۔" رقیہ بیگم نے کمرے میں جگمگاتے فانوس پر نظریں جمائے جمائے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجائے، اپنے دل سے کہا۔
"دیکھو بہن، تمہاری مرضی، ہمارا کام تھا تم کو اصل بات بتانا، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو۔" رقیہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جہاں آرا بیگم کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی سوچ کو پڑھتے کہا۔
"چلو بہن ہمارا کام تھا کہ تم کو سمجھائیں باقی تم جانو۔" خالہ بنو بھی کھڑی ہو گئیں۔

''میرا کام۔'' جہاں آرا بیگم نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔
''کیا بات ہے امی! میں دیکھ رہی ہوں کہ بہت دیر سے آپ نہ جانے کن سوچوں میں گھری بیٹھی ہیں۔''
مریم نے ماں کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
''کچھ نہیں بیٹا...... بس اِسی اُدھیڑ بُن میں ہوں کہ کیا کروں؟'' جہاں آرا بیگم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے حال میں واپس آتے ہوئے کہا۔ صاف ستھرا چہرہ، قرینے سے بندھے بال، آنکھوں میں اُلجھن، ہاتھوں میں سونے کے موٹے موٹے کڑے، سر پر نفیس چکن کی بیل سے سجا دوپٹا، مریم نے بغور ماں کا چہرہ دیکھا۔
''کیسی اُلجھن امی؟'' مریم کا سوال حسبِ حال تھا۔
''سوچتی ہوں زرقون کا معاملہ کس طرح حل کروں؟ تمہارے ابا ایک لفظ سُننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور فراز...... فراز کے دل کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سوچتی ہوں اللہ کرم کرے تم تو اپنے گھر کی ہوئیں۔ فہمیدہ بیگم قبر میں جا سوئیں۔ بیٹے کے دل کی خوشی اُس دے دوں لیکن پھر آس پاس کے لوگ...... رشتہ دار ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں تو میں ڈر سی جاتی ہوں۔'' جہاں آرا بیگم نے دل کھول کر بیٹی کے سامنے رکھا۔
''کون باتیں کر رہا ہے امی۔'' مریم کے لہجے میں ایک تجسس تھا۔
''ارے کون؟ وہی تمہاری چچی کی بھاوج اور رشتہ دار، اور کون، فراز کو دیکھتی ہوں تو دل کٹتا ہے، بہت خاموش رہنے لگا ہے، تمہارے ابا کی بھی یہی ضد ہے کہ فراز کی دلہن زری کے علاوہ کوئی اور نہیں بنے گی۔ گھر میں خوشی ہے، احمر کے نکاح میں دو چار دن رہ گئے لیکن لگ رہا ہے گھر کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی فکر میں مبتلا ہے۔ تم کو ایسا نہیں لگتا کیا بیٹا؟'' جہاں آرا بیگم نے بے چینی سے ہاتھوں کی انگلیاں مسلیں اور مروڑتی مریم سے پوچھا۔
''دیکھیے امی کون کون زرقون کے خلاف باتیں بنا رہا ہے مجھے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن ہاں اِس کی بہت خوشی ہے کہ جن لوگوں کے لیے انہوں نے ہمارے ساتھ خاص کر میرے ساتھ بُرا کیا آج وہی لوگ ہاتھوں میں خنجر لیے اُن کے سینوں میں اور اُن کی پشت پر گھونپ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اور امی میں اپنے گھر کی نہیں ہوئی مجھے آپ نے ایک مکان میں رُخصت کیا ہے۔ اُس کو گھر بنانے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے۔ کتنی قربانیاں دینی پڑیں شاید میری عمر گزر جائے۔ میں قبر میں جا لیٹوں۔ اور آپ اُن لوگوں پر ترس کھا رہی ہیں۔ ابا اُن کی حمایت کر رہے ہیں۔ فراز زری کے لیے تڑپ رہا ہے۔ تو پھر امی، میری کس نے حمایت کی۔ میرے لیے کون لڑا۔ میں رات دن میاں کی باتیں سنوں۔ طنز اور طعنے سہوں۔ ساس، نندوں کی جوتیاں سیدھی کروں۔ میری تقدیر یہی ہے؟ اور یہاں آ کر زرقون بیگم عیش کریں۔ اور فراز...... فراز تو اُس کا ایسا غلام بنا پھرتا ہے کہ مجھے تو فراز سے بھی بہت شکایت ہے۔ میں تو اکیلی رہ گئی امی۔ اور ہمدردی میں ڈوب کر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ میری شادی کی بنیاد آپ نے ایک وعدے پر رکھی تھی۔ اور وہ وعدہ ہی میری شادی شدہ زندگی کی ضمانت ہے۔''
مریم نے جلے بھنے لہجے میں ماں، کے آگے شکایتوں کی گٹھری کھول دی۔
'ہاں...... یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ میرے منہ سے روانی میں نکلی ایک بات میری بیٹی کے لیے آزمائش بن جائے گی۔' جہاں آرا بیگم نے دل میں سوچا۔
''چلو چھوڑو! میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی، اِس گھر کے لیے سب سے اہم تمہاری خوشی اور تمہارا گھر ہے۔ ذرا

تحمل سے کام لو، احمر کا نکاح خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ دُلہن خیر سے آ جائے۔ پھر اس معاملے کو اُٹھاؤں گی۔ تم مجھے ذرا سوچنے دو۔" جہاں آرا بیگم نے بیٹی کے فکرمند اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے اُس کو تسلی دی۔

"لیکن امی میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ فراز کی شادی کا فیصلہ میری مرضی سے ہوگا۔" مریم نے آہستہ لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

جہاں آرا بیگم نے مریم کو بہلایا۔

"میں۔" مریم کے لب تھرتھرائے۔

☆......☆......☆

"میں جانتا ہوں بیٹا تم اُلجھ رہی ہو۔ تم سوچ رہی ہو میں تمہاری زندگی کا فیصلہ بہت جلد بازی میں کر رہا ہوں لیکن میری بچی ایک باپ کی مجبوری کے بارے میں سوچو گی تو شاید تم مجھ کو معاف کر دو گی۔ ایک باپ کا حق استعمال کرتے ہوئے میں نے تم سے پوچھے بغیر ہاں کر دی لیکن اب تم کو اِس قدر افسردہ دیکھ کر سوچ رہا ہوں شاید میں نے غلطی کر دی ہے۔ سلطان میرے تایا زاد بھائی ہیں۔ دبئی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ اُن کی تمہارے تایا سے دوستی ہے۔ میرے لیے وہ بھائی جان کی طرح ہیں۔ میں اُن کو بھی بھائی جان کہتا ہوں۔ اُن کا بھائی جان سے رابطہ رہتا ہے۔ مجھ کو پتا چلا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے تیمور کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے بھائی جان سے اصرار کیا کہ وہ تمہارے رشتے کے سلسلے میں بات کریں۔ میں جانتا ہوں تم ابھی چھوٹی ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ابھی پڑھ رہی ہو۔ لیکن بیٹا گھر کے حالات اور میری صحت اِس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں تمہارے اور زرقون کے معاملے میں ذرا سا بھی ٹائم لوں۔ میں چاہتا ہوں تم اور زرقون جلد از جلد میری زندگی میں اپنے اپنے گھر کی ہو جاؤ کیونکہ جوان بیٹی اور مچھلی دونوں کو زیادہ دیر تک گھر میں نہیں رکھتے۔ تیمور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ دبئی میں ڈاکٹر ہے۔ نیک اور صالح ہے اور بیٹا میرے لیے اِس سے بڑی خوش نصیبی کی بات کیا ہوگی کہ میں نے چاہا اور اللہ نے سُن بھی لیا۔ اللہ نے میری تہجد گزار اور نیک بیٹی کے لیے ایک صالح لڑکے کا پیغام بھیج دیا۔ میں نے ہاں کر دی ہے بیٹا! اِس اُمید کے ساتھ کہ تم مجھ پر بھروسا کرو گی اور میرے اعتماد کا مان رکھو گی۔" رفیق احمد نے سر جھکائے آنسو پیتی مومنہ کے سامنے تیمور کی تصویر رکھتے ہوئے اُس کے سر پر اپنا پُرشفقت ہاتھ رکھ کر کہا۔

سارے کمرے میں ایک بھید بھری خاموشی تھی۔ کمرے کے کھلی کھڑکی سے چنبیلی کی بیل جھانک رہی تھی اور چنبیلی کے پھولوں کی مدھر خوشبو کمرے میں بیٹھے ہر ذی نفس کو ایک عجیب سی تازگی کا احساس دلا رہی تھی۔ سبز کارپٹ پر سفید لفافہ اور لفافے سے جھلکتا تیمور کا چہرہ...... گھر میں ایک خوشی کی نوید دے رہا تھا۔

زرقون خاموش باپ کے پیروں کے پاس بیٹھی کبھی سر جھکائے آنسو پیتی اور آنسو بہاتی مومی کو دیکھتی اور کبھی کچھ خوش، کچھ پریشان اور بہت اُداس باپ کے چہرے پر نظریں جما دیتی۔

زندگی میں بہت سارے فیصلے اِنسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کرتا ہے۔ بعض اوقات غلط فیصلے بھی اُس سے ہو جاتے ہیں لیکن رفیق احمد اُن خوش قسمت لوگوں میں سے تھے کہ وقت کا دھارا اُن سے کوئی غلط فیصلہ نہیں کروا رہا تھا۔ انہوں نے مومی کے لیے ایک بہترین لڑکا چنا تھا۔ لیکن مومی؟

رفیق احمد نے ذرا سی گردن کو ترچھا کر کے زرقون کی طرف دیکھا۔ جس کا مطلب تھا۔ آگے بڑھو! زرقون باپ کے ہر انداز سے واقف تھی۔ ہر بات سمجھتی تھی۔ سو باپ کی آنکھوں میں چھپی تحریر اُس نے پڑھ لی اور پھر وہ

اپنی جگہ سے اُٹھ کر موی کے برابر آ بیٹھی۔ اُس نے اپنا سیدھا بازو موی کے گرد لپیٹ کر اُس کو اپنے قریب کیا۔ اُلٹے ہاتھ سے اُس کے چہرے پر بار بار آتے بالوں کو سمیٹا، دوپٹے کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھے اور ایک ماں کی طرح اُس سے کہا۔

''میری گڑیا تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تم جو کچھ سوچ رہی ہو بلا تکلف کہہ دو۔ ابا تمہارا جواب سُننے کے منتظر ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو بلا تکلف ابا کو بتا دو۔ لیکن یہ نہ کہنا کہ ابا میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ کیا میں آپ پر بوجھ ہوں؟ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی؟''

زرقون نے سنجیدگی سے کہتے کہتے ایک دم ٹون بدل لی تو مومنہ کے ساتھ ساتھ رفیق احمد مسکرا دیے۔ مومنہ نے سر اُٹھا کر رفیق احمد کی طرف دیکھا۔

''بولو بیٹا...... کیا کہنا چاہتی ہو۔ بخدا اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں بھائی سلطان سے معذرت کرلوں گا۔ غلطی شاید میری ہے۔ اِتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے اپنی چھوٹی سی بیٹی سے ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔''

رفیق احمد کے لفظوں نے موی کو سہارا دیا۔ اُس نے حلق میں اٹکا تھوک نگلا۔

''ابا میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے حکم اور اعزاز کا درجہ رکھتا ہے۔ مجھے صرف اِس بات کا دُکھ ہے ابا آپ نے فیصلہ کرلیا تو بس...... آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ ابا میں آپ کے ہر فیصلے پر راضی ہوں۔ میں ایک خوش نصیب لڑکی ہوں جس کی زندگی کا فیصلہ اُس کے باپ نے اِس اعتماد کے ساتھ کیا کہ میں انکار نہیں کروں گی۔ ابا میں آپ کے اِس اعتماد پر شکر گزار ہوں۔ ابا میں راضی ہوں...... میں راضی ہوں ابا۔''

مومنہ رفیق احمد کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور رفیق احمد کے آنسو اُن کی آنکھوں سے نکل کر اُن کی داڑھی سے ہوتے ہوئے مومنہ کی سیدھی مانگ میں چھپ رہے تھے۔ اُس مانگ میں جس میں چند دن بعد افشاں بھرنے والی تھی۔

☆......☆......☆

''ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے......''

زرقون جو صحن میں کھڑی پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ گھبرا کر مڑی کیونکہ نرگس اُس سے لپٹ کر گا رہی تھی۔ زری کے ہاتھوں سے پانی کا پائپ چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ پانی ڈھل ڈھل بہہ رہا تھا۔ لیکن نرگس زبردستی زرقون کی کمر میں ہاتھ ڈالے، گا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت بال اُس کی کمر پر چوٹی کی صورت میں لپٹے لہرا رہے تھے۔ اُس کے کندھے پر ہمیشہ توازن میں رہنے والا اُس کا دوپٹا کندھے سے اُتر کر زمین پر رُل رہا تھا۔ لیکن نرگس کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''چلو دلدار چلو...... چاند کے پار چلو'' نرگس نے دوسرا گانا شروع کر دیا تھا۔

''یا اللہ نرگس کیا ہو گیا اللہ کے واسطے چھوڑو۔ نل تو بند کرنے دو۔ ساری ٹنکی خالی ہو جائے گی۔'' زرقون نے نرگس کے بازوؤں کے محبت بھرے حصار سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ختم ہونے دو۔ ساری دنیا کو ختم ہونے دو۔ زری ڈارلنگ آج صرف تم میرے ساتھ گاؤ، ناچو، ہنسو'' نرگس نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُس کو گھما ڈالا۔

''نرگس پانی بہہ رہا ہے۔'' زری سمجھ تو گئی تھی کہ ایسی کوئی انہونی ضرور ہوئی ہے۔ جو نرگس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ کچھ کچھ اُس کو شک تو ہو رہا تھا۔ لیکن یقین......

''زری آپا آپ ایک دو ٹھمکے ماریں، نرگس باجی آپ کو ایسے چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہیں، جہاں تک نل کی بات ہے تو نل، نالیاں، کھڑکیاں اور دروازے میں سب بند کر چکی ہوں کیونکہ جس بے سرے انداز میں کھلے صحن میں ناچ گانا ہو رہا ہے میں ڈر گئی کہ راہ چلتے کسی کی نظر پڑ گئی تو شاید بہت جلد ہم ناظم آباد سے ڈیفنس شفٹ ہو جائیں گے۔ لیکن اس طرح شفٹ ہونا ہم جیسے شریف اور خاندانی لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا۔'' مومنہ جو نہ جانے کب سے کھڑی نرگس کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ مسکراہٹ دبا کر لہجے کو سنجیدہ بناتے ہوئے بولی۔

''لعنت ہو تم پر موی! سارے جذبات کی ریڑھ لگا دی۔'' نرگس نے جل کر زری کو چھوڑا۔ اور ہانپتے ہوئے صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔

''ارے...... رے...... نرگس باجی آپ کو بُرا لگ گیا۔ چلیں موڈ ٹھیک کر لیں، میں کھڑکی دروازے کھول دیتی ہوں۔ ہم کیوں سارا محلہ ٹل کرنا ہے۔'' مومنہ نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔

''چپ رہو موی۔'' زرتون نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے مصنوعی خفگی سے موی کو چپ کروایا۔

''خیر یہ بتاؤ نرگس ڈارلنگ اِس چھچھور پن کی کوئی خاص وجہ۔ مابدولت یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تم اچھی خاصی گھٹیا ہو، لیکن اتنی چھچھوری بھی ہو، اِس بات کا اندازہ آج بخوبی ہوا ہے۔ لیکن مائی ڈیئر اِس قدر بھدی اور بے سُری آواز کے ساتھ آپ گا رہی تھیں یا رو رہی تھیں پلیز اِس کو ضرور واضح کر دو۔'' زری نے تیزی سے وائپر سے آنگن کو خشک کرتے ہوئے نرگس کو چھیڑا۔

''زری...... تم کیسی دوست ہو؟'' نرگس بلبلائی۔

''میں بہت پیاری دوست ہوں میرا قد 5 فٹ 6 انچ ہے۔ رنگ گورا ہے، سیاہ لمبے بال اکثر میری کمر پر جھولتے ہیں۔ صاف ستھرے ہاتھ پیر ہیں، اکیڈمک کوالیفکیشن یہ ہے کہ ایم ایس سی کر رہی ہوں۔ ہر سال پوزیشن لیتی ہوں۔ اکثر میری نقل کر کے تم بھی پاسنگ مارکس لے ہی لیتی ہو۔ اور''

''Oh My God زری۔ تم بولے چلی جا رہی ہو۔ میری تو سُن لو۔'' نرگس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے زری کی بات کو بیچ میں کاٹا۔

''تو کیا ناچ، گانے، اُچھلنے کے بعد، اب تمہارا کچھ بولنا بھی باقی ہے، بولو...... نرگس بولو...... خدا کے واسطے بولو...... اگر تم نہیں بولو گی، تو دھرتی روئے گی۔ آسمان برسے گا۔ درخت سوکھ جائیں گے۔ پرندے گھونسلوں سے اُڑ جائیں گے۔ تم بولو۔ پلیز بولو۔ زری نے اُس کو ستانے کی حد کر دی۔

''دفع ہو تم۔ مرو، میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔'' نرگس نے جل کر کہا اور اُٹھ کر جانے لگی۔

''ارے...... رے رُکیں نرگس باجی کہاں جا رہی ہیں، باہر مجمع لگا ہوا ہے لوگ اُس عظیم گلوکارہ کی ایک جھلک دیکھنا چاہ رہے ہیں جو پچھلے آدھے گھنٹے سے گا رہی تھی۔

گا رہی تھی...... یا رو رہی تھی؟'' مومنہ نے ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر چہرے پر دُنیا بھر کی معصومیت طاری کرتے ہوئے عجیب پُراسرار سے لہجے میں کہا۔

''موی۔'' زری نے نرگس کو دیکھتے ہوئے موی کو ٹوکا۔

''چلو نرگس! اب مذاق ختم۔ تم بتاؤ اِس قدر خوش کیوں ہو؟'' زری نے محبت سے ناراض بیٹھی نرگس کے نرم و سفید کبوتر جیسے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے پوچھا۔ نرگس خاموش رہی۔

''بتاؤ نا نرگس...... چلو Sorry۔'' زری نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اور موی چلو تم مرغا بن جاؤ۔'' زری نے موی سے کہا۔

''پر زری باجی میں مرغا نہیں بن سکتی۔'' موی نے معصومیت سے کہا۔

''کیوں اِس قدر مذاق اُڑا سکتی ہو، کھڑکیاں دروازے بند کرسکتی ہو، مجھ پر کٹ لگا سکتی ہو، تو مرغا کیوں نہیں بن سکتیں تم۔'' نرگس نے کرسی پر بیٹھی پاؤں ہلاتی چوڑیوں سے کھیلتی موی کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اِس لیے نرگس باجی کہ میں لڑکی ہوں، میں مرغا نہیں لیکن مرغی بن سکتی ہوں۔''

''بن جاؤ۔'' موی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور نرگس کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

''پتا ہے زری...... ابھی آفتاب کا فون آیا تھا۔'' نرگس نے خوشگوار موڈ کے ساتھ زری کو بتایا۔

''تم کہاں جارہی ہو موی...... تم بھی آؤ۔'' نرگس نے اُٹھ کر جاتی موی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

'تو کون سی نئی بات ہے آفتاب بھائی کا فون تو روز آتا ہے بلکہ آسمان پر آفتاب بعد میں نکلتا ہے۔ زمین کا آفتاب آپ کو پہلے اُٹھاتا ہے۔ صرف اُن کے فون کرنے کی وجہ سے اکثر ٹیلیفون کی لائن منجمد ہوجاتی ہے، نیٹ ورک بڑی ملتا ہے اور تھک ہار کر وزیر داخلہ فون بند کررہے ہیں۔' زری سوچ کر رہ گئی کیونکہ وہ جانتی تھی اِس وقت اُس کا یہ مذاق پھر نرگس کا موڈ خراب کردے گا۔ لہٰذا وہ اپنی سوچ پر صرف مسکرادی اور یہ بات اُس آئندہ کے لیے رکھ لی۔

''پتا ہے زری! آفتاب کے ڈیڈی راضی ہوگئے ہیں اور آج شام وہ ہمارے گھر آرہے ہیں۔'' نرگس نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں تھیلے سے بلی نکالی۔

''واقعی!!! زبردست۔'' موی اور زری نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

''مبارک ہو نرگس، بہت بہت مبارک ہو۔ تم اِس خوشی کو انجوائے کرنے کا حق رکھتی ہو۔ میری بہن بہت بہت مبارک ہو۔'' زری کے لیے یہ خوشی، نرگس کی خوشی، بہت انمول تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتائے، دیکھو، محبت میں جیت ہوتی ہے۔

غم محبت اگر ہوتی ہے
تو
جیت بھی ہوتی
محبت تکمیل ہوتی ہے

''لیکن اِتنا اچانک، کیسے مان گئے آفتاب بھائی کے ڈیڈی۔'' زری نے بے تابی سے پوچھا۔

''آفتاب بتارہے تھے۔''

''کیا ہوا بھئی کیوں شور مچار کھا ہے۔ ویسے تو تم لوگ بڑی مہذب اور شریف زادیاں بنتی ہو۔ اور اب ایسے اونچے اونچے قہقہے لگارہی ہو۔ سونے بھی نہیں دیتی ہو۔ کیا ہوا، ایسا کیا خزانہ مل گیا تم لوگوں کو؟'' ثمینہ دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر ہاتھ رکھے غضب ناک لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

اپنی خوشی میں مگن وہ تینوں یہ تو بھول ہی گئی تھیں کہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی ثمینہ آج گھر پر ہی موجود ہے۔

☆......☆......☆

پتا نہیں شیری کیا کررہی ہوگی، کہہ رہی تھی کہ اِس دفعہ کیونکہ میں کافی دنوں کے لیے جارہا ہوں تو وہ گھر کوری

ڈیکوریٹ کرے گی۔ ری ڈیکوریٹ گھر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ ہماری زندگیوں کو بھی ری سیٹ کردے۔ شادی شدہ زندگی ایک معاہدہ ہوتی ہے لیکن ہم ساری باتیں، عورت سے کیوں منسوب کردیتے ہیں۔ اقرار اور عہد تو مرد اور عورت دونوں ہی کرتے ہیں نا۔ کوئی بات نہیں اِس دفعہ گھر بسانے کے لیے میں جھکوں گا۔ انشاء اللہ...... میں شیری کی غلطیوں کو، کوتاہیوں کو نظر انداز کروں گا۔ تو اللہ خوش ہوگا۔

بلکہ میں شیری سے کہوں گا کہ اب ہم Baby Plan کرتے ہیں۔

Baby آہ Baby بھی اللہ کی کیسی انمول نعمت ہے۔ انشاء اللہ جب کوئی ننھی منی سی بے بی شیری کی گود میں کھیلے گی۔ تو شیری خود بخود ایک ماں بن جائے گی۔

'لیکن شیری ایک دفعہ پہلے بھی تو ماں بننے جارہی تھی۔' اُس کے اندر سے کسی نے تنبیہ کی۔

'میں سب کچھ بھولنا چاہتا ہوں، جب رشتہ استوار کرنا ہو تو پرانی باتیں، دل دکھانے والی، باتیں نہیں کرنی چاہئیں اور نہ ہی یاد کرنا چاہیں۔' مرتضیٰ نے دل کو سمجھایا۔

مرتضیٰ کا کام مغربی جرمنی میں جلد سمٹ گیا تھا اور وہ لاس ویگاس جارہا تھا۔ اُس نے شیری کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اُس کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اُس نے پہلی دفعہ بہت محبت سے شیری کے لیے شاپنگ کی تھی۔

''تم مجھ کو یاد کروگی نا۔'' مرتضیٰ نے شیری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' شیری اٹھلائی۔

''کیوں؟ میں تم کو یاد نہیں آؤں گا۔ تم اب تک مجھ سے ناراض ہو؟'' مرتضیٰ کے بازوؤں کا گھیرا اُس کی کمر کے گرد تنگ ہوا۔

محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے لیکن اگر محبت کرنی پڑے تو کس قدر مشکل ہوتی ہے یہ کوئی مرتضیٰ سے پوچھتا۔

''پتا نہیں۔'' شیری کھلکھلائی۔

''بولو نا...... دیکھو میں جارہا ہوں ایسا نہ ہو۔ واپس ہی نہ آؤں اور پھر تم کو ملال رہے۔ ارے آخری بار پوچھ رہا تھا مرتضیٰ کہہ ہی دیتی۔'' مرتضیٰ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شہد بھرے لہجے میں کہا۔

''بیٹا عورت مرد کی محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔ محبت کروگے تو تمہارے پیروں سے لپٹی رہے گی اور جو محبت نہیں کروگے تو تم کو شاید چھوڑ کر تو نہیں جائے گی لیکن تمہاری چوکھٹ پر ڈری سمٹی بیٹھی رہے گی' اور پھر تم اُس کی خوبیوں سے، اُس کی نرمیوں سے کبھی واقف نہیں ہوگے۔'' مرتضیٰ کو اپنی ماں کی نصیحت یاد تھی۔

''میں ایک ایک لمحہ تمہاری کمی محسوس کروں گی۔ تم کو یاد کروں گی۔ بس تم جلدی سے آجانا، لیکن آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کرنا تاکہ میں دلہن کی طرح سج سنور کر تمہارا انتظار کروں۔'' شیری کے اندر بسنے والی شبانہ نے اُس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اور مرتضیٰ کی روح سرشار ہوگئی۔

جہاز لینڈ کرچکا تھا، وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اُس نے شیری کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کے بغیر وہ کیسی ہوگی۔ اُس نے ریموٹ سے گیراج ڈور کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ اُس نے سیکنڈ چابی سے دروازہ کھولا اور بریف کیس لاؤنج میں رکھ کر دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ سارے گھر میں 'ہو' کا عالم تھا، سناٹا تھا۔

''شیری کہاں ہے؟'' اُس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ وہ کچن کی طرف بڑھا۔ کچن کا دروازہ بیک یارڈ میں کھلتا تھا۔ اُس نے کچن میں قدم رکھا۔ سنک میں رکھے برتن اِس بات کی گواہی

دے رہے تھے کہ یہاں لنچ ہوا ہے۔ کافی کے دو کپ کسی مہمان کی اطلاع دے رہے تھے۔ سینٹر ٹیبل پر رکھی وائن کی بوتل اور دو گلاسوں نے اُس کو دو قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔

یا اللہ شیری آج تک بیوقوفی کی حد پر کھڑی ہے یقیناً میری غیر موجودگی میں اُس کی دوست فوزیہ اپنے امریکن بوائے فرینڈ کے ساتھ آ گئی ہوگی اور بیوقوف شیری اُن دونوں کو موقع فراہم کر کے شاپنگ کے لیے چلی گئی ہوگی۔ بیک یارڈ سے آتی مرد و زن کی خوشی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز نے اُس کے شک کو تقویت دی اور اُس نے آہستگی سے بیک یارڈ کا دروازہ کھول دیا۔

چکوزی میں بیٹھے مرد و عورت آشنائی کی آخری حدوں پر عبور کرتے دنیا و مافیا سے بے خبر ایک دوسرے میں مگن تھے۔ چند لمحوں تک اُس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس کی نظریں شیری کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن شیری تو......

اُس کے حواس آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگے اور پھر اُس نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

''ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ چلو بھئی میں کون ہوتی ہوں لیکن کم از کم آپ سے تو پوچھتے۔ آپ سے تو مشورہ کرتے۔ یہاں تو سارے ہی کام بالا بالا ہوجاتے ہیں۔ لو بھئی بڑے کا منہ ہمارا کھلتا ہے اور اوقات ہماری دو ٹکے کی بھی نہیں۔'' ثمینہ نے عرفان کے کان بھرے، جب سے مومنہ کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اُس کا غصے سے برا حال تھا وہ یہ بات کسی طور ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ گھر میں کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی بدگمان تھی۔

''آپ سُن رہے ہیں نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' ثمینہ نے اطمینان سے کھانا کھاتے عرفان سے تڑخ کر پوچھا۔

''میں سُن رہا ہوں میری جان، سب سُن رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں لیکن میں جانتا ہوں ہمارے گھر کے فیصلے ہمیشہ ابا اور امی کیا کرتے تھے، لہٰذا ابا کے فیصلے پر مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ابا نے جو مناسب سمجھا، وہ فیصلہ کردیا...... وہ بڑے ہیں۔'' عرفان نے رسان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' عرفان کا جواب ثمینہ کی توقع کے خلاف تھا۔

''چلو چھوڑو...... ابا کہہ رہے تھے ابھی صرف نکاح ہے، رُخصتی انشاء اللہ چھ ماہ بعد ہوگی۔ میں ابا سے کہوں گا۔ وہ تم سے پوچھ کر ہی بات کریں۔'' عرفان نے اُس کو بہلایا۔

'یا اللہ یہ سارے تعویذ اُلٹ ہورہے ہیں۔ یہ غلام تو اور غلام ہوگیا، لعنت ہو ہماری اماں اور خالہ بتو پر۔ مال مجھ سے بٹور رہی ہیں اور تعویذ اُلٹ ہورہے ہیں۔ صبح ہی جاؤں گی اُن شاہ صاحب کے لتے لینے۔' ثمینہ نے کھولتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

''میں جانتا ہوں ثمینہ بہت اچھی ہے۔ مخلص اور محبت کرنے والی، زبان کی ضرور خراب ہے لیکن دل کی بہت اچھی ہے لیکن ہمارے گھر والوں کو اُس کی قدر ہی نہیں ہے۔ میں تو عجیب منجدھار میں پھنس گیا ہوں۔ حق بات کروں یعنی ثمینہ کی حمایت کروں تو زری ناراض ہوتی ہے اور ابا اُس کی حمایت کرتے ہیں اور جو ابا اور زری کے معاملے میں خاموشی اختیار کروں تو ثمینہ کا دل دُکھتا ہے۔

امی زندہ ہوتیں تو سارے معاملے خود ہی سنبھال لیتیں، یہ گھریلو جھگڑے یہ تیر میر میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں کیسے ثمینہ جیسی سیدھی سادی لڑکی کو سمجھاؤں کہ مجھے دنیا میں اُس سے زیادہ کچھ عزیز نہیں ہے۔ لیکن میں مجبور

ہوں۔ابا دوکان کا حساب مانگ رہے ہیں اور ڈاکٹر تابندہ......"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ۔میرے دل پر چھریاں چلانے کے بعد۔" ثمینہ نے حد سے زیادہ دکھی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں میری جان! کچھ نہیں! تم بس خوش رہا کرو، تم ہنستی بہت اچھی لگتی ہو۔تم بس ہنستی رہا کرو۔" میری خاطر خوشی خوشی ہر کام میں ہاتھ بٹاؤ۔میں چاہتا ہوں اِس خوشی کے موقع پر تم بھی خوش ہو۔تاکہ گھر والوں کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو اور میں فخر سے کہہ سکوں میری ثمینہ جیسی کوئی نہیں ہے، ٹھیک ہے۔" عرفان نے قربت کے لمحات میں مدہوش ہوتی ثمینہ سے ایک وعدہ مانگا۔

ثمینہ نے خمار آلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیسے اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور عرفان کو ایسا لگا جیسے اُس کے وجود کی ساری پریشانیاں اور تھکن اُس کے ایک اثبات میں گم ہو گئیں ہیں اور اُس نے سرشاری کے انداز میں ثمینہ کے گھنیرے بالوں میں منہ چھپا لیا۔

☆......☆......☆

شادی کے دن ہیں قریب کہ ہنوز ذرا دھیرے سے بولو
اُبٹن تمہارا آیا رکھا ہے
اُبٹن تمہارا آیا رکھا ہے
سکھیوں کو ہو گئی دیر کہ ہنوز ذرا دھیرے سے بولو
شادی کے دن ہیں قریب کہ ہنوز ذرا دھیرے سے بولو
مہندی تمہاری آئی رکھی ہے
مہندی تمہاری آئی رکھی ہے
بھابی کو ہو گئی دیر کہ ہنوز ذرا دھیرے سے بولو

"بس بھابی......اللہ کا کرم ہے۔اللہ نے میرے کندھوں پر ایک ذمہ داری ڈالی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ وہ ذمہ داری ادا کر رہا ہوں۔یتیم بچی ہے۔اللہ اِس کو زندگی کی ہر خوشی دے۔جو اس نے چاہا اللہ اِس کو وہ بھی دے جو اُس نے کبھی نہیں سوچا اللہ اُس کو وہ بھی دے۔"

رفیق احمد نے زرقون کے کمرے سے ڈھولک کی تھاپ پر گانا گاتی لڑکیوں کی آواز کے درمیان اپنے کمرے میں بیٹھی جہاں آرا بیگم اور نفیس احمد سے کہا۔

کو کہ نفیس احمد کا خیال تھا کہ نکاح سادگی سے ہو اور جو بھی غل غپاڑہ، گانا بجانا کرنا ہے وہ رخصتی پر ہو لیکن نرگس اور زری نے اُن کی ایک نہ چلنے دی۔وہ دونوں بضد تھیں کہ برسوں بعد اِس گھر میں خوشی، خوشی کی طرح آئی ہے اور موی اُن کی بہت لاڈلی اور چھوٹی سی بہن ہے تو تھوڑا بہت شور شرابا اُن کا حق بنتا ہے اور رفیق احمد کو اُن کی محبتوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

وہ اِس بات پر بھی بہت مطمئن تھے کہ اُن کی بہو ایک بہو کی طرح ذمہ داری نبھا رہی ہے۔

"ویسے یہ تم اِس قدر کیوں مسکرا رہی ہو؟" فراز نے خاموش مسکراتی موی کو چھیڑا۔

"نہیں فراز بھائی! یہ محترمہ خاموش ہوں گی۔یہ تو ڈھول پیٹ رہی تھیں۔بلکہ صبح تو ہم سب کو ڈانس کے جلوے دکھا رہی تھیں۔ابھی خاموش بیٹھی ہیں...... حد ہو گئی موی...... حد ہو گئی ڈرامہ بازی کی۔" نرگس نے محبت

سے مومنہ کو چھیڑا۔

''اور کیا...... خوشی کی بات ہے تو خوشی کا اظہار تو ہونا چاہیے۔ کیوں زری باجی؟'' مومنہ نے چائے کی ٹرے اندر لاتی زری کو مخاطب کیا۔

نیوی بلو آڑا پاجامہ کرتا، سفید موتی پیروں پر بھی مہندی پیروں کی انگلیوں میں پھنسے سونے کے چھلے، گلے میں جھولتا وہ لاکٹ جو بہت محبتوں سے فراز نے اپنے ہاتھوں سے زرقون کے لیے بنایا تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں، کمر پر جھولتی، لہراتی بل کھاتی ناگن جیسی چوٹی، ناک میں لشکارے مارتی، نازک سی، باریک سی، ہیرے کی لونگ ہلکا ہلکا میک اپ، زرقون...... زرقون تو نہیں لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرا، کوئی حور۔

محبت میں اگر الیکشن ہوتے
ہم دھاندلی کرتے اور تمہیں جیت لیتے

فراز کے دل نے چپکے سے ایک شعر پڑھا۔

''چائے۔'' زری کی آواز دھیمی تھی۔ وہ فراز کے قریب کھڑی تھی۔ فراز سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہو زری۔'' فراز کا دل بولا۔

''کیا کر رہے ہیں۔ اِس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں پلیز...... سب نوٹ کرلیں گے۔'' زری کے دل نے دہائی دی۔

لب پیوست تھے۔ لیکن دل باتیں کر رہے تھے۔ کمرے میں کون کون تھا۔ دونوں کو کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

اری بنو اُلجھو نہ یوں لمبے بالوں سے
اری بنو افشاں جو چمکی ہے بالوں میں
وہ ہریالا
وہ میا پیارا
چھڑائے گا چاہوں سے، بڑے ارمانوں سے
ریشمی رومالوں سے
اپنے ہی ہاتھوں سے

فراز کی نظر زرقون کی سیدھی مانگ پر جم سی گئی اُس کو لگا۔ اُس کی مانگ کے ستارے بکھر گئے ہیں بے ساختہ اُس کا ہاتھ اُس کی جیب میں رومال ڈھونڈنے لگا۔

''زرقون تم اب تک یہیں ہو؟'' ثمینہ کی تیز آواز زرقون اور فراز کو حقیقت میں لے آئی۔

''آئی۔'' اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆ کیا جہاں آراء بیگم، فراز اور مریم کی محبت میں انصاف کر پائیں گی؟
☆ حیا کی محبت کی قربانی، اُسے کیا صلہ دے گی؟
☆ رقیہ بیگم، زرقون کی زندگی میں اب کون سے کانٹے بونے والی ہیں؟
☆ مرتضٰی اور شیری کی زندگی کس طوفان کی منتظر ہے؟

اِن سب سوالوں کے جواب جاننے کے لیے، تیزی سے اپنے اختتام کی جانب بڑھتے ناول، آئینہ، عکس اور سمندر کی اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔

انتخاب خاص

اسی ہفتے میں ایک شادی میں گیا۔ وہاں ایک لڑکی اتفاق سے ایسی نظر آ گئی جس میں پدمنی کی ساری نشانیاں تھیں۔ میں نے فوراً امی سے کہا کہ اس لڑکی کو پہچان لیں اور اس کی امی سے ذرا بات چیت شروع کر دیں۔ لڑکی تو امی کو بھی بہت پسند آ گئی اور......

ادب سے ایک خوش رنگ انتخاب

یہ چوتھا رشتہ تھا جسے میں نے نامنظور کیا تھا۔ اور امی میری ضد پر تقریباً چڑ گئی تھیں۔

"تیرا تو ہو گیا ہے دماغ خراب، کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔" امی نے کہا اور میرے پاس سے اُٹھ

کر چل دیں۔ میں نے فوراً امی کا ہاتھ پکڑ لیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کو بچپن سے میری عادت پتا ہے، میں سال میں ایک کھلونا خریدتا تھا لیکن وہ ایسا ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کے لڑکے اسے حسرت سے دیکھتے تھے۔ میں دو سال بے نوکر رہا، لوگوں نے دسیوں نوکریاں بتائیں، میں نے کسی کی بات نہ مانی۔ اور وہ نوکری کی جس میں اُوپر کی آمدنی تنخواہ سے دس گنا ہے۔ شادی بھی ایسی ہی لڑکی سے کروں گا جو لاکھوں میں ایک ہو۔"

"لیکن جب تک تجھے ایسی لڑکی نظر آئے گی۔ اس وقت تک تیرا سر سفید ہو چکا ہوگا۔" امی نے کہا۔

"بال تو میں پھر کالے کرلوں گا کالا کولا لگا کے، آپ فکر نہ کریں۔" نے مذاق میں بات ٹالنی چاہی۔

"تُو شادی تو کرے گا، لیکن اس وقت تک میں مر چکی ہوں گی۔" امی نے ذرا دھیمے مگر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"اللہ نہ کرے امی! آپ ایسی باتیں کیوں کرنے لگتی ہیں، آپ کی زندگی کی لکیر بہت لمبی ہے اور پھر آپ کی صحت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں نے تسلی دی۔

"تُو یہ دیکھتا ہے کہ میں موٹی تازی ہوں، لیکن تجھے یہ پتا نہیں ہے کہ میرا دل گھل گھل کر بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔ آج کل لوگ ایسے ہی جا رہے ہیں، ابھی ٹھیک بیٹھے ہیں، کل ختم۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ چاہتی ہوں کہ اپنے باغ کی بہار دیکھ کر جاؤں، پوتے اپنی گود میں کھلاؤں، مگر تُو کیوں سنے گا۔" امی کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے جنھیں انہوں نے آنچل سے پونچھ لیا۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا لیکن مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اپنی امی کو بہلانے کی خوشی مجھے جلد دے دینی چاہیے۔

میری امی جو رشتے اب تک ڈھونڈ چکی تھیں وہ لڑکیاں بھی بُری نہیں تھیں، اچھے خاندانوں کی تھیں، تعلیم یافتہ تھیں، خوب صورت تھیں اور ان کے ہاں سے خاصا جہیز ملنے کی بھی اُمید تھی۔ لیکن میں نے ان سب رشتوں کو اس لیے نامنظور کر دیا تھا کہ ان میں سے کوئی لڑکی پدمنی نہیں تھی اور میں شادی کرنا چاہتا تھا تو صرف ایسی لڑکی سے جو پدمنی ہو، کیوں کہ پدمنی ہر لحاظ سے بہترین لڑکی ہوتی ہے۔

پدمنی کی آنکھیں بھٹکے ہوئے آہو کی طرح حیراں حیراں سی ہوتی ہیں اور آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی ہلکی سرخی ہوتی ہے جیسے نشہ طلوع ہو رہا ہو۔ اس کا جسم شاخِ گل کی طرح نازک ہوتا ہے اور چلنے میں کمر بل کھا کھا جاتی ہے۔ رنگ سنہرا ہوتا ہے جیسے دودھ اور شہد کو ملا دیا گیا ہو۔ جسم سے مسحور کن خوشبو آتی ہے گردن لمبی اور صراحی دار ہوتی ہے، ناک ننھی منی سی لیکن ستواں ہوتی ہے، آواز میٹھی اور لہجہ دل کش ہوتا ہے، ہونٹ پتلے اور دہانہ تنگ ہوتا ہے، بال لمبے اور ریشم کی طرح ملائم ہوتے ہیں، چال میں بادِ صبا کی سی نرمی ہوتی ہے، دھیمے دھیمے ہنستی ہے اور ہنسنے سے گالوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑتے ہیں، سر سینہ اور چہرہ گول ہوتا ہے، انداز میں وقار اور تمکنت ہوتی ہے، خوش مزاج ہوتی ہے ہر لباس اس پر کھل اُٹھتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ لڑکی کنول کے پھول کی طرح ہوتی ہے، شوہر کے لیے باوفا ثابت ہوتی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قدر خوش نصیب ہوتی ہے کہ اگر نادار آدمی بھی اس سے شادی کرلے تو دولت میں کھیلنے لگتا ہے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ اگر آپ کو یہ باتیں معلوم ہوتیں تو کیا آپ بھی میری طرح اس پر نہیں اڑ جاتے کہ شادی کریں گے تو پدمنی سے ہی کریں گے۔ لیکن اگر ہر شخص کو یہ باتیں معلوم ہوتیں تو پھر بے چاری دوسری تمام لڑکیاں تو اپنے بابل کے ہی گھر بیٹھی رہ جاتیں۔ شاید اس لیے یہ باتیں ہر ایک کو معلوم نہیں لیکن میں نے تو اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب پڑھی تھی جس میں پدمنی کی پہچان بھی لکھی تھی۔ اب صرف تلاش کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ ہر جگہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے لگا جو لڑکی بھی نظر آتی اس میں پدمنی کی نشانیاں تلاش کرتا رہتا۔ محلے کی دو ایک لڑکیوں نے تو میرے اس طرح غور سے دیکھنے کا غلط مطلب بھی لیا اور جواب میں مسکرانے لگیں لیکن ان میں کوئی پدمنی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے اس مسکرانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا جس سے چڑ کر انہوں نے مجھے الٹے سیدھے خطابات سے نوازنا شروع کر دیا۔

اس تلاش میں دو مہینے گزر گئے، اس عرصے میں امی نے مزید دو لڑکیوں کو پسند کیا اور مجھے دکھایا۔ ان میں سے ایک کا باپ جہیز میں ایک کوٹھی تک دینے کو تیار تھا۔ اور دوسری کا باپ مجھے امریکا بھجوانے کی پیش کش کر رہا تھا۔ امی کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان میں سے کسے انکار کریں کیونکہ وہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتی تھیں مگر مجبوری یہ تھی کہ دونوں لڑکیوں سے ایک ساتھ شادی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لڑکیوں کی شکلیں اچھی تھیں مگر ان میں پدمنی کی نشانیاں نہیں تھیں، لہٰذا میں نے انکار کر دیا۔ امی نے مجھے بہت ڈانٹا بلکہ رات کو انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے بہت منت سماجت کی اور کسی نہ کسی طرح انہیں کھانا کھانے پر راضی کر لیا۔

اسی ہفتے میں ایک شادی میں گیا۔ وہاں ایک لڑکی اتفاق سے ایسی نظر آ گئی جس میں پدمنی کی ساری نشانیاں تھیں۔ میں نے فوراً امی سے کہا کہ اس لڑکی کو پہچان لیں اور اس کی امی سے ذرا بات چیت شروع کر دیں۔ لڑکی تو امی کو بھی بہت پسند آئی اور وہ کہنے لگیں کہ واقعی میرا بیٹا جوہریوں کی سی پرکھ رکھتا ہے۔ لڑکی ایسی ڈھونڈی ہے جو ہیرا ہے ہیرا۔ پان کھائے تو پیک گلے میں نظر آتی ہے، بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

☆......☆......☆

جس دن امی اس لڑکی کے ہاں گئیں وہ بڑی خوش تھیں۔ اتنا خوش انہیں میں نے اس دن بھی نہیں دیکھا تھا جس دن مجھے اتنی اچھی نوکری ملی تھی۔ لیکن جب وہ واپس آئیں تو چہرے سے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ خوش نہیں ہیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ اس لڑکی کی پہلے سے کہیں منگنی ہو چکی ہے یا ان لوگوں نے اس رشتے کو قبول نہیں کیا یا انہوں نے کوئی بدتمیزی کر دی۔ امی سے پوچھا تو انہوں نے بڑے بے زار لہجے میں کہا۔

"میں نے تو رشتے کی بات ہی نہیں کی، بس اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے آ گئی۔"

میں حیران رہ گیا۔ لیجیے اتنی تلاش کے بعد پدمنی نظر آئی اور امی کو پہلی نظر میں پسند بھی آ گئی لیکن وہاں جا کر امی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلی آئیں، آخر امی نے بتایا کہ وہ لوگ خاصے غریب ہیں، ابا ہیڈ کلرک تھے۔ وہ بھی محکمہ تعلیم میں اور اب ریٹائرڈ بھی ہو چکے ہیں۔ مالی حالت ایک تو ویسے ہی اونچی نہیں، پھر ان کی تین لڑکیاں اور بھی ہیں۔ گویا جہیز بالکل واجبی سا ہی ملے گا۔

آج کی دنیا میں مصیبت یہ ہے کہ شادی بھی بزنس ہو کر رہ گئی ہے۔ لڑکے کی حیثیت چیک کی سی

ہوگئی ہے جسے صرف ایک بار کیش کرایا جاسکتا ہے اور
جب ایک ہی بار بیچنا ہے تو پھر اسے کیوں نہ بیچے جو
سب سے اچھے دام لگا رہا ہو۔ میں بھی کوئی ایسا آدمی
تو نہیں ہوں جو لالچ سے مبرا ہو۔ لیکن چوں کہ میں
شادی پدمنی سے ہی کرنا چاہتا تھا اور وہ لڑکی پدمنی
تھی۔ اس لیے اماں کے سامنے میں بالکل ایک مصلح
قوم کی طرح تقریر کرنے لگا کہ جس نے بیٹی دے
دی، اس نے اپنے پاس بچا کے کیا رکھا۔ جگر کا ٹکڑا تو
تمہاری گود میں ڈال دیا۔ میں شادی لڑکی سے کرنا
چاہتا ہوں جہیز سے، گرین کارڈ سے یا کوٹھی اور کار
سے نہیں۔ جب لڑکی آپ کو پسند ہے تو آپ بات
کرلیں۔"

دل کا لالچ تو نصیحت بھری تقریر سے نہیں مٹ
جاتا لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ لڑکا اس کے علاوہ کسی
سے شادی نہیں کرے گا۔ امی نے ہامی بھرلی۔

☆......☆......☆

اگلے مہینے بہ خیر وخوبی میری شادی ہوگئی۔ بہت
سے رشتے دار شادی سے ایک ہفتے پہلے آگئے اور
ایک ہفتے بعد تک رہے لہٰذا گھر میں خوب شور شرابا اور
ہنگامہ رہا۔ امی بھی پھولی نہیں سماتی تھیں۔ میں تو یوں
محسوس کررہا تھا جیسے ایک بہت خوب صورت طویل
خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں بار بار اس کتاب کے
مصنف کو دل ہی دل میں دعا دیتا تھا جس نے پدمنی
کی خصوصیات اور نشانیاں لکھی تھیں۔ اگر اتفاق سے
میں یہ کتاب نہ پڑھ لیتا تو پتا نہیں کیسی بیوی ملتی۔

اپنی بیوی کی خوب صورتی کا اندازہ تو مجھے پہلی
نظر ہی میں ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد اس کی گفتگو کے
سحر، خوش مزاجی اور خوش ذوقی کا تجربہ بھی ہوگیا۔
سلیقہ شعاری کو جانچنے کی منزل البتہ دور تھی۔ اس لیے
کہ ایک تو نوکر چاکر موجود تھے اور دوسری امی تھیں جو
نئی دلہن پر ابھی گھر کی ذمے داریاں ڈالنی نہیں چاہتی
تھیں۔ شادی کو دو مہینے ہی گزرے تھے کہ مجھے ترقی
مل گئی، چھ مہینے بعد میرا تبادلہ ایک ایسے شعبے میں
ہوگیا جہاں بالائی آمدنی پچھلے شعبے سے چار گنا تھی۔
امی روز میری بیوی کی بلائیں لے کر کہتیں۔

"بڑی بھاگوان بیٹی ہے، بڑی نصیبوں والی
ہے۔ جب سے گھر میں آئی ہے پیسے کی ریل پیل
ہوگئی ہے۔"

یہ ریل پیل اتنی زیادہ ہوئی کہ مجھے نسبتاً ایک
زیادہ فیشن ایبل علاقے میں بڑا مکان لینا پڑا، امی
اور چھوٹے بہن بھائی اس پرانے مکان میں رہے
اس لیے کہ انہیں اسی گھر سے محبت تھی۔ لوگوں نے
البتہ باتیں بنائیں کہ بہو نے آتے ہی میاں کو قبضے
میں کرلیا اور بیٹے کو ماں سے چھڑا دیا لیکن یہ بات غلط
تھی۔ کیوں کہ میں اپنی اصلی تنخواہ امی ہی کو دیتا تھا۔
پھر ہر ہفتے امی سے ملنے بھی جاتا تھا۔ اگرچہ اس
معمول میں کبھی کبھی کسی ضروری کام کی وجہ سے ناغہ
بھی ہوجاتا تھا۔

نئی کوٹھی میں بیوی نے اپنی خوش ذوقی اور سلیقے کو
پورے طور استعمال کیا اور مجھے اس بات پر فخر ہونے
لگا کہ میری بیوی پدمنی ہے۔ جو آدمی اسے دیکھتا ہے
یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ ایک دیوی کے سامنے کھڑا
ہے۔ اس میں اتنی تمکنت ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا
کہا ٹالنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ وہ دراصل بات کہتی
ہی کچھ اس ادا سے ہے کہ آدمی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔
اب مجھ ہی کو دیکھیے، چار سو گز کی یہ کوٹھی میری ذاتی
ہے، پانچ نوکر گھر میں موجود ہیں اپنے دفتر میں میرا
بڑا عہدہ ہے لیکن میں اس وقت اس کی تیسری ساڑی
استری کررہا ہوں۔ بلکہ اگر آپ دنیا بھر کو نہ بتاتے
پھریں تو چپکے سے یہ بھی بتادوں کہ یہ ساڑیاں دھوئی
بھی میں نے ہی تھیں۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی الجھنیں اور اُن کا حل
- کچن گارنر
- بیوٹی گائیڈ

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں، وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو بُرائی اور بے حیائی ہی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں، اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے، اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی انہیں کی تقلید کیے جائیں گے) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سُن سکے۔ (یہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ (کچھ) سمجھ ہی نہیں سکتے۔

(سورۃ البقرہ 2۔ ترجمہ: آیت 168 تا 171)

حدیثِ نبویؐ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو سچا وزیر عنایت فرما دیتا ہے حاکم اگر (کچھ) بھول جاتا ہے تو وہ (وزیر) اس کو یاد دلا دیتا ہے اور اگر یاد رکھتا ہے تو اس کی مدد کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو خراب وزیر دیتا ہے اگر وہ کچھ بھول جائے تو یاد نہیں دلاتا اور اگر یاد رکھے تو اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ 1158

(سنن ابی داؤد شریف: باب فی اتخاذ الوزیر)

مہر کی ادائیگی

مہر نقدی کی صورت میں بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔ سونے اور چاندی کے زیورات بھی مہر میں دیے جاسکتے ہیں اور زمین، جائیداد اور مکان وغیرہ بھی مہر میں دے سکتے ہیں۔ زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ سونے یا چاندی کے جو زیورات دلہن کو شادی کے موقع پر دیے جاتے ہیں، وہ ان کو بطور مہر دے دیے جائیں، اس طرح مہر بھی ادا ہو جائے گا اور دولہا پر مہر کی ادائیگی کا بوجھ بھی نہیں رہے گا۔

مرسلہ: عبدالقیوم۔ جھنگ

آم

علامہ اقبال کو آم کھانے کا بہت شوق تھا۔ لیکن بیماری کے آخری ایام میں ڈاکٹروں نے انہیں آم کھانے سے منع کر دیا۔ اس پر آپ قدرے پریشان ہو کر کہنے لگے ''مرنا تو برحق ہے، پھر آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مرجانا بہتر ہے۔'' چنانچہ بڑے اصرار سے حکیم نابینا سے ایک

آ م روزانہ کھانے کی اجازت حاصل کرلی۔
مولانا عبدالمجید سالک بیان کرتے ہیں کہ ان ہی دنوں وہ علامہ اقبال سے ملنے گئے تو دیکھا کہ میز پر بمبئی کا کوئی ایک سیر وزنی آم رکھا ہوا ہے۔ انہیں بد پرہیزی کا طعنہ دیا گیا تو فرمایا: ''حکیم صاحب نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے اور یہ آم بہرحال ایک ہی آم ہے۔''

مرسلہ: ناظم حسین۔ سکھر

محبت

محبت ایک جذبہ ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محبت کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ روح سے ہوتا ہے۔ اس میں شکل و صورت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا مگر فانی دنیا میں اس پُرخلوص جذبے کی کوئی قدر نہیں کی جاتی۔

محبت کرنے والوں کی زندگی انتظار اور پریشانیوں کا حصہ بن جاتی ہے جو آخری سانس تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ مگر اس میں محبت کرنے والوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا کیونکہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور جس سے ہم محبت کرتے ہیں، اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اگر وہ شخص ہمیں چھوڑ بھی جائے تو ہماری دعا ہوتی ہے کہ وہ جہاں رہے خوش رہے کیونکہ انسان محبت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: شازیہ گل۔ مانسہرہ

مثلیث

میں اکیلا ہوں تری چاہت میں
ہر طرف شور ہے قیامت کا
قہقہوں میں گھرے ہوئے ہیں لوگ

شاعر: کامی شاہ

چلّو بھر پانی

قومی اسمبلی کا جب کبھی اجلاس ہوتا ہے تو ساری دنیا کی نظریں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں، بڑے تو بڑے چھوٹے بھی قومی نمائندوں کے آدابِ نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، طرزِ تخاطب اور لب و لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات بلا چون و چرا تسلیم کرلینی چاہیے کہ غیر محسوس طور پر قومی اسمبلی کی کارروائی ہماری روحوں میں حلول کر جاتی ہے اور معاشرہ ہر سطح پر وہی رنگ اختیار کر جاتا ہے جو قومی اسمبلی کا رنگ ہوتا ہے۔

کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ قومی اسمبلی کے ریکارڈ میں جہاں اور بہت کچھ درج ہو گیا، وہاں ''الو کے پٹھے'' اور ''نازیبا گالیاں'' بھی آ گئیں۔ ان کلمات پر کسی نے داد دی ہو یا نہیں کم از کم میرے محلے کے لونڈوں نے خوب تالیاں بجائیں اور شور مچایا۔

''بھئی! مزہ آ گیا...... بڑا مزہ آیا۔''

مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ اس وقت میرے پاس چلّو بھر پانی بھی نہیں تھا۔

(سہام مرزا کی کتاب ''جاگتے رہنا'' سے عماد رشید کراچی کا انتخاب)

نیازمندی سے بے نیازی تک

شادی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے نہایت سعادت مند بیوی کی طرح رات کے وقت میری واپسی کا انتظار شروع کیا لیکن اس انتظار میں انتظار کم ہوتا اور سعادت مندی زیادہ یعنی اگر کسی دن میری واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ انتظار کرنے سے زیادہ رو رہی ہوتیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ بعض اوقات مردوں کی واپسی میں دیر بھی ہو جایا کرتی ہے، بیویوں کو اس کا بُرا نہیں ماننا چاہیے۔ پھر یہ کہ میں اپنی زندگی کو دفتر سے گھر تک کس طرح محدود کرلوں۔ ان باتوں کا ان پر

اچھا اثرا ہوا یعنی بہت جلد انہوں نے میرا انتظار سرے سے ترک کر دیا بلکہ جس شام میں باہر جاتا، اس شام وہ گہری نیند کو دعوت دے کر سو جاتیں۔ ایک رات دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کر اور انہیں پکار پکار کر میں تھک گیا۔ آخر کار محلے کے ایک لڑکے نے دیوار پھاند کر اندر سے کنڈی کھولی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا کہ آپ آگئے......؟" میں ان کی اس غیر ضروری بیداری پر حیران رہ گیا۔

نظیر صدیقی کے ایک انشائیے سے اقتباس

انتخاب: اریبہ عرفان۔ کراچی

محتاط

امریکا کی خواتین انتہائی محتاط ڈرائیور ہوتی ہیں۔ سفر کے دوران ایک خاتون ڈرائیور سے کسی نے پوچھا۔ "تم کتنے سال کی ہو؟"

"جب ڈرائیونگ کر رہی ہوں تو ایسے سوال نہ کیا کرو، جن کا جواب سوچ سمجھ کر دینا پڑے۔" خاتون ڈرائیور نے جواب دیا۔

اُم سلمٰی۔ ڈسکہ

باتیں خلیل جبران کی

☆ ایمان، دل کے صحرا میں ایک ایسا سرسبز و شاداب قطعۂ زمین ہے، جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

☆ انسان کے خیال اور ادراک کے درمیان ایک مسافت ہے، جسے اس کی آہِ پُرشوق کے سوا کوئی طے نہیں کر سکتا۔

☆ کچلی ہوئی روح بھی فطری ضروریات سے نجات نہیں پا سکتی۔

☆ اگر تم کسی چیز کے مالک بننا چاہتے ہو تو اسے اپنے نفس کے لیے نہ مانگو۔

☆ بڑے سے بڑے غنی اور بڑے سے بڑے فقیر کے درمیان حد فاصل ایک دن کی بھوک اور ایک ساعت کی پیاس ہے۔

مرسلہ: اُم حبیبہ۔ اسلام آباد

اناناس

اناناس کی کاشت گرم مرطوب علاقوں میں کی جاتی ہے۔ اناناس ایک رس دار پھل ہے جس کا ذائقہ کھٹا اور میٹھا ہوتا ہے۔ اناناس میں وٹامن C، B1، B6، میگنیز اور ڈائیٹری فائبر حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اناناس کا استعمال دمے کی شکایت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چوٹ لگ جانے یا کھال کٹ جانے کی صورت میں اناناس لگانے سے جلن اور تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ اناناس کی کاشت پہلی مرتبہ جنوبی افریقہ میں کی گئی تھی۔ اناناس 1493ء میں کرسٹوفر کولمبس نے دریافت کیا۔ اناناس پھل کے طور پر کھائے جانے کے علاوہ بعض علاقوں میں گوشت گلانے کے کام بھی آتا ہے۔

انتخاب: ثمر افسر۔ کوٹری

دعا

مولوی صاحب ایک سیاسی جماعت کے کارکن کی عیادت کے لیے اسپتال گئے جسے ایک مخالف سیاسی پارٹی کے کارکن نے تصادم میں زخمی کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے معافی اور درگزر کے موضوع پر ایک طویل لیکچر دیا اور پھر کہا۔ "تم حملہ آور کو معاف کر دو، میں تمہاری بھلائی اور صحت و تندرستی کے لیے دعا کروں گا۔"

سیاسی کارکن نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے صرف اسپتال سے فارغ ہو لینے دیں، پھر آپ حملہ آور کے لیے دعا کیجیے گا۔"

محمد انیل پٹھان۔ جامشورو

صبح اُٹھنے کی عادت

والٹر اسکاٹ نے لکھا ہے۔ "صبح ہی صبح اُٹھنے کی عادت مُبارک ہے اگر مجھ میں یہ عادت نہ ہوتی تو میں کام نہ کر سکتا۔ یہ عادت مجھے آزمائش کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رکھتی ہے۔" کہتے ہیں کہ جو لوگ والٹر اسکاٹ سے ملنے اس کے مکان پر آتے وہ تعجب کیا کرتے کہ اسکاٹ کو کام کرنے کا وقت کب ملتا تھا؟ کیوں کہ وہ سارا دن مہمانوں کی آؤ بھگت میں گزار دیا کرتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ والٹر اسکاٹ صبح ہی صبح بیدار ہو جاتا اور لکھنا شروع کر دیتا اور جب تک لوگ اٹھتے، ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوتے اور اس کے گھر پہنچتے وہ اپنے روزانہ کے کام کا ایک بڑا حصہ ختم کر چکا ہوتا تھا۔

مرسلہ: حمیرا وارثی۔ کراچی

روح

جسم کی کوئی حیثیت نہیں، زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے، اگر زندگی میں کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت مت دینا، اس پر لگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ ہے، اسے کبھی داغ دار مت ہونے دینا، ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہو گے۔

مرسلہ: خضر فرحان صدیقی۔ کورنگی

تربیت

ایک بھیڑیا ایک انسانی بچے کو اُٹھا کر لے جا رہا تھا کہ راستے میں ایک کتے نے اس سے کہا۔ "بھائی سارا جنگل تمہارے شکار کے لیے موجود ہے پھر تم اس بچے کو کیوں اٹھا لائے ہو؟" بھیڑیے نے جواب دیا۔ "میں اسے کھانے کے لیے نہیں لے جا رہا بلکہ میں اسے اس لیے اپنے ساتھ لایا ہوں کہ میں اس کی تربیت انسانوں سے بہتر طور پر کر سکتا ہوں۔"

مرسلہ: آصف بیگ۔ ٹنڈو الہ یار

سلیقۂ گفتار

کوفہ کے باشندوں نے مامون الرشید کے پاس گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ اس کا تبادلہ کر دیجیے۔

مامون نے حیران ہو کر کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ میرے گورنروں میں اس سے زیادہ عادل اور راست باز کوئی نہیں ہے۔" اس پر ایک شخص بولا۔ "امیر المومنین! اگر ہمارا گورنر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ کو اہل ملک کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے اس سے ہر شہر کو مستفید کرنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں گے تب بھی کوفہ کے حصے میں اس کے تین سال سے زائد نہیں آئیں گے۔"

مامون اس بات پر ہنس پڑا اور گورنر کا تبادلہ کر دیا۔

روشن علی۔ گھوٹکی

عادت

ایک عورت ماہر نفسیات کے پاس گئی اور اسے بتایا۔ "میرے شوہر کو سوتے ہوئے بولنے کی عادت ہے۔"

ماہر نفسیات نے کہا۔ "تو آپ ان کی یہ عادت ختم کرانا چاہتی ہیں؟"

عورت جلدی سے بولی۔ "نہیں، یہ بات نہیں، ان کی باتوں سے تو بہت سے بھید کھل جاتے ہیں، دراصل مسئلہ میرا ہے۔" یہ کہہ کر عورت نے گہرا سانس لیا۔

"وہ کیا......؟" ماہر نفسیات نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے نیند بہت آتی ہے، اس لیے میں وہ باتیں دھیان سے نہیں سن پاتی، براہ کرم آپ مجھے نیند دور کرنے کا کوئی طریقہ بتا دیں۔"

راشدہ اعجاز۔ کراچی

نئے لہجے نئی آوازیں

عید کا چاند

کسی کا چین کسی کا قرار عید کا چاند
کسی کے واسطے لایا بہار عید کا چاند
سبھی کو ایک ہی مالا میں یوں پرویا ہے
کہ جیسے بن گیا ہے جگنو ہار عید کا چاند
الگ ہی رونقیں بکھری ہیں جابجا ہر سُو
مٹائے شکوے گلے سب ہزار عید کا چاند
کہیں پہ مہندی، کہیں چوڑیاں، کہیں خوشبو
کہیں پہ ہار، کہیں پر سنگھار عید کا چاند
یہ عید، عید رہے اور سنگ رہیں خوشیاں
یہی دعا ہے، یہی ہے پکار عید کا چاند

فرح علی۔ کراچی

غزل

درد، دل کا بڑھا گئی ہے عید
بن ترے پھر سے آگئی ہے عید
تیرا چہرہ بھی بہہ گیلا ہے اس بار
مجھ کو اتنا رُلا گئی ہے عید
دیکھ کے حال ہنستی ہیں سکھیاں
مجھ کو پاگل بنا گئی ہے عید
تیری باتوں کی تیری یادوں کی
گھر میں شمعیں جلا گئی ہے عید
فاصلے تو مٹانے آئی تھی
فاصلے کیوں بڑھا گئی ہے عید
شعر لکھنے لگی ہے تمثیلہ
مجھ کو شاعر بنا گئی ہے عید

تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ

خوشی کا موقع ہے

گلے سے سب کو لگاؤ خوشی کا موقع ہے
شکایتوں کو بھلاؤ خوشی کا موقع ہے
بہت طویل گزارا ہے وقت لڑ جھگڑ کر
جو بھی روٹھا ہے مناؤ خوشی کا موقع ہے
گزشتہ درد کے قصے بھلا بھی دو جاناں
خوشی میں جھوم لو گاؤ خوشی کا موقع ہے
ہر ایک لب پہ ہو مسکان بچی چاہت کی
بھلا دو غم مسکراؤ خوشی کا موقع ہے
نہیں ہے تم سے کوئی بھی طلب فقط اب تم
عماد کو اپناؤ خوشی کا موقع ہے

عماد حسین انصاری۔ کراچی

غزل

آؤ لکھتے ہیں پیار کی باتیں
گل و گلشن، بہار کی باتیں
قتل و غارت گری و وحشت میں
ہیں غنیمت یہ پیار کی باتیں
ایک عرصہ ہوا تباہ ہوئے
پھر بھی کرتے ہیں یار کی باتیں
اس قدر حبس زدہ سی بستی
ہر طرف انتشار کی باتیں
شامِ غم گل وطن پہ اتری ہے
ہر زباں پہ ہیں خار کی باتیں

سباس گل۔ رحیم یار خان

اک کہانی ہم

کوئی چپکے سے اس دل پہ
دستک دے جائے تو اچھا لگے
مجھ کو بھی اس دنیا میں
کوئی اپنی جان سے زیادہ چاہے تو اچھا لگے
میں اُس کو چاہوں وہ مجھ کو چاہے
یہ کارواں یوں ہی چلتا رہے تو اچھا لگے

میں بکھر رہا ہوں کب سے اے دل
مجھ کو بھی کوئی آ کے سمیٹے تو اچھا لگے
محبت میں پتھر دل بھی پگھل جاتے ہیں
وہ میری محبت میں پگھل جائے تو اچھا لگے
آؤ ہم بھی کریں ایسی سچی محبت شعبان
لوگ ہم پر بھی کہانی لکھیں تو اچھا لگے
شعبان کھوسہ۔کوئٹہ

دہشت گرد

ایک سر کے جانے سے ایک گھر اُجڑتا ہے
کیا مگر تجھے ظالم؟ کیا تیرا بگڑتا ہے
روزِ حشر آنے دے دیکھنا خدا میرا
ظلم پر تیرے تجھ کو کس طرح پکڑتا ہے
راؤ تہذیب حسین تہذیب۔رحیم یار خان

مکڑی

لڑکیاں تو مکڑی جیسی ہوتی ہیں
ذرا جو آسرا ملے......
کہیں بھی کونا ملے
جھٹ خواب بننے لگتی ہیں
بن کر ارد گرد خوابوں کے ہالے
کچے دھاگوں کے جالے
خوش ہوتی رہتی ہیں
کمزور پناہوں میں
خود کو مضبوط سمجھتی ہیں
جالوں کے، خوابوں کے بھروسے
زندہ رہتی ہیں
یہ لڑکیاں بھی
مکڑی جیسی ہوتی ہیں

صفیہ تجمل شاہ۔لاہور

مرے ہمدم

میں طوفاں آشنا ہوں پُر سکوں ساحل بھی رکھتی ہوں
بہت سے دوستوں کی دشمنی شامل بھی رکھتی ہوں
محبت کے فسوں کے ٹوٹنے پر میں نے جانا ہے
میں اپنے ہی لیے اندر تو اِک قاتل بھی رکھتی ہوں
دکھوں پر چیخنے رونے کی عادت ہے نہیں میری
مدد کو ساتھ اپنے ضبط اک کامل بھی رکھتی ہوں
میرے اندر میرے ہمدم ہزاروں راز پنہاں ہیں
تنہائی میں تمہیں ہمراز سا شامل بھی رکھتی ہوں
لاحاصل سا عجب دردِ محبت پال رکھا ہے
لاحاصل ہی کو اب میں زیست کا حاصل بھی رکھتی ہوں
وہ مجھ کو ٹوٹ کر چاہے میری بس یہ تمنا ہے
جنوں میں ڈوب کر یہ جذبۂ عادل بھی رکھتی ہوں
خولہ عرفان۔کراچی

کہاں ہو تم

مرے ہمدم میرے جانم
کہاں ہو تم
بہت دن سے مری آنکھوں نے وہ چہرہ نہیں دیکھا
تمہاری یاد میں ہمدم مری آنکھیں برستی ہیں
مجھے تو عید کا تم چاند لگتے ہو
مگر وہ چاند تو ہر سال آتا ہے
یہاں یہ حال ہے کہ تم کسی صورت نہیں آتے
نا کوئی تار لکھتے ہو، نہ کوئی فون کرتے ہو
نہ تم ای میل کرتے ہو، کہاں ہو فیس بک پہ تم
بہت دن سے تمہارا کوئی SMS نہیں آیا
وہ دن کیا یاد ہیں تم کو
کہ جب ہم روز ملتے تھے
ریحان آفاق۔حیدر آباد

پروین شاکر کے لیے

کہی ان کہی باتیں کیسے چپ چاپ لکھ گئی
دُکھ سکھ کی باتیں کیسے چپ چاپ لکھ گئی
بظاہر پُرسکون، نین نقش مطمئن چہرہ
دل کا طوفان لفظوں میں چپ چاپ لکھ گئی
تیرے مداح اپنی شاعرہ کو ڈھونڈتے پھریں
تو تقدیر کا فیصلہ اپنے ماتھے پہ چپ چاپ لکھ گئی
عنبرین نعیم۔کراچی

اس ماہ ارم نشاط۔ خانیوال کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

راحت عالم۔ گوادر

☺: وہ بھی کیا دن تھے جب ہم......؟

✍: جب آپ کنوارے تھے۔

راشدہ انور۔ کراچی

☺: آپ جیسا کوئی میری زندگی میں......؟

✍: اللہ بچائے مجھے اللہ بچائے۔

منائم خان۔ کراچی

☺: کبھی کبھی لوگوں کی طرف سے بے تکے سوال بھی آتے ہوں گے نا؟

✍: یہ کیسا بے تکا سوال کیا ہے آپ نے؟

مہتاب۔ ملتان

☺: عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور بے وقوف کے لیے؟

✍: بے وقوف کے لیے تو خسارہ بھی ناکافی ہوتا ہے۔

واجد علی۔ کوئٹہ

☺: زین بھائی! آج کل وہ بہت تنگ کر رہی ہے؟

✍: موبائل نمبر Send کر دو اور بے فکر ہو جاؤ۔

خرم شہاب۔ گوجرانوالہ

☺: زین بھائی! آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟

✍: حلال فوڈز۔

نعمان الحق۔ جہلم

☺: بھائی سُنا ہے آپ نہاتے نہیں ہو؟

✍: میرا پیچھا چھوڑ دیا ر آپ اِس عید پر نہاؤ گے۔

ثاقب حسین۔ کراچی

☺: پڑھائی میں دل کیسے لگایا جائے؟

✍: 'دل لگا کر' پڑھائی کب ہوتی ہے پیارے۔

عبدالقدوس۔ میانوالی

☺: اندھوں کو ڈرائیونگ لائسنس مل جائے تو بہروں کو کیا ملے گا؟

✍: تم ہمیشہ 'مفت' کی تلاش میں رہو۔

سبطین رضا۔ اسلام آباد

☺: بھائی آپ کو عیدی ملتی ہے؟

✍: تم نے راہ چلتے کی چیزیں چھیننا چھوڑا نہیں۔

یاسر بلوچ۔ملیر

☺: زین بھائی محبت اور پیار میں کیا فرق ہے؟

✍: وہی جو قرض اور اُدھار میں ہے۔

صدف معین۔راولپنڈی

☺: اگر انسان کو محبت ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

✍: سب سے پہلا کام آخرت کی تیاری۔

جاوید نظر۔گودھرا

☺: زین جی! آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں؟

✍: تصویر بھجوادیں، آپ کا نصیب بھی کھل سکتا ہے۔

راشد خان۔لاہور

☺: بھیا میں نے ایم اے کرلیا ہے۔؟

✍: مبارک ہو اگر ایک مشورہ سن لو۔ تعلیم کا رعب بھی ٹھیک ہے لیکن ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو کرلیا ہے تم نے ایم اے تو ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

بدر امتیاز۔فیصل آباد

☺: شادی کرتے وقت کس چیز کا خیال رکھنا چاہیے؟

✍: خیال رکھو یا نہ رکھو۔شادی تو ہو ہی جائے گی پیارے۔

انصر شیخ۔ملتان

☺: زین بھائی لڑکے ہمیں ہمیشہ بے وقوف کیوں سمجھتے ہیں؟

✍: میں نے تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔آپ بے کار ہی!

ارم نشاط۔گودھرا

☺: کوئی عورت کسی دوسری عورت کو سب سے خوبصورت جملہ کیا کہہ سکتی ہے؟

✍: تم بہت خوبصورت اور عمر میں مجھ سے چھوٹی ہو۔

سمیر خان۔ جہلم

☺: وہ مجھ سے اظہار محبت کرتے کرتے اٹکتی کیوں ہے؟

✍: شاید ہکلی ہوگی، بیچاری۔

انجم نیاز۔ کوٹری

☺: اگر آپ کو فلم کی آفر ہو تو کیا کریں گے؟

✍: نہیں یار میں کسی (عامر خان، شاہ رخ خان، سلمان خان) کے پیٹ پر لات نہیں مارنا چاہتا۔

رضوان سعید۔ سکھر

☺: بھیا جی! دل لگی کب بری لگتی ہے؟

✍: شادی سے پہلے تو ہم نے کبھی کسی کو بری لگتی نہیں دیکھی۔

اسامہ ندیم۔ کراچی

☺: زین بھائی کیا سکون روپوں سے خریدا جاسکتا ہے؟

✍: بالکل میرے بھائی، مگر...... دوسروں کا۔

عائشہ رفاقت۔ ڈسکہ

☺: زین! بھیا دنیا میں محبت کی کھنک سب سے پہلے کب سنی گئی تھی؟

✍: بہن جی! مجھے لگتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں۔

فرخندہ شمسی۔ حیدر آباد

☺: بھیا مرد بدصورت عورت کی تعریف کرنے پر کب مجبور ہو جاتا ہے؟

✍: ارے یہ کیا سوال پوچھ لیا آپ نے...... میرا خیال ہے جب وہ 'عورت' خوش نصیبی سے اُس کی بیوی ہو۔

انجلینا یوسف۔ بہاولپور

☺: زین بھائی! عورت قدرت کا حسین انعام ہے تو یہ بتائیں کہ مرد کیا ہے؟

✍: میری بہن مرد ایسی ٹرانی ہے مختلف خواتین کے پاس جانا چاہتی ہے مگر رہتی ایک ہی کے پاس ہے۔

نور جہاں۔ جہانیاں

☺: زین بیٹا! پھول توڑنے کے بعد مرجھا کیوں جاتا ہے؟

✍: پیاری آنٹی! یہ تو فطری عمل ہے۔ بالکل اسی طرح جب لڑکیاں دل توڑ دیتی ہیں یہ ہی حال ہمارے دل کا ہوتا ہے۔

مس آشا۔ سرگودھا

☺: زین! دل و دماغ میں کس کے فیصلے کو ترجیح دینا چاہیے؟

✍: اجی یہ تو فائدے پر منحصر ہے۔

"یہ ہوئی نا بات" کے لیے میرا سوال یہ ہے...

____

____

نام: _______________

پتا: _______________

کوپن برائے ستمبر 2014ء

''دیکھو باشاہی خواہ مخواہ کا پیچھا مت لو۔'' پھوپا نے بتیسی کھڑکھڑائی۔ ''ہاں کیسا برا لگا۔ ذات والی کو جو برا کہا۔ ڈومنی کا ساتھ ڈوم نہیں دے گا تو کون دے گا؟'' پھوپی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''کس کو کہہ رہی ہو ڈوم؟ کیا نام ہے کہ......

مزاح کا وہ شہ پارہ، جو اپنی مثال آپ ہے

خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ یہ ان کا اصلی نام تھا یا عرفیت مگر ہماری پھوپی ''بادشاہی بیگم'' کہلاتی تھیں۔ یہ ان کا جگت نام تھا۔ وہ لگتی بھی بادشاہ تھیں۔ پچھتر برس کی عمر، سفید براق کپڑے، چوڑی پیشانی، سفید بال، چوڑی گھنی بھنویں، ستواں ناک، مغلوں والے اونچے گلے اور عقاب کی سی آنکھیں۔ ان کی آنکھیں ان کے رعب کا سب سے بڑا حصہ تھیں۔ جب کبھی ہمارے باوا سے ملنے آتی تھیں ان کی خادمہ ایک چھوٹی سی دری، سفید چادر، پانی کی صراحی، چاندی کا گلاس، چاندی کی ڈبیہ میں لگے ہوئے پان، زرق برق بٹوے میں تمباکو، چھالیہ اور لونگ، الائچی سب ساتھ لاتی تھی۔ پھوپی ہمارے یہاں کا پانی نہیں پیتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ ''تمہارا کنجروں کا پانی میرے پینے کا نہیں ہے۔'' ان کی آمد پر پلنگ اس طرح جھاڑا جاتا تھا جیسے کھٹمل مارے جا رہے ہوں۔ دری پر سفید چادر بچھائی جاتی تب پھوپی بیٹھتی تھیں۔

انہوں نے ہماری یہاں کھانا بھی نہیں کھایا مگر ہماری ماں سینی میں کھانا لگا کر ضرور بھیجتی تھیں اور پھوپی اسے غور سے دیکھتی تھیں، کٹورے اٹھا اٹھا کر سونگھتی تھیں اور ناک سکیڑ کر کہتی تھیں۔ ''ارے شیخانی کیا جانے کھانا پکانا۔'' یہ ہماری ماں کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔

آواز ایسی زوردار کہ تین گھر جائے۔ ادب لحاظ کی بڑی پابند تھیں۔ ہمارے باوا کی بڑی بہن تھیں اس لیے وہ ان کے آگے بول نہیں پاتے تھے۔ کچھ کہتے تو فوراً ڈانٹ پڑتی۔ ''یہ تمہاری عدالت کا کمرا نہیں ہے۔'' ہماری ماں تو ان کے سامنے دم نہیں مارتی تھی۔

ہمارے پھوپا اپنے زمانے کے مانے ہوئے شہر کوتوال تھے۔ لمبے چوڑے، سرخ و سفید، داڑھی رکھتے اور صافہ باندھتے تھے۔ جوانی میں ان کا شمار خوب صورت مردوں میں ہوتا تھا۔

آگرے کا ذکر ہے۔ بادشاہی پھوپی کا مکان

پائے چوکی میں تھا۔ صاف ستھرا آنگن، دیوار کے ساتھ ساتھ کیاریاں۔ پیڑ بڑے سلیقے سے لگے ہوئے۔ ان میں انار کا بھی ایک پیڑ تھا جس میں کچے انار لگے رہتے تھے۔ گھڑونچی پر گھڑے رکھے ہوئے، چوکی پر نقشین لوٹے پانی سے بھرے، کٹورے قلعی کیے ہوئے دھرے رہتے تھے۔

ہمارے پھوپا اسی برس کے ہوں گے۔ پان کھاتے تھے۔ چشمہ لگاتے تھے۔ سرکار سے پنشن ملتی تھی۔ ایک ہی اولاد تھی وہ بھی لڑکی۔ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ پہلی رات ہی خاوند سے ایسی بگڑی کہ پھر جیتے جی نہ بنی۔ بہت ہی حسین تھیں اور اچھے لباس کی بے حد شوقین۔ میں جب بھی جاتا، نگاہ چرا چرا کر دیکھتا رہتا۔ وہ ایسی ہی حسین تھیں اور میں چودہ برس کے لگ بھگ ہوں گا۔

گھر میں ایرانی قسم کی موٹی موٹی پھولی ہوئی بلیاں پلی ہوئی تھیں۔ ارے ہاں ایک پہاڑی مینا بھی تھی جو دن بھر باتیں کرتی رہتی تھی مجھے اس کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کالی کٹ کوئل۔ پیلی چونچ پیلے پیلے کن پھڑے، آفت کی پرکالہ، باتیں کرنے میں عورتوں کو مات دیتی تھی۔

ایک بار باوا نے مجھے پھوپا سے ایک کتاب لینے بھیجا۔ میں گھر میں گھسا ہی تھا کہ مینا بولی۔ ''میاں دیکھو کون آیا ہے؟''

میں بڑے ادب سے پھوپی کو سلام کر کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مینا بولی۔

''اے ہے شکل سے تو چور لگتا ہے۔'' میں کھول کر رہ گیا۔

پھوپا کا کمرا ڈیوڑھی کے پاس تھا۔ ان کے کھانے کے برتن الگ تھے۔ صراحی الگ۔ وہ گھر کے مٹکوں سے پانی نہیں پی سکتے تھے۔

''لڑکے تُو کیسے آیا ہے؟ تیرے باوا اچھے ہیں۔ مارتے تو نہیں؟'' پھوپی نے پوچھا۔

''میں پھوپا سے کتاب لینے آیا ہوں۔'' میں نے جیب سے پرچہ نکالا۔ پھوپا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

''ادھر ہی جا کے لے جیو کتاب ان کے کمرے میں!'' پھوپی بولیں، پھر بلند آواز میں کہا۔ ''ارے یہ لڑکا آیا ہے فہیم بیگ کا، کتاب لینے۔ ارے بس پڑھ چکو وظیفہ، یہ گناہ وظیفوں سے نہیں دھلیں گے۔ تو سوچو ہے کھا کے......'' پھوپی نے طعنہ دیا۔

''کیا نام ہے کہ اللہ، نبی کی باتوں میں مت بولا کرو کہ نام ہے کہ......!'' پھوپا نے دو دفعہ سیریس ہو کر کہا تو ان کی ڈھیلی بتیسی کھڑ کھڑا کر قریب قریب باہر نکل پڑی۔ ہر لفظ پر کٹا کا ہوتا تھا۔

''میں کہتی ہوں جو کیا ہے وہ بھرو۔ یہ وظیفے بے کار ہیں مرزا صاحب!'' پھوپی کی بات پر مینا بھی بول پڑی۔ ''بی بی سچ کہتی ہیں، بی بی سچ کہتی ہیں۔''

اے بی حنیفہ، اس لڑکے کو تھوڑا حلوہ دے دیتیں نعمت خانے میں سے۔'' پھوپی نے ملازمہ کو ہدایت دی تو حنیفہ نے نعمت خانے میں سے ایک بڑی پلیٹ حلوے کی نکالی۔ اس میں سے تھوڑا سا حلوہ نکال کر ایک چھوٹی طشتری میں مجھے دیا۔ پستے، بادام کی ہوائیاں پڑی تھیں کیوڑے کی مہک تھی۔ میں نے دو منٹ میں پلیٹ صاف کر دی اور چارپائی کی پٹیوں سے ہاتھ پونچھے تو مینا پھر بول اٹھی۔ ''بدتمیز بدتمیز۔'' میں پھر کھول کر رہ گیا۔

اتنے میں پھوپا نے وظیفہ ختم کر لیا اور کہا۔ ''کیا نام ہے کہ کسی آئے گئے کا خیال نہیں کرتیں، جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔'' پھوپا وظیفہ ختم کرتے ہوئے بولے۔

'ہاں ہاں تو کیا غلط کہا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔''

''تو میں تم سے بخشش مانگ رہا ہوں کیا نام ہے

کہ......؟"

"ہاں تو پھر رفیقہ سے مانگو۔" ان کی جوانی کی نور نظر کی طرف اشارہ تھا۔

"رفیقہ کا نام تم کو نہیں بھولتا۔"

"اے بھولے گا کیسے؟ وہ تو کلیجے پر کھدا ہوا ہے۔"

"اس وقت اس کا نام کیسے آیا؟"

"آئے گا، سو بار آئے گا۔ پہلے تو اس کا نام لیتے نہیں تھے؟ ڈومنی کا۔ ہم پڑے جلتے تھے، کلستے تھے۔"

"دیکھو ہاشاہی خواہ مخواہ کا پیچھا مت لو۔" پھوپا نے بتیسی کھڑکھڑائی۔

"ہاں کیسا برا لگا۔ ذات والی کو جو برا کہا۔ ڈومنی کا ساتھ ڈوم نہیں دے گا تو کون دے گا؟" پھوپی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"کس کو کہہ رہی ہو ڈوم؟ کیا نام ہے کہ ہم ڈوم ہیں؟" پھوپا برہم ہو گئے۔

"تمہیں کہہ رہی ہوں ڈوم، تمہیں، تمہیں، تمہیں۔ جو ڈومنی سے شادی کرے گا وہ ڈوم نہیں کہلائے گا تو اور کیا۔" پھوپی نے قائل کرنے والے لہجے میں کہا۔

"ارے کیا نام ہے کہ شادی کب کی تھی؟" پھوپا بولے۔

"اچھا تو ویسے ہی ڈالی ہوئی تھی۔ ارے ذرا دیدہ تو دیکھو بڈھے کا حرام ہو رہا ہے حرام۔ آج کوئی اسلامی حکومت ہوتی تو سنگسار نہ ہوتے تو میرا نام بدل دیتے۔"

"ارے بس بھی کرو گی یا نہیں۔" جلے تن پھوپا نے کہا۔

"ارے ہمارا تو اس نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔"

"جینا دوبھر کر دیا ہے۔" مینا بولی۔

"اری چپ حرافہ۔" پھوپی نے مینا کو ڈانٹا اور پھوپا سے مخاطب ہوئیں۔ "تو مت رہو اس گھر میں چلے جاؤ رفیقہ کے پاس۔"

"ارے یوں مت کہو، تمہارے چچا نے بھی تو ڈومنی کی تھی کیا نام ہے کہ......!"

"دیکھو مرزا جی! بڑے بوڑھوں کو مت لاؤ بیچ میں۔ پھر میں بھی کچھ کہوں گی۔" پھوپی بولیں۔

"تم بھی تو جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہو کیا نام ہے کہ۔"

"کیا نام ہے کہ۔" مینا بولی۔ "میاں سو رہے ہیں۔"

"ہاں مینا تُو ٹھیک کہتی ہے۔ میاں ایسے سوئیں گے کہ قیامت کو اٹھیں گے۔" پھوپا بولے۔

"ہاں، ہاں مرجاؤ۔ سمادھی لے لو، زندہ دفن ہو جاؤ۔" پھوپی نے پھپھولے پھوڑے۔

"مجھے تو تمہارا غم لگا ہے۔" پھوپا نے بتیسی کھنکھنا کر کہا۔

یہ جملہ پھوپی کے سارے جملوں کو لے ڈوبا۔ پھوپی ایک دفعہ کو بھڑک ہی تو گئیں۔ غصے میں لرزتی ہوئی دھاڑیں۔ "ارے بڈھے کیوں بددعا لیتا ہے میری۔ آگے گناہ کیا کم ہیں۔ دوزخ میں جلے گا۔"

"تم نے خود چھیڑ نکالی ہے کیا نام ہے کہ۔ پھر جب اس گھر میں جینا دوبھر ہوگا تو چلے جائیں گے، مرجائیں گے۔"

"مرجائیں گے۔" مینا بولی۔

"ہاں تو مرونا، کس نے روکا ہے؟ گھر خالی کرو۔" پھوپی نے حکم دینے والے لہجے میں کہا۔

"کیا نام ہے کہ گھر تو ہمارا ہے۔"

"کیا کہا، گھر تیرا ہے؟ پھر گھر کا طعنہ دیا۔ تیرا گھر ہے تو یہ پڑا ہے تیرا گھر۔ چل ری حنیفہ اٹھا سامان۔" پھوپی چلائیں۔

"اٹھا سامان۔" مینا بولی۔ "جلدی اٹھا سامان۔"

حنیفہ آ کر کھڑی ہو گئی بولی۔ "اے بیگم صاحب کیوں لڑو ہو۔"

"ارے اپنا گھر نہیں ہے۔ چل اٹھا سامان۔ دیکھتی کیا ہے سامان اٹھا۔" پھوپی گرجیں۔

"اے سنو میں ہی جا رہا ہوں بادشاہی۔ یہ گھر تو تم کو دے چکا ہوں۔" پھوپا نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔"

"یہ ڈوم کی زبان کب سے ایک ہونے لگی۔ اٹھا حنیفہ سامان۔" پھوپی اٹھیں۔ لرزتی ہوئی پیچھے دروازے کی طرف چلیں۔ حنیفہ پیچھے پیچھے پاندان، دری، چاندنی اور صراحی لیے۔ پھوپی چلتے چلتے دروازے پر رکیں۔ "تھو اس گھر پر، لعنت تھو۔"

پھوپا کانپتے ہوئے اٹھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنی، ایک دفعہ کو آئینے میں منہ دیکھا۔ تھوڑا رکے۔ ایک تھیلے میں کافی چیزیں بھریں اور باہر۔

میں کیا کرتا۔ دو منٹ تو سکتے میں رہا۔ پھوپی کا بھرا پرا گھر ایک منٹ میں تین تیرہ ہو گیا۔ اب تو محلے والے اور ہر کوئی لوٹ مچاوے گا۔ میں نے گھبرا کر نعمت خانے کا رُخ کیا۔ حلوے کی بڑی پلیٹ نکال کر جلدی جلدی کھانا شروع کیا۔ حلوہ گلے میں پھنسا۔ برابر کی صراحی سے گلاس بھر کر نیچے اتارا۔ اچھو لگ گیا مگر حلوہ ختم کر کے دم لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھوپی کے کمرے میں گیا۔ پھوپی کی وال کلاک پر نظر پڑی۔ پرانے زمانے کی تھی۔ پریاں نکل کر گھنٹی بجاتی تھیں۔ سوچا اسے کیسے لے جاؤں۔ پھر ایک چادر ڈھونڈ کر پلنگ پر بچھا دی کہ اس میں باندھ لوں گا۔ ایک سنگھار دان تھا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ عطر کی شیشی کھولی، سونگھی، گریبان پر لگایا۔

ایک چھوٹا سا چاقو نظر پڑا جسے فوراً جیب میں داخل کیا۔ آئینے میں منہ دیکھا، منہ چڑایا۔ سنگھار دان میں کچھ ریزگاری پڑی تھی، جلدی جلدی جیب میں رکھی۔ میں مینا کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ سوچا پنجرہ ہاتھ میں ٹانگ لوں گا۔ باوا سے جاکر کہوں گا کہ کتاب کیسے لاتا۔ پھوپا، پھوپی لڑ کر بھاگ گئے۔ میں مینا لے آیا ہوں۔ پھر خیال آیا شاید باوا ماریں۔ مارنے دو، پھر میں نے دماغ پر زور دے ڈالا کہ کیا کیا لے جاؤں۔ ایک بلی پکڑلوں۔ میرے اوسان جارہے تھے اور ہاں مینا باتیں کیے جاتی تھی۔ الا بلا بکے جاتی تھی۔ ''ارے چور ہے چور۔ میاں دیکھو چور آیا ہے، اے بڈھے پکڑلے اس کو، اے لعنت۔ تھو، تھو۔'' مینا کی بکواس دماغ کو ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ میں نے پھر نعمت خانے کا رخ کیا۔ ایک پیالے میں تقریباً آدھ سیر دودھ رکھا تھا۔ ایک سانس میں پی گیا پھیکا ہی۔ گھبرایا ہوا تھا نا۔ مینا نے تو بس میرے حواس خراب کررکھے تھے۔ بولے جاتی تھی۔ نعمت خانے میں ایک ڈبہ رکھا تھا۔ کھولا شکر تھی۔ میں نے پھنکیے بھر بھر کر پھانکنے شروع کیے کافی گر بھی گئی بدحواسی جو ٹھہری۔ اوپر سے مینا بھی پھوپی کی آواز میں چیختی۔

''حنیفہ پکڑ اس کو۔ مار۔'' مینا نے تو اوسان خراب کیے ہی تھے۔ ادھر سے میں نے ایک بلی کو پکڑا۔ اس نے پنجہ مارا اور بھاگ گئی۔ میں کھرونچہ لگے ہاتھ کو مسلتا رہ گیا۔ انار کے پیڑ پر نگاہ گئی۔ میں نے جھٹ ایک انار توڑ کر کھایا۔ کڑوا، بکھٹا، تھوک دیا۔ پھوپا کے کمرے میں پہنچا۔ جیب گھڑی میز پر رکھی تھی۔ جیب میں ڈال لی پھر سوچ کر کہ چلتے وقت لے لوں گا' واپس رکھ دی۔

اتنے میں پچھلے دروزے پر کھٹکا ہوا۔ میں چونک پڑا۔ پھوپی داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے حنیفہ پاندان لیے ہوئے۔ پھوپی ایک پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ میرے منہ پر شکر لگی تھی۔ میں نے منہ موڑ کر صاف کیا۔ پھوپی نے پوچھا۔ ''مزاجی لوٹے؟'' میں نے انکار میں سر ہلادیا، بولا نہیں جارہا تھا۔

ڈیوڑھی پر کھٹکا ہوا۔ مینا بولی۔ ''میاں سو رہے ہیں۔''

پھوپا کانپتے لرزتے داخل ہوئے۔ اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ مجھ سے پوچھا۔ ''بادشاہی آ گئیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''ارے خانم کیا پکاؤ گی شام کو، کیا نام ہے کہ۔'' پھوپا اپنے کمرے سے بولے۔

''اے ہے تم نے ہی تو مرغ منگا کردیا تھا۔ مرغ قورمہ پکاؤں گی اور کلیجے۔'' پھوپی بولیں۔

''اور خانم کیا نام ہے کہ میٹھا؟'' پھوپا نے پوچھا۔

''اے حلوہ رکھا ہے ڈھیروں۔'' پھوپی بولیں۔ میں کانپ گیا۔

''تھوڑا سا اسے دو، اور ذرا سا مجھے بھی۔'' پھوپا بولے۔

حنیفہ اٹھیں۔ نعمت خانہ کھولا۔ ایک منٹ کو سکتے میں رہ گئیں پھر چلائیں۔ ''اے بی بی شکر تو ڈھیر پھکی پڑی ہے۔ کسی نے پھانکی ہے۔''

میرا دم نکل گیا۔

''اور بی بی دودھ بھی ختم، اے ہاں دودھ صاف۔''

میرے جیسے گولی لگی۔

''اور بی بی حلوے کی پلیٹ خالی پڑی ہے۔'' خالی پلیٹ نعمت خانے سے نکال کر حنیفہ نے دکھائی۔

''او کمینے تُو نے تو نہیں کھالیا؟'' پھوپی نے پوچھا اور میں گھر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

☆☆......☆☆

ڈی۔ خان

نامعلوم، کراچی کے حالات پر بننے والی پہلی فلم

"نامعلوم افراد کا ہاتھ" کراچی والوں کے لیے یہ اصطلاح بہت پرانی ہوگئی ہے، خونی واقعات ہوتے رہتے ہیں اور ہماری انتظامیہ اور پولیس، نامعلوم افراد

کے خلاف بیان دے کر خوش باش گھروں کو لوٹ جاتی ہے۔ یہ نامعلوم ہاتھ حکومت کے ہتھے چڑھے نہ چڑھے فلم والوں کی پکڑ میں ضرور آگیا ہے۔ (ارے پریشان نہ ہو، ہماری فلمی دنیا کے لوگوں نے قانون کی وردی نہیں پہن لی ہے) بلکہ اگست میں فلم "نامعلوم" کی ریلیز متوقع ہے۔ جو کراچی کے حالات پر بنائی جانے والی پہلی فلم کہلائے گی۔ نامعلوم کا ٹریلر جاری کردیا گیا ہے۔ جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فلم زوردار اور ایکشن سے بھرپور ہوگی۔ "فلم والا" کے بینرز تلے بننے والی اس فلم میں ماڈل عمرہ، فہد مصطفیٰ، جاوید شیخ، سلمان شاہد وغیرہ شامل ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فلم کے ذریعے کراچی کے حالات کی کس حد تک صحیح عکاسی کی گئی ہے۔

"ماہ میر" ایمان علی کا منفرد انداز حسن

2013 پاکستانی فلموں کے لیے خاصا خوش آئند سال رہا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں لولی وڈ کے حالات بہتری کی جانب گامزن دکھائی دے رہے ہیں۔ فلمی پنڈتوں کے مطابق رواں سال میں فلم انڈسٹری پر بہار کا موسم چھایا ہوا ہے۔ فلم بینوں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے فلم

سازوں نے بھی نئی تخلیقات پر کام شروع کردیا ہے۔ پاکستانی فلم "ماہ میر" ایک ایسی کلاسیکل کاوش ہے

، جو اردو ادب کے معروف شاعر "میر تقی میر" کی زندگی اور شاعری سے متاثر ہوکر بنائی جارہی ہے۔ فلم میں ایمان علی بہت دلکش دکھائی دے رہی ہیں۔ دیگر اداکاروں میں فہد مصطفیٰ کے علاوہ منظر صہبائی اور صنم سعید نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

"تمنا"

اسٹیون مور کی فلم "تمنا" کی تھیم کافی حد تک ڈرامائی تاثر لیے ہوئے ہے یہ فلم ایک مختصر پلاٹ پر مبنی ہے۔ جس کی کہانی میں ایک عمر رسیدہ بوڑھا (سلمان شاہد) جوان

بیوی (مہرین راحیل) کے عاشق (عمیر رانا) کو اپنے عظیم الشان گھر میں مدعو کر کے، اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنا شروع کرتا ہے۔ فلم میں سلمان شاہد نے سنکی آدمی کا کردار خاصی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے (ویسے بھی سلمان جی پر ہمیشہ سے ایسے کردار بہت سوٹ کرتے ہیں آہم)۔ فلم کی سب سے عجیب بات خبطی بوڑھے کا رقیب کے ہاتھوں اپنی ہی بیوی کے قیمتی زیورات کی چوری کا منصوبہ بنانا اور اس پر ہیرو کو جوکر کا بھیس بدلنا۔ فلم کی کہانی میں تسلسل کی کچھ کمی سی لگتی ہے۔

شوہر سے مشورہ کرنا چاہیے، ریما خان

ایسا لگتا ہے اداکارہ ریما نے آج کل شادی شدہ جوڑوں کی کونسلنگ کا کام شروع کردیا ہے، (کیا کہا نہیں) وہ جس طرح کے بیان دے رہی ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ریما خان نے ایک بیان میں کہا کہ میاں بیوی اگر ایک دوسرے سے پیار کرتے رہیں تو یہ بندھن قائم رہتا ہے اور ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ کامیاب ازدواجی زندگی کے پیچھے دونوں کی محبت لازمی جزو ہے۔ بیوی کو زندگی کے ہر معاملے میں شوہر سے مشورہ کرنا چاہیے تو زندگی خوشیوں سے بھر جاتی ہے۔ ریما نے اپنی کامیاب شادی شدہ زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشورے سے ہی اہم فیصلے کرتے ہیں اور ہمارا یہ رشتہ دن بہ دن مضبوط ہو رہا ہے۔ ریما جی ہماری دعائیں آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔

"ایک ولن" چل گئی

بالاجی موشن پکچرز کی فلم "ایک ولن" نے اپنی ریلیز کے پہلے ہفتے میں ہی کروڑوں کا بزنس کر کے کامیاب فلموں کی لسٹ میں اپنا نام لکھوالیا ہے۔ اس فلم کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ہیروئن، (شردھا کپور اور آمنہ شریف) اداکاری میں ہیرو پر بھی سبقت لے گئی ہیں۔ (ایکتا جی، سوچنے کا وقت ہے۔ نظر رکھیے۔ آپ کے ہیرو ہاتھوں سے نکل رہے ہیں) ناقدین کے مطابق فلم میں رتیش اور سدھارتھ کی کردار نگاری ان دونوں کے آگے کچھ واجبی سی لگی تاہم فلم کی موسیقی بہت شاندار ہے خاص طور پر اس کا گانا "گلیاں" کافی پسند کیا جارہا ہے۔

فلم میں پرتشدد سین کی بہتات ہے، بعض سین میں کردار اوور ایکٹنگ کرتے نظر آئے ہیں۔

ودیا بالن کے 12 بہروپ

ودیا بالن کی فلم ''بوبی جاسوس'' میں دیکھنے والوں کو بارہ مسالہ کی چاٹ مل جائے گی یعنی ایکشن، ڈرامہ، تھرل اور رومانس وغیرہ۔ فلم کی کہانی ایک خاتون کے گرد گھومتی ہے جس کو شروع سے ہی جاسوس بننے کو بڑا شوق ہوتا ہے۔ کہانی کی سب سے خاص بات ودیا کا جاسوسہ بن کر بارہ اقسام کے بہروپ بھرنا ہے۔ یہ پہلی بھارتی فلم کہلائے گی، جس میں کسی خاتون کو جاسوس کا کردار دیا گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ودیا بالن اپنے کردار نبھاتے ہوئے فن کی بلندیوں پر دکھائی دیتی ہیں۔
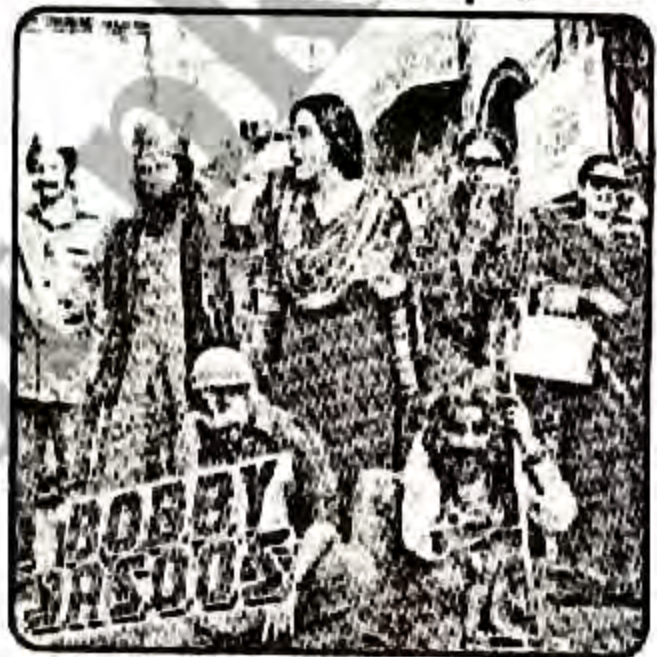
جیکولین اداس ہوگئی

سلمان خان کی آنے والی فلم ''کک'' جس کی ریلیز جلد متوقع ہے۔ اس میں ہیرو کے لیے ایک خاص طرز کی موٹر سائیکل تیار کی گئی ہے۔ سلمان اور فلم کی ہیروئن جو آج کل ان کی نور نظر بھی بنی ہوئی ہے۔ نے اس بائیک پر بیٹھ کر بہت سارے ایکشن سین فلمبند کروائے ہیں۔ (سلو جی خیر منائیں یہ نہ ہو کہ اس بار جوان دل آپ کی جگہ اس بائیک کے دیوانے ہوجائیں) فلم کے گانے ''جمعے کی رات'' نے دھوم مچادی ہے۔ کیوں کہ اس گانے میں جیکولین اور سلمان خان ایک دوسرے کے کافی قریب دکھائی دیے ہیں۔ جیکولین فرینڈس فلم کی عکس بندی مکمل ہونے پر اداس ہوگئی ہیں۔ انہوں نے ٹوئیٹر پر ٹویمیٹ کیا ہے کہ ''بہت سی خوبصورت یادیں لے

کر میری سلمان خان کے ساتھ فلم کک کی شوٹنگ مکمل ہوگئی ہے۔ یہ بات مجھے اداس کرگئی ہے۔ (جیکولین جی کیا آپ نے سلو کے ساتھ کام کرنے والی دوسری ہیروئنز سے کوئی سبق حاصل نہ کیا، آپ بھی اسی راہ پر چل نکلی چہ چہ چہ)

کترینہ بڑھاپے میں شادی کریں گی

''میں آئندہ بیس برسوں تک شادی کا ارادہ نہیں رکھتی'' کترینہ کیف کے اس حالیہ بیان نے ان کے چاہنے والوں کے دلوں پر قیامت ڈھادی۔ آج کل جس طرح رنبیر اور کترینہ کی بڑھتی ہوئی قربتوں پر دلچسپی ظاہر کی جارہی ہے، ان کا یہ بیان کچھ متضاد کیفیت لیے ہوئے۔ کترینہ جی، کہیں آپ بھی ''پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ'' پر عمل کرتے ہوئے ایسے بیانات جاری کر

رہی ہیں۔ویسے آپ کو خبر نہ ہوگی ورنہ رنبیر کی کزن اور معروف اداکارہ نے چند دنوں پہلے بڑی خوشی خوشی ایک شو میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ "رنبیر اور کترینہ کی شادی میں رقص کرنا چاہتی ہیں" اب کیا ہے سچ اور کیا ہے جھوٹ یہ تو آنے والے چند برسوں میں ہی واضح ہو جائے گا، کترینہ جی بیس سال کس نے دیکھے ہیں۔

بھارتی فلم نگر یا ینگستان

بالی وڈ فلم انڈسٹری پر نوجوانوں کی آنے والی نئی کھیپ چھا گئی ہے۔رواں سال میں بھارتی فلم نگری کے رجحان میں ہونے والی تبدیلی دنیا بھر میں محسوس کی جارہی ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ عالیہ بھٹ، سدھارتھ ملہوترا، شردھا کپور، ٹائیگر شیروف، اور ورون دھون ایک دم ڈائریکٹرز کی گڈ بکس میں آگئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ نوجوان باصلاحیت اداکاروں کے ساتھ بنائی جاتے والی کم بجٹ کی فلمیں زیادہ منافع بخش ہیں۔سوال یہ ہے کہ ایک عشرے سے زائد عرصے سے فلمی دنیا پر حکمران رہنے والے سلمان، شارخ اور عامر خان کے علاوہ اکشے کمار

اور اجے دیوگن جی کا کیا ہوگا (وہ کہاوت نہیں سنی اولڈ از گولڈ) ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

بچن جی، فٹ بال کے شیدائی

امیتابھ بچن کو فٹ بال سے کتنی دلچسپی ہے اس بارے میں تو کچھ کہا نہیں جاسکتا، مگر انہوں نے جس طرح ٹوئیٹر پر ٹویٹ میں سب کو "ڈونٹ ڈسٹرب" کی تاکید کی ہے وہ حیران کن ہے۔جی ہاں بچن جی نے ٹوئٹ کیا کہ برازیل اور کولمبیا کا میچ جاری ہے، ڈسٹرب نہ کیا جائے، لگے ہاتھوں انہوں نے برازیل کے میچ جیتنے کی پیش گوئی بھی کردی۔(ارے۔۔بچن جی۔۔آپ کہیں خود کو فٹ رکھنے کے لیے فٹ بال کو ولن کا سر سمجھ کر کک مارنے کی تیاری تو نہیں کررہے)۔ابھیشک بچن جو اس کھیل کے بہت بڑے مداح ہیں۔وہ اپنے والد
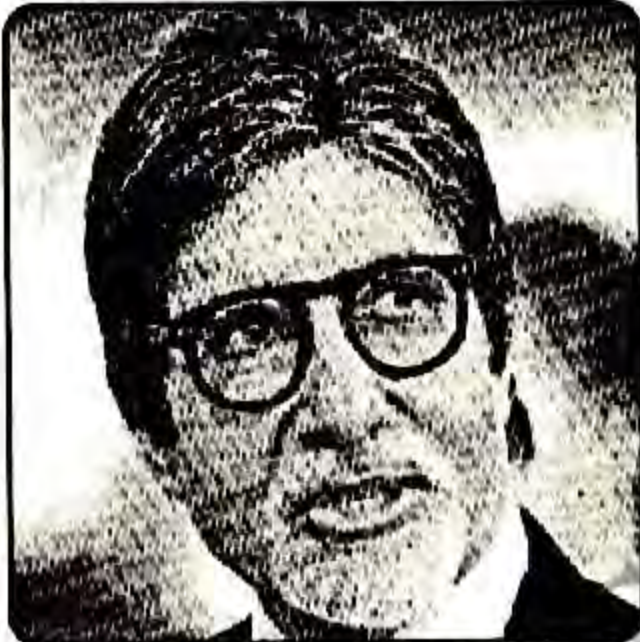
کے ساتھ برازیل میں ہونے والے ورلڈ کپ کا سیمی فائنل اور فائنل دیکھنے کے لیے، بہت پرجوش نظر آرہے ہیں۔

سارہ لورین "ویلکم بیک" میں

سارہ لورین بھارتی فلمساز فیروز ناڈیہ والا کی فلم "ویلکم بیک" میں ایک آئٹم سانگ عکس بند کروائیں گی، یہ فلم ویلکم کا سیکوئیل ہے۔سارہ لورین (مونا لیزا) نے کچھ دوسرے اداکاروں کی ڈگر پر چلتے ہوئے بھارتی ڈائریکٹرز کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک اچھا سا بیان داغ ہی دیا۔انہوں نے کہا کہ "مجھے بھارت میں اپنا مستقبل بہت روشن نظر آرہا ہے، اسی لیے میں پاکستان کے ساتھ ساتھ پڑوسی ملک میں بھی اپنا کام جاری رکھوں گی"۔سارہ جی بھارت کی واہ واہی اپنی جگہ پر ذرا سینئرز عدنان سمیع خان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، وہ بھی ماضی میں کچھ اس سے ملتے جلتے بیانات دیتے پائے جاتے تھے، اور اب۔۔مت پوچھیے۔۔آہ۔

☆☆......☆☆

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

اسامہ شاہ۔ حیدرآباد

⬟: پیاری باجی! شروع میں ہم لوگ اچھی جگہ رہتے تھے۔ پھر حالات کی خرابی کے سبب گھر بدل لیا۔ میں اچھے کپڑے پہننے کا شوقین ہوں۔ یہاں سب مذاق اُڑاتے ہیں۔ کوئی بات کہوں تو سُنتے نہیں۔ میرا مطالعہ کافی ہے اس لیے باتیں بھی قابلیت کی ہوتی ہیں۔ لوگ ہنستے ہیں۔ مجھے پروا نہیں، لیکن بھائی کہتے ہیں کہ تم اپنا مذاق بنواتے ہو۔ لوگ ہمیں تمہاری باتیں سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم زبردستی کی بحث نہ کیا کرو؟

ص: مذاق کی پروا نہ کریں۔ اچھی طرح ہی رہیں، لوگ آپ کو ایسا ہی دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے تو مذاق نہیں بنے گا۔ اس کے علاوہ اپنا رویہ مناسب رکھیں، سب سے ایک حد تک ملنا ٹھیک ہے۔ جن باتوں کو قابلیت کی باتیں کہہ رہے ہیں تو یہ قریبی دوستوں میں کی جاسکتی ہیں۔ ہر جگہ، ہر ایک سے اپنی قابلیت نہیں منوائی جاسکتی اور اگر ایسا کریں گے تو مایوسی کا سامنا ہوگا، اپنے مزاج کے مطابق مشاغل اپنانے کی کوشش کریں، جہاں صلاحیتوں کا بہترین استعمال ہو، معاشرے میں مقام حاصل کر کے آپ کو اطمینان ہوگا۔ اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوگی کہ گفتگو کے ذریعے ہر شخص کو قائل کیا جائے، ویسے بھی بحث کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تاکہ تعلقات اور شخصیت کا تاثر بہتر رہے۔

ریاض جہاں۔ لاہور

⬟: باجی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی شروع سے ہر کلاس میں پوزیشن لیتی آئی ہے۔ آٹھویں میں آ کر تو وہ اپنے ٹیسٹوں میں فیل ہونے لگی۔ تعلیمی معیار ہی گر گیا۔ ایک اور بات دیکھنے میں آئی کہ وہ لڑکوں میں کچھ زیادہ دلچسپی لینے لگی ہے۔ اِدھر اُدھر میسج کرتی رہتی ہے میرے فون پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کا بدلا ہوا انداز میرے لیے تشویش کا باعث بن رہا ہے؟

ص: تیرہ یا چودہ سال کی عمر ہوتے ہی اکثر لڑکے اور لڑکیوں کے رویے میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ صنف مخالف کی طرف دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ تحقیقات بھی ثابت کرتی ہیں کہ ٹین ایج میں نوے فیصد نوجوان اپنے انوکھے جذبات، خیالات، خواہشات اور محسوسات سے گھبرا جاتے ہیں۔ اس کیفیت کا اثر ان کی ذہنی صلاحیتوں پر براہ راست ہوتا ہے۔ تعلیمی میدان میں ان کی پہلے جیسی کارکردگی نہیں رہتی۔ آپ تشویش نہ کریں کیونکہ یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ اس نازک وقت میں نوجوانوں کو درست رہنمائی حاصل ہوجائے، والدین اچھے دوست ثابت ہوں تو وہ اس نازک دور کو کسی نقصان کے بغیر گزار لیتے ہیں۔ اس کے بعد جذبات میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ کارکردگی سے بہترین نتائج حاصل ہونے لگتے ہیں۔ بیٹی کو اپنا فون استعمال کرنے دیں اور خود بھی وہی فون رکھیں، ایک فون رہے گا تو بیٹی کی راہنمائی آسانی سے کرسکیں گی۔

وہ اور اس کی دوست وغیرہ محتاط رویہ اپنائیں گی۔

ارمانہ مغل۔راولپنڈی

★: اچھی باجی! ایک مرتبہ میں نے سڑک پر حادثہ ہوتے دیکھ لیا۔ اس وقت ساری گاڑیاں تیز آواز میں ہارن بجانے لگیں۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ لوگوں کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میرے دل کی عجیب حالت ہو گئی۔ بہر حال پھر ہم گھر آ گئے۔ اب ذرا سی ایمبولینس کی آواز یا گاڑی کا تیز ہارن سنائی دیتا ہے تو دل بہت گھبراتا ہے۔ دماغ کی عجیب کیفیت ہوتی ہے؟

✍: حادثہ تو اور بھی بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ لیکن سب کے ساتھ تو ایسا نہیں ہو رہا۔ صحت مند زندگی گزارنے کے لیے دل و دماغ پر قابو تو رکھنا ہوگا۔ مگر بعض حساس قسم کے لوگ کسی تکلیف دہ حادثے یا واقعے کے بعد خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ ان کا ذہن متاثر ہو جاتا ہے اور عام صورت حال میں بھی معمولی سی بات پر چونک پڑتے ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت بڑھ جاتی ہے۔ سانس پھول جاتا ہے۔ ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں اور بعض لوگ تو کانپنے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو ان میں سے چند علامات محسوس ہوتی ہیں تو اپنی ذہنی صحت پر توجہ دیں۔ اس صورت حال میں جو گھبراہٹ پیدا کرتی ہے خود پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ کسی پرسکون جگہ پر آرام سے بیٹھ جائیں یا لیٹ بھی سکتی ہیں، گہرا سانس لیں اور آہستہ آہستہ سانس باہر نکالیں۔ اس دوران اپنے پورے جسم کو ڈھیلا رکھیں اور خود سے کہیں کہ میں بہت آرام اور سکون محسوس کر رہی ہوں۔ 5 سے 19 منٹ تک یہ مشق کی جائے تو بہت بہتری محسوس ہوگی۔

عظیم خان۔کراچی

★: باجی جان! اسلام وعلیکم، میرا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، باجی میری امی بڑے بھائی کے پاس کینیڈا گئی تھیں۔ اِدھر والد نے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ میں تو سارا دن یونیورسٹی میں گزار دیتا تھا، مجھے بھی معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ ایک روز گھر میں چند اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان میں ایک میری سوتیلی ماں بھی تھی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوا، میں نے گھر چھوڑ دیا۔ اب امی سے بات ہوتی ہے، وہ کہتی ہیں واپس گھر جاؤ۔ گھر میں رہنا تمہارا حق ہے اور میں اب واپس نہ آؤں گی۔ میرا دل تو ابو کی شکل دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا، گھر واپس کیسے جاؤں؟

✍: غصہ میں ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے اور انسان اپنا بڑا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ ٹھیک ہے والد نے دوسری شادی کر لی لیکن آپ تو ان کے بیٹے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ لہٰذا ان سے رشتہ تو ختم نہیں ہوا۔ آپ کو اتنا غصہ کرنے کا حق بھی نہیں، گھر واپس چلے جائیں، دوسری خاتون کی عزت کریں۔ اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔ وہ سارے مسائل دور ہو جائیں گے جو گھر چھوڑنے کے سبب سامنے آئے تھے۔ آپ کو ہر حال میں تعلیم مکمل کرنی ہے۔ اس کے بعد یہاں رہنا، جاب کرنا یا والدہ کے پاس جانا آسان ہو سکتا ہے، ذہنی طور پر صحت مند لوگ ہر طرح کے حالات میں اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

عالم گیر۔نوشہرہ

★: باجی! میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، والد مجھ سے ناراض رہتے ہیں، وہ اپنے دوستوں کے بچوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ میرے کان تھک گئے ہیں یہ سنتے ہوئے کہ تم ناکارہ ہو، نااہل ہو، کچھ نہیں کر سکو گے۔ اب واقعی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ دوستوں میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ لوگ مجھے بہت خوش حال سمجھتے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ میرے بابا تو مجھے کسی کام کا نہیں سمجھتے، جب سب سو جاتے ہیں تو میں بھی دبے پاؤں گھر جا کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں کہ واقعی میں ناکارہ ہوں؟

✍: ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی بچہ بالکل ناکارہ نااہل ہو اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ والدین کو سمجھنا چاہیے کہ ان کے بچے بے شمار صلاحیتیں اور ذہانت رکھتے ہیں، بس ذرا ان کو پہچاننے کی ضرورت ہے اور اگر والدین اس بات کو نہ سمجھتے ہوں تو بچوں کو اپنی صلاحیتوں کا یقین ہونا چاہیے۔ آپ خود پر ناکارہ ہونے کا لیبل نہ لگائیں۔ آپ خود کو غلط ثابت بھی کر رہے ہیں۔ غور کریں کون سا کام اچھا کر سکیں گے۔ کس مضمون میں زیادہ دلچسپی ہے اور پھر اس کے مطابق عملی اقدامات کر کے خود کو کامیاب اور اہل ثابت کر دیں۔ یہ کام پہلے والے کام سے زیادہ مشکل ہوگا لیکن اس طرح آپ خود کو منوا لیں گے۔ آپ کو والد کے ساتھ اور بہت سے لوگوں کی محبت حاصل ہوگی، سوچیں کتنا خوشگوار ہوگا وہ وقت جس کے لیے آپ آج سے جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں۔

☆☆......☆☆

نادیہ طارق

پیارے ساتھیو۔ جس وقت پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا عیدالفطر اپنی تمام تر گہما گہمی لیے جوبن پر ہوگی۔ عیدالفطر کی مناسبت سے ہم اِس ماہ کچن کارنر میں آپ کے لیے ایسی منفرد اور مزیدار ڈشز کی تراکیب لائے ہیں جو یقیناً آپ کے ان لمحات کا مزہ دوبالا کردیں گی۔

شیر خرمہ

اجزاء

سویاں	1 پیالی
دودھ	1 کلو
چینی	1 پیالی
چھوہارے	8 عدد
ہری الائچی	6 عدد
بادام (باریک کاٹ لیں)	حسب ضرورت
پستہ (باریک کاٹ لیں)	حسب ضرورت
ناریل کا پاؤڈر	3 کھانے کے چمچے
تیل	6 کھانے کے چمچے

ترکیب:
ایک دیگچی میں دودھ ڈال کر اُبال لیں۔ جب دودھ میں اُبال آجائے تو اس میں چینی شامل کرلیں۔ ہلکی آنچ پر 10 سے 15 منٹ تک پکائیں۔ چھوہارے کے بیج نکال کر اس کے لیے ٹکڑے کرلیں اور پانی میں 20 منٹ کے لیے بھگو دیں۔ ایک فرائنگ پین میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں اور پھر اس میں الائچی شامل کردیں۔ جب الائچی کڑکڑانے لگے تو اس میں بادام، پستہ اور کھجور شامل کرکے تل لیں۔ اب سویاں شامل کرکے 3 سے 4 منٹ تک بھونیں اور پھر ناریل کا پاؤڈر شامل کرلیں۔ اس آمیزے کو آہستہ آہستہ دودھ میں شامل کریں اور مسلسل چمچہ ہلاتے رہیں۔ 5 سے 7 منٹ تک ہلکی آنچ پر پکا کر اُتار لیں۔ مزیدار شیر خرمہ تیار ہے۔

کچوریاں

اجزاء

آلو	½ کلو
لیموں	3 عدد
ہری مرچیں	4 عدد
پودینہ	½ گڈی
ہرا دھنیا	½ گڈی
پسی ہوئی رائی	1 چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (بھون کر پیس لیں)	1 چائے کا چمچہ
کُٹی ہوئی کالی مرچ	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت

آٹے کے لیے:

گندم کا آٹا	½ کلو
میٹھا سوڈا	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

گڑ کا شیرا	2 کھانے کے چمچے
اجوائن	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:
آٹے کو چھان کر اس میں میٹھا سوڈا، اجوائن، نمک اور گڑ کا شیرا ڈال کر ملائیں۔ تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر نرم آٹا گوندھ کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ آلو اُبال کر چھیل لیں اور کانٹے سے ان کا بھرتہ بنائیں۔ اس میں لال مرچ، پسی ہوئی رائی، لیموں کا رس، باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا اور پودینہ شامل کر کے اچھی طرح سے ملالیں۔ گوندھے ہوئے آٹے کو دوبارہ سے گوندھیں، ہتھیلی ہلکی سی گیلی کر کے آٹے کا پیڑا بنائیں۔ اسے ہاتھ پر پھیلا کر درمیان میں آلو کا آمیزہ بھریں۔ چاروں اطراف سے اُٹھا کر بند کر کے کچوری بنائیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور کچوریوں کو ہلکی آنچ پر تل لیں۔ جب کچوریاں سنہری ہو کر پھول جائیں تو انہیں کاغذ پر نکال لیں۔ تیل جب کاغذ میں جذب ہو جائے تو گرما گرم کچوریوں کو املی کی چٹنی، دہی کے رائتے اور ہری مرچوں کی چٹنی کے ہمراہ پیش کریں۔

چکن ہاٹ شاٹ

اجزاء

بون لیس چکن	آدھا کلو
نمک	ایک ٹی اسپون
کالی مرچ پسی	ایک ٹی اسپون
سرکہ	ایک ٹیبل اسپون
مسٹرڈ پیسٹ	ایک ٹیبل اسپون
میدہ	آدھا کپ
کارن فلور	ایک چوتھائی کپ
انڈا	ایک عدد
چلی ساس	ایک ٹیبل اسپون
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:
بون لیس چکن کی چھوٹی بوٹیاں کر لیں، اب اس میں سرکہ، نمک کالی مرچ، مسٹرڈ پیسٹ، چلی ساس ڈال کر مکس کر لیں، پندرہ منٹ کے بعد میدہ کارن فلور مکس کیجیے انڈا پھینٹ لیں، اب چکن کو میدے میں رول کریں، انڈے میں ڈپ کریں، پھر میدہ میں دوبارہ رول کریں اب گرم آئل میں انہیں ڈیپ فرائی کر لیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

کھجور کے میٹھے وان ٹون

اجزاء

کھجور (نرم)	100 گرام
چینی	1 کھانے کا چمچہ
کھویا	100 گرام
مانڈہ پٹیاں	حسب ضرورت
انڈہ	آدھا
میدہ	1 چائے کا چمچہ

ترکیب:
کھجور کے بیج نکال کر چھری کی مدد سے اس کا بھرتہ سا بنالیں۔ چینی اور کھویا اس میں شامل کریں اور اچھی طرح سے ملالیں۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں میدہ شامل کر کے اسے مزید پھینٹیں۔ مانڈہ پٹیاں چوکور کاٹ لیں۔ ایک کنارے پر ایک چائے کے چمچے کے برابر کھجور کا آمیزہ ڈالیں۔ اسے رول کر کے درمیان تک لائیں، میدے اور انڈے کے آمیزے سے اسے بند کریں۔ رول کے پیچھے کی جانب بھی انڈے کا آمیزہ لگائیں اور پٹی کو پیچھے کی جانب فولڈ کر کے وان ٹون کی شکل دے لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور وان ٹون اس میں شامل کر کے سنہری رنگ آنے تک اسے تلیں۔

مرغ کے لیے اجزاء

مرغی (ثابت)	ڈیڑھ کلو

بیسن	2 کھانے کے چمچے
پیاز (پسی ہوئی)	1 عدد
پسا ہوا لہسن	2 کھانے کے چمچے
پسا ہوا دھنیا	1 چائے کا چمچہ
پسا ہوا زیرہ	1 چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئیں)	1 کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	1 کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	1 کھانے کا چمچہ
کٹی ہوئی کالی مرچ	1 کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	2 چٹکی
املی کا گودا	4 کھانے کے چمچے
سرکہ	4 کھانے کے چمچے
کیوڑہ	چند قطرے
تیل	2 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت

چاولوں کے لیے:

چاول	آدھا کلو
انڈے (اُبلے ہوئے)	4 عدد
پیاز (تل لیں)	آدھا پیالی
پسا ہوا لہسن	2 کھانے کے چمچے
ثابت سفید زیرہ	1 چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	1 چٹکی
بڑی الائچی	4 عدد
تیز پات	4 عدد
دار چینی	2 ڈنڈیاں
لونگ	5 عدد
کیوڑہ	چند قطرے
گھی	آدھا پیالی
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:

مرغی پر نشان لگائیں۔ تمام اجزاء کا آمیزہ تیار کرلیں۔ اس آمیزے کو مرغی پر اچھی طرح سے لگا کر 2 گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اب پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں 160°C پر 40 منٹ کے لیے پکائیں۔

چاول بنانے کا طریقہ:

ایک پتیلے میں گھی گرم کرکے اس میں لونگ، دار چینی، بڑی الائچی اور تیز پات ڈال کر کڑکڑا لیں۔ اس میں لہسن، چاول، نمک اور پانی ڈال کر پکنے دیں۔ جب چاول تیار ہوجائیں تو اس میں کیوڑہ اور زردے کا رنگ ڈال کر دم پر لگا دیں۔ ایک ڈش میں تیار چاول کی تہہ بچھا کر اس کے اوپر پکی ہوئی مرغی رکھ دیں۔ کٹے ہوئے انڈے اور تلی ہوئی پیاز سجا کر پیش کریں۔

کلاسک چیز کیک

اجزاء

مکھن	6 کھانے کے چمچے
ڈائجسٹو بسکٹ	200 گرام
پسی ہوئی چینی	2 کھانے کے چمچے
کریم چیز	375 گرام
انڈے	3 عدد
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلار	ایک کھانے کا چمچہ
ساور کریم	75 گرام
کریم	3 کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	حسب ضرورت

ترکیب:

ڈائجسٹو بسکٹ کو ایک پیالے میں کچل لیں۔ اس میں مکھن شامل کریں اور ہاتھوں سے بسکٹ اور مکھن کو یکجان کرلیں۔ ڈش کو مکھن سے چکنا کرکے اس آمیزے کو ڈش پر پھیلا کر اچھی طرح دبا کر تہہ بنالیں۔ ڈش کو فرج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں پسی ہوئی چینی، کریم چیز، فریش کریم اور ساور کریم ڈال کر اچھی طرح سے پھینٹ لیں۔ اس میں کارن فلور اور انڈے کی زردی ملائیں۔ ایک علیحدہ پیالے میں انڈے کی سفیدی پھینٹ کر آمیزے میں ملالیں اور لیموں کا رس بھی شامل کردیں۔ اس آمیزے کو ڈش میں ڈال کر 6 گھنٹے کے لیے فرج میں رکھیں۔ جس وقت پیش کرنا ہو چیز کیک کو فرج سے نکال کر اپنی مرضی کی آئس کریم سے سجا کر پیش کریں۔

عید کے فوراً بعد ایک اور موسم آتا ہے، وہ ہے شادیوں کا موسم۔ اپنی بہنوں کے لیے شادی سے پہلے سائنٹفک ٹوٹکوں سے خوب صورتی حاصل کرنے کی کچھ جانکاری دے رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وہ ضرور ان سے فائدہ اٹھائیں گی۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ کوئی بھی پرفیکٹ جلد کے ساتھ پیدا نہیں ہوا ہے۔ آج تو حالت یہ ہے کہ جن لڑکیوں کی عمر 20 سال ہے وہ بھی جلد کے مسائل سے دوچار ہیں اور اپنی ڈھیلی

ہوئی جلد کو ٹائٹ کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا عموماً اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جب کوئی اچانک اور تیزی سے اپنے وزن میں کمی کر لیتا ہے۔ داغ اور تل وغیرہ ختم کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں کچھ ٹریٹ منٹ دیے جا رہے ہیں آپ ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

فیس لفٹ: یہ سرجیکل پروسیس ہوتا ہے جس کے ذریعے شکنیں دور کی جاتی ہیں۔ ڈھیلی جلد کو ٹائٹ کر دیا جاتا ہے اور چہرے پر موجود چربی کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے جلد ٹائٹ، ہموار اور شکن سے پاک ہو جاتی ہے اور جلد شگفتہ ہو جاتی ہے۔

ڈرمابریزن: جتنے بھی داغ اور لکیریں یا شکنیں ہوتی ہیں وہ سب جلد کی سب سے اوپری تہہ میں ہوتی ہیں اسی لیے جلد کے اندر جائے بغیر سرجن جلد کے سارے عیوب کو دور کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جلد بالکل نئی ہو جاتی ہے۔

مائکروڈرمابریزن: اس عمل کے ذریعے آپ کمزور اور مُردہ جلد سے نجات پا سکتی ہیں۔ چھوٹے کرسٹل کے ذریعے آپ کی جلد کی پہلی تہہ وہی جگہ ہوتی ہے جہاں عموماً مردہ خلیے اور میل کچیل جمع

ہو جاتے ہیں اور جلد کو کمزور کر دیتے ہیں۔

کیمیکل پیل: اصل میں کیمیکل کے ذریعے جلد کی نچلی تہہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ جلد سے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں اور عمر کی بڑھوتری کے اثرات بھی جلد سے غائب ہو جاتے ہیں۔

لیزر اسکن ری سرفیسنگ: لیزر کی شعاعوں کی مدد سے گہرے نشانات آرام سے جلد سے الگ کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے جلد کی رنگت بھی نکھر جاتی ہے۔

فوٹو جووے نیشن: اس کی مدد سے جلد پر جو سرخ سرخ دھبے پڑ جاتے ہیں وہ دور ہو جاتے ہیں اور شکنوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ جلد پہلے کے مقابلے میں ٹونڈ اور ہموار نظر آنے لگتی ہے۔

کولیجن انجکشن: جب جلد میں موجود قدرتی کولیجن کی جلد میں کمی ہونے لگتی ہے تو جلد میں اس کمی کو دور کرنے کے لیے کولیجن انجکشن لگایا جاتا ہے اور جلد پھر سے تروتازہ ہو جاتی ہے۔

فیٹ انجکشن: چربی متاثرہ خاتون کے جسم سے ہی حاصل کی جاتی ہے اور جلد میں انجیکٹ کر دی جاتی ہے۔ اس سے جلد اور جوان نظر آنے لگتی ہے۔

تھرمیج: جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ جلد میں تازگی اور لچک پیدا کرنے کے لیے حرارت سے کام لیا جاتا ہے۔ حرارت جلد کے نیچے گہرائی میں موجود ٹشوز تک پہنچائی جاتی ہے اور اس کے لیے جو آلہ استعمال کیا جاتا ہے اُسے تھرماٹول کہتے ہیں...... یہ نئے کولیجن میں تحریک پیدا کرتی ہے اور نتیجے میں جلد ہموار اور ٹائٹ نظر آنے لگتی ہے۔

امید ہے آپ ان سائنٹیفک ٹریٹمنٹ سے ضرور مستفید ہوں گی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ مزید معلومات آپ کے گوش گزار کریں گے۔

☆☆......☆☆